داستانِ دل

۳

از مظفر الدین ہاشمی

# تقریبِ ملاقات

یہ ہوتا آیا ہے کہ افسانہ نگار آگے چلکر ناول نویس بن جاتا ہے چنانچہ اس رسم کہنہ کی خانہ پری کے لئے آج آپکی خدمت میں حاضر ہوا ہوں مگر معذرت خواہ ہوکر آنے والے صفحوں پر نہ کوئی غیر معمولی چیز پیش کی گئی ہے اور نہ کسی اچھوتے موضوع پر بحث کی گئی ہے

---

وہی دل مچلنے اور دل آنے کی پرانی باتیں ہیں جن میں لڑکیاں ہیں شوخ و شنگ حسین و طرحدار اور ان کے مقابلے میں ان پر مرنے والے کچھ نوجوان ہیں جو ہجر و وصال کے دائرہ میں گھر کر اس گھسی ہوئی پگڈنڈی پر چلتے ہیں جسکی ابتدا باغ عدن سے ہوتی ہے یہ ناول خطوں کو جمع کر کے لکھا گیا ہے۔ اور چونکہ خطوط ہمیشہ صیغہ واحد متکلم میں لکھے جاتے ہیں اسلئے ناول کا ہیرو "میں" ہو کر رہ گیا ہوں۔ امید ہے کہ ناظرین اس "میں" کی خوش فہمی میں پڑ کر کہیں "ان" کو ناراض نہ کردیں گے جن کے نام "میں" نے محض اسی دن کی خاطر، یہ کتاب لکھنے سے پہلے معنون کردی تھی۔

ناول لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ مختصر افسانہ ہے مختصر افسانہ کے لئے محض ایک کردار کی زندگی کا صرف ایک پہلو ایک ہی منظر میں دکھانا کافی ہوتا ہے

برخلاف اس کے ناول مجموعہ ہے متعدد مختصر اور طویل افسانوں کا جن میں ایک نہیں بلکہ کئی ایک مختلف عادات وخصائل اور شکل وصورت کے کردار بیک وقت ایک ایک مرکزی قصبہ کے گرد گھوم کر اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے دل ودماغ پر مختلف زاویوں سے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ناول گویا کسی خاص تہذیب یا ماحول کا مکمل نقشہ ہوتا ہے جس میں اس تہذیب یا ماحول میں رہنے والے مختلف افراد، عورت، مرد، بوڑھے، جوان، موقع موقع سے اپنی جھلک دکھا کر قصہ یا موضوع کو مکمل کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے دماغ پر ایک مکمل تصویر کا عکس ڈالتے ہیں۔ علم وادب کی ان دو نمایاں شاخوں کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مختصر افسانہ کسی منظر کی تنہا اور ساکن تصویر ہے جو کیمرہ کو صرف ایک بار کھول کر لی گئی ہے اور ناول مختلف مناظر کی متحرک تصویریں ہیں جو مختلف زاویوں سے بار بار لی گئی ہیں۔

صنفِ ادب میں ناول سب سے زیادہ ہردلعزیز ہے۔ قبول عام نے آبِ حیات کے جتنے جام ناول کو پلائے وہ کسی اور شاخ علم کو میسر نہیں۔ دنیا کے کتابی لٹریچر میں ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور دنیا کی ہر مہذب اور زندہ زبان کا کوئی نہ کوئی ناول بلند مرتبہ کو حاصل کر چکا ہے اردو میں بھی منشی پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اُن کے چند ناول ایسے ہیں جن کی بقا دوامی ہے اور اُر[دو] جب تک پڑھی جائے گی یہ ناول بھی پڑھے جائینگے۔

ناولوں کو اتنی بلند جگہ دینے میں ممکن ہے بعض اصحاب میرے خیال سے متفق [نہ ہوں] مگر کیا ناول شروع سے آخر تک حد درجہ دلچسپ اور جاذب توجہ نہیں ہوتا؟ کیا ایک

ناول اپنے موضوع کا ہر پہلو سے بہترین عکاس نہیں ہوتا؟ کیا ناول اپنے دورِ تصنیف کی تہذیب و تمدن کا نہایت ایماندار مؤرخ نہیں ہے؟ کیا ناول میں انسانی طبیعتوں کی مختلف مستور و عریاں خاصیتوں کی تشریح و تصویر کشی نہیں ہوتی؟ کیا ناول میں انسانی فطرتوں کے حسن و قبح کے پیدا کئے ہوئے نتائج کا اثر اکثر پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر باقی نہیں رہتا؟ کیا ناول ادب لطیف، فلسفیانہ نکتے، شعر و جمال، مناظر و محاسن کا بہترین البم نہیں ہوتا؟ پھر کوئی مجھے بتائے کہ اتنے سارے انمول موتی سوائے ناول کے خزانے کے اور کہاں مل سکتے ہیں اور جب ناول مجموعہ ہو ایسے نادر جواہرات کا تو پھر اسے گلے کا ہار کیوں نہ بنایا جائے؟

ان دنوں اردو ادب جس دور سے گزر رہا ہے اس میں اچھے ناول کی شدید کمی ہے۔ گذشتہ ربع صدی کے اندر عبدالحلیم شرر کو چھوڑ کر اردو میں کوئی اچھا ناول نگار پیدا نہیں ہوا۔ اردو کی یہ بہت بڑی کمی ہے۔ جسکو پورا کرنا ہر خیر خواہ اُردو کا فرض ہے۔ میں نے بھی اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کیلئے ناول نگاری کی پہلی کوشش کی ہے جو آپکے سامنے موجود ہے۔ اسے آپ نے پسند فرمایا تو پھر اور لکھوں گا ورنہ اللہ اللہ خیر صلا۔

ناول کے لکھنے کیلئے صبر ایوبی کی ضرورت ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ مجھ میں یہ صفت نہیں اگر اسکے لکھنے کے دوران میں محترمہ "ان" مجھے بار بار سکرا کر نہ دیکھتیں اور میری ہمت نہ بندھاتیں تو آج یہ کتاب محض میرے خیال میں ہوتی اور اسکا وجود اسکے عدم وجود کے برابر ہوتا مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ انکی لطیف مسکراہٹوں کا شکریہ ادا کروں اسلئے اس حقیر تصنیف کو انہیں کے نام معنون کر رہا ہوں

ع۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

رانچی

مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۳۶ء

محترمی تسلیم

کوئی موزوں لفظ نہ ملنے کے سبب سے خط کا آغاز ایسے بھونڈے لفظ سے کرتا ہوں جو میرے احساسات کی پوری طرح ترجمانی بھی نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ آپ میری مجبوری کو سمجھ گئی ہوں گی اور کسی قسم کی غلط فہمی کا بوجھ میرے کاندھوں پر نہ ڈال دیں گی۔

کل بہت بے موقع اور نہایت ناموزوں وقت میں ہم آپ کی نیند میں خلل انداز ہوئے مگر کرتے تو کیا کرتے۔ پروگرام ایک دم بنایا گیا اور ہر طرف سے اصرار ہونے لگا کہ آپ کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ موٹر میں جگہ نہ تھی اور یہ عذر معقول ہو جاتا مگر بدقسمتی سے میں موٹر چلانا جانتا ہوں۔ اس لئے ڈرائیور کو اُتار کر یوں ایک جگہ بنالی گئی اور مجھے مجبور کیا گیا کہ آپ کے دولت خانہ پر چلا جاؤں۔ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ کر تاب سرتابی نہ رہی تھی اور حکم کی پابندی ازبس ضروری تھی!

راستہ میں کسی نے کہا " وہ اپنی سہیلی زرینہ بیگم کے بغیر کہیں باہر نہیں جاتیں۔ یہ دوسرا روڑا تھا جو خواہ مخواہ اٹکنا چاہتا تھا۔ مگر ہم رُکے نہیں اور برابر بڑھتے چلے گئے —— اور بلاوجہ تکلیف کا باعث بنے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دوپہر کا وقت آپ آرام میں گذارتی ہیں تو شاید ہم سے ایسی نادانی نہ ہوتی کہ آپ کو جگا کر چلنے پر مجبور کیا جاتا۔ بہرحال اب تو قصور ہو چکا ہے اور ہم

سزا بھگتنے کے لئے حاضر ہیں۔
کیا آپ نے اُس کی سیر پسند کی ہے؟ مجھے تو اس ٹیلے کا نظارہ جس کے چاروں طرف حدِ نظر تک گہرے سبز رنگ کا فرش بچھا ہوا تھا۔ بڑا بھلا معلوم ہوا۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ ہماری یہ بلند نشست کسی دیوتا کا ایسا سنگھاسن ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ہم زیرِ نظر دنیا کی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں پر حکومت کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ فرشِ زمردین پر بہتے ہوئے پہاڑی نالے کو دیکھ کر آپ کا یہ کہنا "یہ کس نے چاندی کے تار کو توڑ موڑ کر گھاس پریوں ہی پھینک دیا ہے"! کتنا پیارا جملہ تھا۔ اور کیسی بے ساختہ حسین تشبیہ تھی۔

آپ کو شاید یاد ہو، جب ہم سیر کر رہے تھے اور بلا وجہ ایک پہاڑی سے اتر کر دوسری پر چڑھ جاتے تھے تو دور کہیں کسی جنگلی شاخ پر بلبل چہک رہی تھی۔ میں نے کہا تھا "یہ بلبل کیوں نغمہ سرا ہے؟" تو آپ نے اپنے پھولے ہوئے سانس کو بمشکل روک کر کیا خوب برجستہ کہا تھا۔ "جی نہیں! یہ بلبل گا نہیں رہی بلکہ ہمارے اکھڑے ہوئے سانس پر ٹھٹھے لگا رہی ہے"! اس وقت ہم سب کے سب ہانپ رہے تھے۔ واقعی اس وقت بلبل ہمارے پھولتے اور پچکتے ہوئے پھیپھڑوں کی بے ربطی دیکھ کر ٹھٹھے لگا رہی تھی۔

خط کچھ لمبا ہو گیا۔ معافی چاہتا ہوں اور ساتھ ہی آپ کے اس وعدہ کی یاددہانی پر خط کو ختم کرتا ہوں۔ جب میں آپ نے پھر ہمارے ساتھ

چلنے کو کہا تھا۔ اس مرتبہ ہم آپ کی زرینہ بیگم کے لئے بھی جگہ نکال لیں گے۔

خیر طلب

(۲)

رانچی

۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء

محترمہ نیلوفر صاحبہ مزاج مبارک

آپ نے کل ہمارے ساتھ چل کر گویا ہمیں زیر بار احسان کر لیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ ہمارے ساتھ نہ ہوتیں تو ہماری سیر کچھ پھیکی پھیکی سی ہو جاتی۔ اور وہ لطف جو کل ہم نے اٹھایا۔ اٹھانا شاید ممکن نہ ہوتا۔ ندی کا کنارہ، ہر طرف جنگلی پھولوں کے ہرے بھرے پودے، دور افق میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شام کا وقت اور جاڑے کا موسم۔ ہماری سیر اتنے سامان کے بعد بھی نامکمل ہو جاتی اگر آپ معہ اپنی زرینہ کے ہمارا ساتھ نہ دیتیں۔

آفتاب پچھم میں ہماری نظروں کے سامنے ڈوب رہا تھا اور شفق کی لالی پگھلے ہوئے سونے کا سیلاب ساکن ندی کی سطح پر رواں کر رہی تھی۔ شفق کی شعلہ سامانی ہر طرف آگ برسا رہی تھی۔ ندی کی سطح پر تیرتی ہوئی سنہری روشنی کا عکس آپ کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے رنگ میں رنگ رہا تھا اور آپ کے بندے جب اس روشنی میں ہلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کے دو قمقمے شفاف آئینے کے سامنے چمک رہے ہیں۔ زرینہ بیگم کی ہلکی سی سرمئی رنگ کی ساڑھی اس روشنی میں زر افشاں ہو گئی تھی اور آنچ

گلابی رنگ کا دوپٹہ گلنار ہو گیا تھا۔

شاید آپ نے بھی کل کی تفریح پسند فرمائی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا آپ پھر ۵ر فروری کو ہمارے ساتھ چلیں گی؟ ہم بدستور آپ کے یہاں وقت مقررہ سے پانچ منٹ پہلے پہنچ جائیں گے۔ خدا حافظ

آپ کا خیر اندیش

(۳)

رانچی

۶ر فروری ۱۹۳۶ء

نیلوفر صاحبہ تسلیمات عرض ہے۔

کل واللہ ہم نہ جانے کس منحوس کا منہ دیکھ کر واپس آئے تھے کہ سیر کا سارا مزہ جاتا رہا۔ میں نے چاہا تھا کہ اس روز ذرا دور کی ہوا کھائیں اور شہر سے بیس میل دور جا کر کرشنا ندی کے کنارے اپنا ڈیرہ جمائیں جہاں یہ ندی تقریباً ایک سو فٹ کی بلندی سے نیچے گرتی ہے اور پانی گرنے کا وہ شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔ پانی کی چادر شیشے کی پلیٹ کی طرح نیچے گر کر چکنا چور ہو جاتی ہے اور اس کی ننھی ننھی بوندیں ہوا کے جھونکوں میں مل کر فضا کو خنک اور مرطوب بنا دیتی ہیں۔ شام کو جب ڈوبتا ہوا آفتاب ایک خاص زاویہ پر اتر آتا ہے تو اس کی آڑی ترچھی کرنیں ان ننھی ننھی بوندوں کو ہزاروں طرح کے رنگ میں رنگ دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہزاروں قوس و قزح کے درمیان گھر گئے ہیں اور ہمارے چاروں طرف رنگ و نور کے بادل

امنڈ آئے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ آپ اس منظر کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی اور ممکن ہے کہ آپ کی سہیلی فضا کی مستی سے متاثر ہو کر گنگنانے لگیں گی۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بہت اچھا گاتی ہیں اور انہیں دیکھ کر بے اختیار دل چاہتا ہے کہ وہ کچھ گائیں۔ مگر ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ کل موٹر کے نامراد پنکچر نے ایسا پریشان کیا کہ سارا پروگرام خاک میں مل کر رہ گیا اور اس سلسلہ میں آپ کو بھی زحمت اٹھانی پڑی حتیٰ کہ آپ کی ہتھیلی میں خراش بھی آ گئی۔ معاف فرمایئے اگر میں یہ عرض کروں کہ آپ مجھ سے بلاوجہ شرماتی ہیں۔ میں نے لاکھ سر پٹکا کہ خراش مجھے دکھایئے لیکن آپ برابر انکار کرتی رہیں اور کسی طرح بھی میری درخواست قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ اگر میں اپنا اصرار جاری رکھتا تو ممکن تھا کہ آپ چیں بجبیں ہو جاتیں اور خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جاتی۔

بڑی نوازش ہو گی اگر آپ مجھے مطلع فرمائیں گی کہ ہتھیلی کی خراش کا کیا حال ہے۔ آیوڈین بھیج رہا ہوں۔ اسے لگا لیجئے۔ امید ہے کہ مزید تکلیف نہ ہو گی۔ خیریت سے مطلع فرمایئے۔ اور زرینہ بیگم سے آداب عرض کرنے کے بعد کہہ دیجئے کہ کل کے ناشدنی حادثات کے باعث میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مہیا نہ کر سکا۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔

خیر اندیش
آپ کا

رانچی

۱۸ فروری ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر نیلوفر صاحبہ

القاب کی نیم صاحبیت پر نہ جائیے ۔ زبان کے سلسلہ میں اپنی تہی دامانی سے مجبور ہوکر آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا رہا ہوں ۔ اپنے پاس صرف ایسے الفاظ ہیں جو یا تو مغایرت ظاہر کرتے ہیں یا حد درجہ کی بے تکلفی اور ان دو شدید کیفیتوں کے درمیان کی حالت کو بیان کرنے کے لئے مجھے کوئی لفظ نہیں ملتا ۔ اسی لئے میں نے آپ کو مخاطب کرنے کے لئے انگریزی زبان سے مذکورہ بالا لفظ مستعار لیا ہے ۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ لفظ اپنی موجودہ صورت میں میرے جذبات کا صحیح ترجمان ثابت ہو سکتا ہے ۔ حالانکہ اگر میں اس کا ترجمہ کر دیتا تو بہت ممکن تھا کہ آپ میرے اس خط کو بغیر پڑھے ہی چاک کر دیتیں اور مجھے بدتمیز قرار دیتیں ۔

پرسوں ہم نے سیر سے کسی قدر لطف حاصل کیا ۔ اگرچہ قلعہ تک پہنچنے کے لئے دشوارگذار راستہ طے کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن ہم وہاں تک پہنچ ہی گئے ۔ مجھے حیرت تو آپ کی ہمت پر ہو رہی تھی ۔ کیونکہ آپ ہم سے دس قدم آگے ہی نظر آئی تھیں ۔ ہم تھک کر ہانپ رہے تھے اور آپ تھیں کہ آہوئے رمیدہ کی طرح چھلانگیں لگا رہی تھیں ۔ قلعہ کی بلندی مجھے بہت شاندار نظر آئی اور میں اس بلندی کے نصف میں پہنچکر آج سے سینکڑوں سال قبل کی اس دنیا کے

تصور میں کھو گیا جب اس کی دھری فصیل کے نیچے ہزاروں بہادر اپنی گردنیں کٹوایا کرتے تھے۔ حملہ آوروں کا سردار اپنی فوج کے نوجوانوں کو ابھار ابھار کر لڑانے کے لئے برق آسا سرعت کے ساتھ کبھی ادھر آتا تھا اور کبھی ادھر جاتا تھا۔ قلعہ کے اندر بہادر سپاہیوں کے نعروں، خوف زدہ بچوں کے رونے اور بہادر مگر غمزدہ خواتین کی دبی آہوں سے کان پڑی آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی اس عالم میں کوئی مرتا ہو گا اور کوئی حسرت بھری نظروں سے مرنے والوں کا آخری دیدار کرتا ہوگا۔ قلعہ کی تعمیر کے بعد اس میں نہ معلوم کتنے بادشاہوں نے حکومت کی ہوگی۔ عیش و طرب کے شادیانے بجائے ہوں گے اور حسن و عشق نے متحد ہو کر عشرت و مسرت کی کتنی ہی رنگین مجلسیں برپا کی ہوں گی مگر آج وہی قلعہ ہو کا عالم بنا ہوا ہے۔ اسے بنانے اور اس میں رہ کر حسن و دولت سے کھیلنے والوں کا کچھ پتہ نہیں۔ فصیلیں شکستہ ہو چکی ہیں اور محل مٹی کا ڈھیر نظر آتا ہے۔

جب ہم اینٹوں اور پتھروں کے ان ڈھیروں کی سیر کر رہے تھے تو ہوا کے ایک تند جھونکے کی بدولت ایک مدھم سا شور برپا ہو گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ ——— یہ ان روحوں کی آوازیں ہیں جو نہ معلوم کب اپنے خاکی اجسام کو چھوڑ کر فضائے بسیط میں پرواز کرنے لگی ہیں مگر اب بھی کبھی کبھی اپنے ان مسکنوں کو دیکھنے کے لئے آجاتی ہیں جہاں آخرت کے بیج بوئے گئے تھے ...... اُف دنیا اور اس کی دل لگی ......!

— میرا خیال تھا کہ آپ میری باتیں سن رہی ہوں گی۔ شور بڑھتا گیا اور جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو آپ لوگوں کا پتہ نہ تھا۔ البتہ پرانے اور شکستہ محل کے صحن میں آپ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ابھی تک چیخنے کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور دوڑ کر یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ ماجرا کیا ہے؟ لاحول ولاقوۃ! معاف کیجئے۔ آپ لوگوں نے بھی بزدلی کی حد کردی۔ لنگور کا ایک چھوٹا سا بچہ اپنے سیاہ منہ میں سفید دانت چمکا رہا تھا اور آپ لوگوں کو ڈر کر بھاگتا ہوا دیکھ کر شاید خود بھی بھاگنے کے لئے جست لگانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بس اتنی بات تھی۔

ایک جانور کا چھوٹا سا بچہ" زمین پر قلابازیاں کھا رہا تھا اور آپ دو نوجوان لڑکیاں نیز آپ کے بہادر بھائی صاحب اس طرح ڈر کر بھاگ رہے تھے گویا کہ کوئی شیر پیچھا کر رہا ہے۔ زرینہ بیگم کی ایک چپل وہیں پڑی تھی اور بعد میں معلوم ہوا کہ دوسری ان کے پاؤں میں تھی۔ دوپٹہ گلے کا پھندا بنا ہوا تھا اور بالوں کا جوڑا کھل کر شانوں پر بکھر گیا تھا۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ٹانگوں میں بجلی بھر گئی تھی اور خوف وہشت کے باعث گھگی بندھ گئی تھی۔

آپ کا دوپٹہ کس مپرسی کے عالم میں صحن کے درمیان پڑا تھا اور چوٹی کالی ناگن کے پھن کی طرح ہوا میں جھول رہی تھی۔ آپ کے چپل نہ معلوم کہاں رہ گئے تھے اور آپ برہنہ پا اس کوشش میں مصروف نظر آتی تھیں کہ سبک پائی اور رمیدگی کے اس مقابلہ میں کہیں آپ کی سہیلی زرینہ آپ پر سبقت نہ لے جائے۔ یہ منظر بھی کس قدر دلکش تھا۔ رہے آپ کے بھائی

صاحب! تو وہ اس دوڑ میں سب سے آگے نظر آتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دوڑ میں بھی وہ پتھروں میں پڑی ہوئی کسی بندوق کے متلاشی ہیں۔
الغرض آپ لوگوں کی اسوقت کی مصیبت دیکھی نہ جاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ لوگوں کی وحشتناک صورتیں اور عجیب و غریب حرکتیں دیکھ کر میں اپنی ہنسی کو بھی ضبط نہ کر سکا اور جی کھول کر ہنسا۔ مگر آپ کے سامنے پہنچکر ہنسنے کی جرأت نہ ہوئی۔
میں نے آپ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور زرینہ بیگم کا وہ ایک چپل جو میں اٹھا کر لایا تھا اُن کے حوالہ کر دیا۔ آپ کی وہ پریشانی مجھے اب تک یاد ہے۔ ہوا میں لہراتی ہوئی سیاہ چوٹی، سینہ کا زیر و بم اور پھولے ہوئے سانس کی وجہ سے رُک رُک کر اور ہکلا ہکلا کر گفتگو کرنا۔۔۔۔۔! اب بھی جب مجھے آپ کے پریشان چہرہ کے نقوش یاد آجاتے ہیں تو اس لنگور کے بچہ پر غصہ آنے کے ساتھ ہی زبان پر بے ساختہ یہ شعر بھی جاری ہو جاتا ہے

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

بہرحال میں کوشش کروں گا کہ آئندہ ہم کسی ایسی جگہ سیر کے لئے نہ جائیں۔ جہاں ایسے واقعات پیش آنے کا خفیف سا امکان بھی ہو۔
مگر سنیئے! جہاں میں یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ وہاں یہ نہ کہنا بھی واقعات پر پردہ ڈالنا ہوگا کہ واپسی کے وقت ڈھلوان راستہ پر میرا پیر پھسلا اور میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ آپ میرے عقب میں چلی آ رہی تھیں۔ اس واقعہ نے چند لمحوں کیلئے میرے حواس کو معطل کر دیا۔ لیکن فوراً سنبھلا اور

اُٹھ کر دیکھنے لگا کہ کہیں آپ نے تو نہیں دیکھ لیا۔ لیکن آپ بھلا اس تماشہ کو کب نظر انداز کر سکتی تھیں۔ آپ نے میری بے ساختہ قلا بازی کو دیکھ لیا تھا اور یہ آپ کو اس قدر پسند آئی تھی کہ ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے۔ میرا عذر یہ ہے کہ میرا جوتہ نیا تھا اور ڈھلوان راستہ کے پتھر چکنے۔ پھر میں نہ معلوم کس تصور میں کھویا ہوا بھی تھا۔ لیکن آپ کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ میں بھی تو آپ کی مصیبت پر ہنسا تھا پھر اگر میری مصیبت پر آپ نے قہقہہ لگایا تو مجھے اس پر معترض ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اچھا تو آئیے ہم لوگ سمجھوتہ کر لیں جس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان واقعات کو یاد کر کے آپ بھی ہنستی رہیں اور میں بھی ——

خدا حافظ

آپ کا خیریت طلب

(۵)

رانچی

۲۷ر فروری ۱۹۳۶ء

مہربان من نیلوفر صاحبہ          مزاج مبارک

مسلسل بارش اور ہوا کے تند و مرطوب جھونکوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور دل آفتاب کے منور چہرہ کو دیکھنے اور اس کی شعاعوں کی حرارت کو محسوس کرنے کے لئے تڑپ گیا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ کل سے حلق میں خراش پیدا ہو گئی ہے۔ خفیف سی حرارت بھی محسوس کر رہا ہوں۔ آج دفتر نہ جاؤں گا

امید ہے کہ کل تک طبیعت بحال ہو جائے گی۔

پہلی مرتبہ آپ کا خط مجھے کل ملا تھا۔ افسوس ہے کہ میں زبانی اس کا شکریہ ادا کرنے سے معذور رہا۔ ماشاء اللہ آپ تو زبان اور بیان کے اعتبار سے بہت اچھا لکھتی ہیں اور خط بھی چشم بددور بہت ہی خوب ہے۔ قلعہ اور راستہ میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق میں نے اپنے گذشتہ خط میں ایک قسم کا سمجھوتہ کر لینے کی تجویز پیش کی تھی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میری وہ تجویز پسند نہیں اسی لئے آپ نے قلعہ میں اپنی بدحواسی کے جواز میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔ اچھا تو میں انہیں تسلیم کئے لیتا ہوں۔ اب فرمائیے کہ آپ کو میری تجویز منظور ہے یا آپ چاہتی ہیں کہ انہیں بھی بعض ناگفتنی واقعات کی فہرست میں شامل کر کے انہیں زبان پر بھی نہ لایا جائے؟

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے "کتھی" کو پسند فرمایا۔ یہ تصویر نیو تھیٹرز ان معدودے چند بہترین تصاویر میں سے ہے جنہیں میں پسند کرتا ہوں۔ میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ہندوستانی تھیٹر اور پردۂ سیمین پر حسن و عشق کی کشمکش اور کامیابی و ناکامی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دنیا میں محبت کے علاوہ ہے بھی کیا؟ ہم سب محبت ہی کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اسی محور کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی بدولت زندہ رہتے ہیں۔ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ خدا محبت ہے اور محبت خدا۔ البتہ کہیں یہ محبت تل دیتی اور ہیرا رانجھے کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کہیں ....؟

میں معافی کا خواستگار ہوں۔ ذکر تو مکتی کا کر رہا تھا لیکن خیالات کی رو میں بہہ کچھ اور ہی کہنے لگا۔ ہاں تو مکتی اچھی تصویر ہے اور اس کے ہر منظر میں آرٹ اور حقیقت کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ گانے بھی خوب ہیں۔ اور ان میں سے بعض کو سن کر مجھ پر محویت طاری ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستانی فلمیں۔ ہالی وڈ کی فلموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ فنی اور کرداری اعتبار سے ہم میں صلاحیت موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں فن کو فن کے نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے اور مالی منفعت کو مقدم نہیں رکھا جاتا۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں وہ سرمایہ دار جن کے ہاتھوں میں یہ صنعت ہے۔ روپیہ کمانا مقدم تصور کرتے ہیں اور فن کو روپیہ کا تابع بنا دیتے ہیں۔ وہی تصویریں پیش کرتے ہیں جنھیں ہمارے یہاں کا وہ طبقہ پسند کرتا ہے جسے عرف عام میں چار آنے والا کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے سماجی نظام اور ملک پر عرصہ دراز تک غیر ملکیوں کی حکومت قائم رہنے کی بدولت ہمارا مذکورہ بالا طبقہ علم سے بے بہرہ۔ ترقی سے ناآشنا اور رجعت پسندی کی تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ اس کے افراد علم و فن اور واقعیت کے کسی بلند مرقع کے محاسن کو نہیں پہچان سکتے اور ان کی تفریح طبع کا سامان وہی گھٹیا پست معیار اور بازاری تصادیر سے بہم پہنچ سکتی ہیں۔

شاید آپ کو سینما بھی پسند نہ آیا ہو۔ اس کی خستہ کرسیاں پرانی دیواریں جن پر شاید ایک مرتبہ بھی رنگ نہیں کرایا گیا۔ خوانچہ والوں کی چیخ و پکار

اور مزید برآں، لوگوں کا گھور گھور کر دیکھنا یہ سب باتیں ایسی ہیں جنھیں آپ کی نازک طبیعت برداشت نہیں کر سکتی تھی اور میں بھی انھیں اچھا نہیں سمجھتا۔ لیکن شاید آپ اس کا علاج یہ تجویز کریں کہ آئندہ ایسے سینماؤں میں جانا ہی کر دیں۔ لیکن میری رائے مختلف ہے۔ ان باتوں کو بُرا سمجھنے والے اگر وہاں جانا چھوڑ دیں گے تو ان برائیوں کو بُرا کون کہے گا اور ان کی اصلاح کس طرح ہو سکے گی؟

ہمارے ملک کا ماحول یہ ہی ہے اور ہمیں اسی کی اصلاح کرنی ہے۔ ہمیں پلازا - رودلی اور رٹز کے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ ہمیں اس ملک میں رہنا ہے اور اپنے ہی سماج کی اخلاقی کمزوریوں اور برائیوں کو دور کرنا ہے۔ اگر ہم خود اپنی اصلاح نہیں کر سکتے تو پھر کہیں ہماری عزت بھی نہیں ہو سکتی۔ کیا میں آئندہ شنبہ کو خود حاضر ہو کر یکشنبہ کے پروگرام کی یاد دہانی کرا دوں؟

آپ کا

(۶)

بھانجی

۳ر مارچ ۳۶ء

مائی ڈیر نیلوفر

خدا کا ہزار شکر ہے کہ اس نے آپ کو نہایت خطرناک حادثے سے

بچالیا۔ مجھے جب اس حادثے کا خیال آتا ہے تو خدا گواہ ہے میرا دل لرز جاتا ہے اور جب میں غور کرتا ہوں تو اس میں میری قصور نظر آتا ہے۔ یہ میری حماقت تھی کہ تین ہی روز کی مشق کے بعد میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آپ موٹر چلانے میں ماہر ہو گئیں۔ یہ میری بھول تھی اور بفضیب دشمناں اگر آپ کو کوئی گزند پہنچ جاتا تو مجھے شاید تمام عمر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ مگر اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ آپ بھی اپنی ضد میں کسی کی رائے کی پرواہ نہیں کرتیں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان تھا کہ اگر آپ مجھے بھی اپنے قریب بیٹھ جانے کی اجازت دیدیتیں۔ اس صورت میں میں اس موقع پر آپ کی غلطی کی اصلاح کر سکتا تھا۔

سچ کہئے کہ اس وقت، جب گاڑی آپ کی مرضی کے خلاف تیزی سے بھاگتی ہوئی سڑک کے کنارے والے درخت سے ٹکرانے کے لئے جا رہی تھی، آپ نے کیا محسوس کیا تھا؟ شاید آپ نے اس ٹکر سے محفوظ رہنے کے لئے گاڑی کو سڑک پر ڈال دیا تھا، کیوں یہی بات تھی نا؟ اور جس وقت گاڑی اس درخت کے قریب ہوتی جا رہی تھی تو آپ کا خیال بریک کی طرف گیا ہو گا اور آپ نے گاڑی روکنے کے لئے اسے دبایا بھی ہو گا لیکن گاڑی نہیں رکی! کیوں؟ شاید آپ ابھی اس کی وجہ نہیں سمجھ سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی نو آموز گاڑی چلاتا ہے اور اسے جب کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آجاتا ہے تو عموماً وہ بریک کی جگہ ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیتا ہے، جس کی وجہ سے گاڑی اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر

اسی پرزے پر اور زور دیتا ہے۔ گاڑی کی رفتار بڑھتی جاتی ہے اور انجام . . . . . ؟ حادثہ ! کیا آپ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش نہیں آئی تھی نا؟

وہ تو خدا کا فضل ہوا کہ گاڑی کی رفتار معمولی تھی ورنہ آپ دیکھتیں کہ گاڑی کے دروازے بند رہتے۔ ان کا کھولنا ناممکن ہو جاتا اور ہم اپنی جگہ پھنسے کے پھنسے رہ جاتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا آئندہ احتیاط سے کام لیجئے۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گا کہ تین ہی روز میں آپ نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے لیکن ابھی چند روز تک آپ کو تنہا گاڑی چلانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ آپ کو شاید یہ خبر نہیں کہ جب میں نے آپ کی گاڑی کو گڑھے کی طرف مڑتے ہوئے دیکھا تو میری کیا حالت تھی۔ کاٹو تو جسم میں لہو کا نام نہیں۔ میں بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہیں سکتا تھا آپ کے بھائی صاحب سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ دوڑیں۔ لیکن منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ میں آپ کے مضبوط اعصاب اور ٹھنڈے دماغ کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عین وقت پر یہ آپ کو خوب سوجھی کہ آپ نے بجلی کا تار کاٹ دیا۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ گاڑی گڑھے میں بھی چلتی ہی رہتی اور نصیب دشمناں کوئی شدید حادثہ رونما ہو جاتا۔ جب میں آپ کے پاس پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ آپ گاڑی کے قریب کھڑی اسے گڑھے سے نکالنے کی تدابیر سوچ رہی ہیں۔ ہمارے وطن کو ایسے ہی مضبوط دل اور دماغ رکھنے والی خواتین کی ضرورت ہے۔

گاڑی کا شیشہ غالباً آج درست ہو جائے گا۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا اور آج گاڑی پہلے سے بھی بہتر حالت میں آجائے گی۔ میں نے آپ کے بھائی صاحب کو کچھ کتابیں دی ہیں انھیں پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع کر دیجئے گا۔

ان کتابوں میں مجھے ایک کتاب بہت پسند ہے۔ لیکن ابھی میں آپ کو اس کا نام نہیں بتاتا۔

آپ کا

(۷)

رانچی

۱۵ر مارچ ۳۶ء

مائی ڈیر نیلوفر! مزاج شریف

آپ کا خط ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط رسمی طور پر لکھ دیا ہے۔ آپ درحقیقت اگر میری خیریت کی طالب ہیں تو آپ سے جو باتیں دریافت کی تھیں مجھے ان کا جواب ملنا چاہئے تھا۔ یا کم از کم آپ اتنا ہی لکھ دیتیں کہ میں نے وہ باتیں امی جان سے کہدی ہیں! وہ ان پر غور کیا جا رہا ہے

پرسوں شام کو جب میں آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو مجھے غیر متوقع طور پر بہت دیر تک آپ کے برآمد ہونے کا انتظار کرنا پڑا اور جب خدا خدا کر کے آپ تشریف لائیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہولکے

سے گفتگو شروع کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج یا تو ہم انھیں اپنی پریشانیٔ خاطر کی داستانیں سنائیں گے۔ یا وہ پھر یہ کہہ کر ہمیں رخصت کر دیں گے کہ وقت بہت گذر گیا ہے لیکن کیا یہ میری بدنصیبی کی دلیل نہیں کہ دونوں امیدوں میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی؟ خدا سمجھے محمود صاحب کو انہیں بھی میرے ساتھ دوستانہ محبت کے اظہار کے لئے اسی وقت کو منتخب کرنا تھا وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلنے پر اڑ بیٹھے۔ میں ملک الموت سے اپنی جان بچا سکتا ہوں لیکن محمود صاحب کی ضد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا لیکن کیا مجھے اپنی بے بسی پر ماتم نہیں کرنا چاہیئے؟ ابھی ہم آپ کے دولت کدہ سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ محمود صاحب نے رُک کر فرمایا۔ بھئی معاف کرنا ارادہ تو یہ تھا کہ میں اس وقت کا کھانا تمہارے ہی ساتھ کھاؤں، لیکن اب مجھے یاد آیا کہ کل ایک اہم مقدمہ کی تاریخ سماعت ہے اور میں نے ابھی تک ضروری کاغذات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے اس لئے میں اس وقت تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ پھر کسی روز آؤں گا۔۔۔ وہ تو یہ کہہ کر روانہ ہو گئے اور میں ــــ خیر اس قصہ کو ختم کرتا ہوں۔

پرسوں شام آپ نے جس تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور جس تلطف اور انہماک کے ساتھ میری میزبانی میں مصروف رہیں اس کے لئے میرا شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے آج مجھے بیڈمنٹن کے میچ میں شرکت کے لئے طلب فرمایا ہے اور یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ میچ ختم

گھوڑے پر سوار ہیں۔ ہاتھ میں بیڈمنٹن کا ریکٹ تھا اور زبان پر یہ الفاظ
کہ ــــــ بہت دیر ہو گئی چلئے دو گیم کھیل لیں۔ میں تو اس فکر میں تھا
کہ اور لوگ کھیل میں مصروف ہوں تو مجھے آپ سے گفتگو کا موقع ملے
مگر شاید آپ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع
نہ دیں گی۔ بہر حال کھیل بھی ختم ہو گیا امید تھی کہ اب تو گفتگو کا موقع
ضرور ملے گا۔ مگر افسوس آپ شربت تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں
اور مجھے زرینہ بیگم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ آپ کی اس حرکت سے مجھے جس
قدر کوفت ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے اگر وہ شربت
آپ خود تیار نہ کرتیں تو سخت پیاس محسوس کرنے کے باوجود میں اس کا
ایک گھونٹ بھی نہ پیتا۔

خیر یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور میں نے سمجھا کہ اب تو بہر حال آپ کے مہمان
رخصت ہوں گے اور میں آپ سے گفتگو کر سکوں گا۔ لیکن چونکہ آپ علیحدگی
میں گفتگو نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اس لئے آپ نے محمود صاحب کو
باصرار اس بات پر آمادہ کر لیا۔ کہ وہ اور زرینہ مل کر گائیں اور خود
پیانو بجانے لگیں۔ لیجئے یہ امید کا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن آپ
کی دانشمندی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہاں پیانو بجانے میں آپ کی مہارت کی داد
دیتا ہوں۔

آخر کار یہ محفل سرد ختم ہوئی۔ لیکن رات کے نو بجے آپ کو جمائیاں
آنی شروع ہو گئی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ ایسی حالت میں کسی کو آپ

ہونے کے بعد سنیما چلا جائے۔ میں اس عزت افزائی کے لئے بیحد شکر گزار ہوں
اگر میں اس موقع پر حاضر ہو سکتا تو مجھے نا قابل بیان مسرت حاصل ہوتی
لیکن افسوس ہے کہ میں تعمیل حکم نہیں کر سکوں گا۔ میں بھی آج چند دوستوں
کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے رہا ہوں اور چونکہ مجھے عرصے سے شطرنج
کھیلنے کا موقع نہیں ملا اس لئے یہ بھی ارادہ ہے کہ آج بہت رات گئے
تک شطرنج کھیلتا رہوں گا۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر دعوت کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور یہ
عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میری گفتگو ابھی تک جواب طلب ہے۔

خیر اندیش

(۸)

رانچی

یکم اپریل ۳۶ء

ڈیر نیلوفر!

آج عرصہ کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس زمانے میں مجھے پٹنہ جانا پڑا
اور وہاں سے چند ذاتی کام انجام دینے کے لئے کلکتہ چلا گیا۔ کلکتہ میں میرا
قیام ایک دوست کے پاس رہا جو پارک سرکس میں رہتے ہیں۔ قریب ہی
تلک پارک واقع ہے اور اگرچہ یہ پارک کلکتہ کے معمولی پارکوں میں سے ایک ہے،
لیکن کلکتہ جیسے گنجان آباد شہر میں اس قسم کی پارکوں کی موجودگی۔ اس

امریکی میں دلیل ہے کہ دنیا بہت وسیع جگہ ہے۔ ہم لوگ روزانہ شام کو تالک پارک میں چہل قدمی کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود کلکتہ میں میرا دل نہیں لگا مجھے وہاں کی زندگی مصنوعی معلوم ہوتی تھی

میرے کلکتہ والے دوست کا نام انور ہے۔ وہ کسی دفتر میں ملازم ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ انھیں تقریباً سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے، انھوں نے حال میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی ہے جن کے دادا نواب واجد علی شاہ کے ساتھ لکھنؤ سے کلکتہ آئے تھے ان محترمہ کا نام فرحت جہاں بیگم ہے اور ان کا بیان ہے کہ وہ آپ کے ساتھ پڑھ چکی ہیں اور آپ سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے یہ دوست اپنی رفیقۂ حیات کے بیحد فرمانبردار واقع ہوئے ہیں اور گھر میں بیگم صاحبہ ہی کا حکم چلتا ہے۔

میں انور صاحب کے یہاں دن کے گیارہ بجے گیا تھا اس وقت وہ دفتر جانے کے لئے تیار تھے انھوں نے میری بھابی سے میرا تعارف کرایا اور خود دفتر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ کسی ریستوران کا ملازم کھانا لئے چلا آرہا ہے اس موقع پر میں نے خیال کیا کہ دفتر جانے والے حضرات عموماً کھانا اول وقت کھالیا کرتے ہیں اس لئے بھابی صاحبہ نے اس وقت میرے لئے باہر سے کھانا منگا لینے کو ہی مناسب سمجھا لیکن جب شام کو اور دوسرے روز بھی یہی صورت پیش آئی تو اصل حقیقت منکشف ہوگئی۔ بھابی صاحبہ موڈرن گرل واقع ہوئی ہیں اور اسی لئے انھوں نے کھانے کے انتظام کو ریستوران والوں ہی کے سپرد کر رکھا ہے۔ گھر پر چار ملازم ہیں

یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ کل سے زکام اور نزلہ میں مبتلا ہیں۔ بحیثیت ڈاکٹر میری رائے یہ ہے کہ آپ جوشاندہ پی لیں اگر فرصت ہوئی تو آج شام کو مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوں گا۔ میں نے کلکتہ سے چند چیزیں آپ کے لئے خریدی ہیں انھیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ نے انھیں قبول کرنے میں تکلف اور پس و پیش سے کام لیا تو مجھے افسوس ہوگا۔ اپنی امی جان کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے۔

خیریت کا طالب

(۹)

رانچی

۲۷ر اپریل ۱۹۳۶ء

اچھی نیلوفر صاحبہ! خوش رہئے

کل عرصہ کے بعد جب آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں دل میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ آج تو جی بھر کر باتیں کروں گا۔ اور شکوہ و شکایت کا دفتر کھولکر رکھ دوں گا۔ لیکن خدا بھلا کرے محمود صاحب کا کہ وہ فوراً بلائے بے درماں کی طرح آدھمکے اور فرمانے لگے کہ۔۔ بھئی مجھے یقین تھا کہ تم اس جگہ ملوگے اسی لئے میں سیدھا یہاں چلا آیا۔۔ عام حالات میں مجھے محمود صاحب کے اس جملہ پر مسکرانا چاہئے تھا لیکن اس

جن میں سے تین مرد اور ایک عورت ہے۔ میاں بیوی دونوں تقریباً روز آنہ سینما جاتے ہیں اور وہ بھی کلکتہ کے بہترین سینما ہاؤس ہیں سے کسی ایک میں۔

مجھے انور کی حالت پر رحم آیا اور ایک روز جب ہم لوگ تلک پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں نے انور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا — انور صاحب! مجھے آپ کی اس شاہانہ زندگی پر رشک آتا ہے۔ لیکن میں یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا تمہاری تنخواہ تمہارے مصارف کے لئے کافی ہوتی ہے؟ — انور صاحب پہلے تو میرے سوال پر سٹپٹائے لیکن پھر کہنے لگے۔ کیا عرض کروں! صورت حال یہ ہے کہ میں گذشتہ دو سال میں اپنا تمام اندوختہ صرف کر چکا ہوں اور اب پانچہزار روپیہ کا مقروض ہوں۔ میں نے کئی لاٹریوں کے ٹکٹ خرید رکھے ہیں۔ انعامی معمے بھی حل کرتا رہتا ہوں اور اس مرتبہ گھوڑدوڑ میں بھی بہت اچھے ٹپ مل جانے کی توقع ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ سب پریشانیاں بہت جلد دور ہو جائیں گی۔ میں نے یہ سب باتیں سن کر آمین کہا اور خاموش ہو گیا۔ آپ نے سن لی ایک موڈرن گرل کی داستان؟ آپ کے لئے یہ داستان ہے اور میرے لئے مشاہدہ۔ تہذیب کے اس نمونے کو دیکھ کر میں تو گھبرا گیا ہوں۔ سچ پوچھئے تو میں نے فرحت جہاں بیگم صاحبہ ہی کی وجہ سے بہت جلد کلکتہ کو خیرباد بھی کہدیا ہے۔ بہر حال انھوں نے بکمال نوازش میرے یہاں آنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جب وہ تشریف لائیں گی تو آپ سے بھی ملاقات کراؤں گا۔

وقت مسکرانا تو کجا مجھے ان کی صورت دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر انھوں نے مجھے بنانے کے لئے کہا۔ کہ کیا مجھ سے ناراض ہو؟ اگر یہ بات ہے تو بندہ رخصت ہوتا ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ کہ لیجئے بلا ٹلی لیکن بھلا محمود صاحب ٹلنے والے تھے؟ انھوں نے اپنا جملہ پورا کیا۔ اور ہنستے ہوئے آرام کرسی پر دراز ہو گئے اور فرمانے لگے۔ کہ میں تو اس دھوپ میں یہاں آتے آتے نڈھال ہو گیا ہوں۔ ذرا دم لے لوں تو آپ سے باتیں کروں گا۔ ہاں وہ نیلوفر صاحبہ کہاں ہیں؟

اس خط میں میں آپ سے صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب محمود صاحب آئیں تو زرینہ بیگم کو ضرور بلوا لیا کیجئے۔ ورنہ مجھے مطلع فرما دیا کیجئے۔ میں خود حاضر نہ ہوا کروں گا۔ اب مجھے محمود صاحب کی موجودگی ناگوار محسوس ہونے لگی ہے اسی لئے اس روز مجھے اٹھ کر چلا آنا پڑا۔ ہاں! اب مجھے آپ سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملنے کی امید نہیں رہی اس لئے اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس کی کوشش ہی نہ کروں گا۔

آپ کی عنایات کا طالب

(۱۰)

رانچی

۱۰/مئی سنہ ۳۶ء

نیلوفر صاحبہ۔ تسلیم۔ آپ کا خط مجھے کل موصول ہوا

اور میرے لئے ایک معمہ بن کر رہ گیا۔ میں اسے کئی بار پڑھ چکا ہوں اور اگر وہ میرے پاس رہا تو نہ معلوم کتنی مرتبہ پڑھوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ مجھے یقین دلانا چاہتی ہیں کہ

(۱) آپ بہت اچھی لڑکی اور والدین نیز عزیز و اقارب کی بے حد فرمانبردار ہیں۔

(۲) ہر مظلوم اور دُکھے ہوئے دل والے کو دیکھ کر آپ کا دل بھر آتا ہے۔

(۳) اگر میں کسی دوسری لڑکی کو اپنی رفیقۂ حیات بنا لوں تو آپ کو اس امر سے تکلیف محسوس ہونے کی بجائے خوشی حاصل ہوگی۔

(۴) آپ میری افسردگی کو جلد از جلد دور کرنا چاہتی ہیں اور اس فکر نے خدانخواستہ آپ کو تقریباً پاگل بنا دیا ہے۔

(۵) آپ اس اندیشہ سے کہ کہیں میں آپ کے خطوط کسی اور کو نہ دکھا دوں انھیں واپس لینا چاہتی ہیں اور

(۶) آپ میری باتوں کا خلاصہ اپنی امی جان کو سنا دیتی ہیں۔

یہ ہے آپ کے پیش نظر خط کا خلاصہ۔ اب میں آپ ہی سے دریافت کرتا ہوں کہ اس میں میرے سکون قلب اور تسکین خاطر کا کون سا سامان موجود ہے؟ جہاں تک دفعہ ایک کا تعلق ہے اگر آپ اس مسئلہ پر اظہار خیال نہ فرمائیں تو بھی آپ کی یہ خوبی مجھ پر روشن ہے اور اسی خوبی کے پیش نظر میں کئی مرتبہ یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی

بے حد عزت ہے۔ دفعہ دو کے متعلق میں صرف اسی قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ جب دوسروں کی مصیبت پر آپ کا تڑپ اُٹھنا آپ کے کردار کا ایک جزو بن گیا ہے تو پھر میری کسی تکلیف یا پریشانی پر آپ کا پریشان ہو جانا میرے لئے کوئی اہمیت اور خصوصیت نہیں رکھتا اس کے برعکس آپ کے بحر ترحم میں خود کو ایک ذرہ کے مصداق پاکر مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ رہا دفعہ تین کا معاملہ تو بیشک آپ کو مسرت ہی حاصل ہونی چاہئے۔ ایسے مواقع پر افسوس تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جنھیں محبت ہوتی ہے لیکن یہاں معاملہ ہی دوسرا ہے۔

دفعہ چار کے سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھ جیسے تباہ حال اور سیاہ بخت کے لئے مطلق پریشان نہ ہوں۔ دفعہ پانچ کے سلسلہ میں آپ کے تمام خطوط واپس کر رہا ہوں۔ آپ کے اس اشارے نے مجھے شرم سے پانی پانی کر دیا ہے اور میری وقعت خود میری نگاہ میں کم ہو گئی ہے اور دفعہ چھ کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے معاملات کی مختار ہیں لیکن اگر میری رائے کو کوئی وقعت حاصل ہوتی تو میں عرض کرتا کہ ذاتی معاملات میں والدین کو شریک نہیں کرنا چاہئے، تاوقتیکہ کسی معاملے میں کسی آخری فیصلہ کا وقت نہ آ یا جائے۔

اچھا! یہ تو تھا آپ کے خط کا جواب۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس گفتگو کے دوران

میں اگر آپ کو میرا کوئی جملہ ناگوار محسوس ہو تو از راہ کرم اس کے لئے مجھے معاف فرما دیجئے۔ آپ میری تلخ اور تنہا زندگی سے بخوبی واقف ہیں اور اس امر سے بھی ناواقف نہیں کہ مجھے آپ سے اس درجہ محبت ہے کہ اب اس میں اضافہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جس قدر محبت کر سکتا ہے میں آپ کے ساتھ اسی قدر محبت کرتا ہوں۔ ایسی صورت میں میری تمنا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ بھی مجھ سے محبت کریں اور ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ میری تمنا بہت بلند ہے اور اس کا پورا ہونا بظاہر ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس وقت سے پہلے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ آپ کو مجھ سے جس قدر محبت ہے اس کا اندازہ آپ کے زیر نظر خط سے ہو سکتا ہے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اوّل تو مجھے اس بات کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے کہ آپ میری ہو جائیں گی لیکن اگر کبھی کوئی ایسی صورت نکل بھی آئے تو میں خود اس کے لئے تیار نہ ہوں گا۔ کیونکہ میں اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ اس شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں جس کے ساتھ آپ کو محبت نہیں اگر کبھی کوئی شخص آپ کو ایسی بات پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کرے تو آپ اس کی مخالفت کیجئے حتیٰ کہ اگر آپ کو بغاوت بھی کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کیجئے مگر ایسی بات کرنے پر مطلق رضامند نہ ہوجیے جو آپ کی طبیعت کے خلاف

ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک نیک اور فرمانبردار لڑکی ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض فرمانبرداری کے جوش میں آپ اپنی زندگی کو تباہ کرلیں۔
آپ جانتی ہیں کہ مجھے آپ کے ساتھ بے حد محبت ہے لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں اپنی ناواقفیت کا اظہار بھی کریں تو میں عرض کرونگا کہ ذرا اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے ابھی حقیقت حال منکشف ہوجائیگی ان حالات میں آپ میری دلی تمنا سے بھی بے خبر نہیں رہ سکتیں مگر خدا گواہ ہے کہ میں اپنی اس تمنا کو آج تک زبان پر نہیں لایا اور صرف اس لئے کہ میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی خود کو اس قابل نہیں سمجھا کہ آپ کو اپنی تلخ اور بے کیف زندگی میں شریک کرسکوں۔ میرا یقین ہے کہ میری ایسی خواہش اور کوشش آپ پر ظلم ہوگا اور میری خودغرضی کا ایک ناقابل تردید ثبوت۔
خدا کرے کہ آپ کو کوئی ایسا محبت کرنے والا ملے جو زندگی بھر آپ پر قربان ہوتا رہے۔ آپ کی نازبرداریاں کرے اور خلوص کے ساتھ آپ کی خدمت کرتا رہے۔ اگر آپ کے ساتھ میری محبت خلوص پر مبنی نہ ہوتی تو شاید میں بھی خودغرضی سے کام لے کر اس عزت افزائی کے لئے اپنی اہلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کرتا مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نہ تو اس کا اہل ہوں اور نہ مستحق۔
میرا حال تو یہ ہے کہ آپ کی تصویر کی پرستش کرتا ہوں۔ اسی کے قدموں پر پھول چڑھاتا ہوں اور آپ ہی کے نام کا وظیفہ پڑھتا رہتا ہوں۔

یں آپ سے کس قدر محبت کرتا ہوں اور وہ محبت کس درجہ پاک اور بے لوث ہے؟ نہ اسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی اس کیفیت سے واقف ہو سکتا ہے۔ ہاں اس قدر کہدینا چاہتا ہوں کہ کسی عابد کی محبت بھی اتنی گہری اور بے غرضانہ نہیں ہو سکتی۔

عابد کی محبت وعبادت میں سزا وجزا کا ڈر کا سمایا ہوا ہے اور پروانہ جل مرنے کی تمنا میں شمع پر نثار ہوتا ہے۔ لیکن میری محبت ان سب سے جُدا اور بالاتر ہے۔ اور اس کثیف ماحول میں مجھے تو کوئی ایسی پاکیزہ شے نظر نہیں آتی جسے دیکھ کر میں یہ کہہ سکوں کہ یہ میری طرح محبت کرتی ہے۔۔۔۔ میں کس طرح آپ کو یاد کرتا ہوں اور کتنی محویت کے ساتھ آپ کی خیالی صورت دیکھتا رہتا ہوں۔ اگر اس کی کہانی بیان کرنے بیٹھوں تو تمام عمر گذر جانے کے باوجود یہ کہانی ادھوری ہی رہے گی۔ لیکن۔

کون سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

اس لئے میں دل ہی دل میں اس کہانی کو بیان کرتا ہوں اور دل ہی سے اُسے سنتا ہے۔ اور اس کی تلخ کامیوں پر دل ہی آنسو بہالے تا ہے۔

آپ جانتی ہیں کہ ہماری گذشتہ ملاقاتیں کس درجہ پاکیزگی اور معصومیت کی حامل رہی ہیں۔ کہ شاید دنیا انھیں ...

مجھے اپنی بدنامی کا خیال نہیں۔ لیکن میں اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا۔ کہ آپ کے نازک جذبات کو ذرا سا صدمہ پہونچے ایسی صورت میں میری تجویز ہے کہ ہمیں ان ملاقاتوں کو بھی بند کردینا چاہیئے مجھے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے جس قدر اذیت محسوس ہو رہی ہے۔ آپ شاید اس کا اندازہ نہ کرسکیں۔ لیکن آپ کے مفاد کے پیش نظر اس تجویز پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ رفتہ رفتہ یہ محبتیں خواب و خیال بن جائیں گی۔ اور زمانہ کا زبردست ہاتھ ان کی یاد کے نقوش کو بھی مٹا دے گا۔

خط بہت طویل ہوگیا ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اُسے پڑھتے پڑھتے کہیں آپ بہک نہ جائیں۔ اس لئے صرف ایک التجا پر اُسے ختم کرتا ہوں۔ اور وہ التجا یہ ہے کہ آپ راتوں کو فکر و پریشانی کے عالم میں بسر نہ کیا کیجئے۔ اور نہ بیکار باتوں پر توجہ دیا کیجئے۔ اس طرح آپ کی صحت خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خدا خدا کرکے اَب آپ کی صحت بحال ہوئی ہے۔ اور میری دعا ہے کہ روز افزوں خدا۔ ترقی کرے۔

آپ ہی غور کیجئے کہ آپ کو اِن تفکّرات میں مبتلا ہونے سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے؟ اور اگر آپ کو میری پریشانی کا ذرا سا بھی احساس ہے تو آپ راتوں کو جاگنا ترک کردیجئے۔

میں دوبارہ غرض نہیں بلکہ التجا کرتا ہوں کہ راتوں کو نہ جاگا

کیجئے۔ بہرحال میں آپ کے خطوط واپس کر رہا ہوں۔ لیکن اِس احساس کے ساتھ کہ انکی واپسی کا مطالبہ کر کے مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے لیکن آپ کو خوش رکھنا میرا فرض ہے۔ اور اگر آپ کو ان خطوط کی واپسی ہی سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ تو خواہ انھیں واپس کرتے ہوئے۔ مجھے کسی قدر روحانی اذیت بھی محسوس ہو۔ مجھے انھیں واپس کر دینا چاہیئے۔

آپ کا

ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک۔

---

## پٹنہ

۲۸ مئی ۳۶ء

اچھی نیلوفر صاحبہ مزاج شریف۔

میں کل یہاں پہونچ گیا ہوں۔ اور میرا قیام ایک دوست کے ساتھ ایپچ لرز کوارٹرز میں ہے۔ یہ جگہ میڈیکل کالج کے ہسپتال سے ملحق اور ان نئے پاس شدہ ڈاکٹروں کے قیام کے لئے مخصوص ہے جو ہاؤس اسٹاف میں کام کرتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی دو منزلہ عمارت میڈیکل کالج کے وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ اس عمارت کے متصل ہی ہندوستانی نرسیں رہتی ہیں۔ اور ان کے قریب ہی یوربین نرسیں۔ ان تمام عمارتوں کو دیکھ کر مجھے اپنا وہ سہ ماہ زمانہ

یاد آجاتا ہے۔ جب میں بھی یہاں پڑھتا تھا۔ اور میری زندگی کے سات سال بے فکری میں یہاں گذرے تھے۔ اس جگہ کے چپہ چپہ سے مجھے محبت ہے۔ یہاں کے ہر درخت، درخت کی شاخوں، اور پتوں سے۔ مٹی کے ہر ذرہ۔ گھاس کے ہر تنکے غرض کہ ہر شے پر میری گذشتہ سات سالہ زندگی کی دلکش داستانیں ثبت ہیں انھیں دیکھ کر آج بھی میرے کانوں میں وہ نغمے گونجنے لگتے ہیں جو یہاں گائے گئے تھے۔ وہ کونسا فرش ہے جس کے ساتھ میرے تلوے مس نہ ہوئے ہوں۔ اور وہ کونسا کونہ ہے جہاں بیٹھ کر میں نے اپنی تنہائی کی گھڑیوں کو نہیں گزارا؟ یہاں کے پتھروں کا ہر ہر ٹکڑا اور اینٹوں کا ہر ریزہ مجھے مانوس نظروں سے گھورتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور انھیں دیکھ کر کبھی کبھی خود میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میں انھیں اٹھا کر چوم لوں۔

کالج کے قدموں میں لوٹنے والے دریائے گنگا کی لہروں پر میں نے بار بار کالج کی کشتی چلائی تھی۔ یہ دریا آج بھی پہلے ہی جیسی سبک خرامی کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ نہ معلوم کب سے بہہ رہا ہے۔ اور کب تک بہتا چلا جائے گا۔ میرے لئے اس کی موجوں میں آج بھی وہی زندگی موجود ہے۔ اور کبھی میں اسے مخاطب کر کے کہا کرتا ہوں کہ اے دل فریب دریا کیا تجھے وہ وقت یاد ہے جب تیری لہریں ایک ایسی چھوٹی کشتی کو اپنے

پر اٹھاتے ہوئے لے جایا کرتی تھیں۔ جس میں دو محبت کرنے
والے سوار ہوتے تھے، اور ہاں کیا تجھے اس کی مئی کے مہینے
کی وہ شام یاد ہے۔ جب شہر کی گرم ہوا سے پریشان ہو کر ایک
حسین اور نازک ہستی نے کسی بدنصیب سے کہا تھا کہ آؤ اسوقت
دریا ہی کی سیر کر آئیں۔ اس وقت ایک ملّاح کی کشتی کنارہ پر
موجود تھی۔ یہ دو ہستیاں اس میں سوار ہو گئی تھیں۔ کشتی کی روانگی
کے پہلے ہی لمحہ میں کسی پر خوف و دہشت کا عالم طاری ہو گیا تھا۔
لیکن تیری موجوں کی محبت بھری آغوش پہونچنے کے بعد یہ خوف
وہراس دور ہو گیا تھا۔ اور چہرے کی نازک کلی کی طرح آہستہ
آہستہ کھل کر پھول بن گیا تھا۔ شاداب پھول جس کی گلابی اور نازک
پتیاں مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

پھر کوئی اس ویران کنارہ پر اترا تھا۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی
سفید ریت کے فرش کو دیکھ کر تعجب کے ساتھ اپنی انگشت حنائی
کو اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتا تھا۔

اور اے دریائے گنگا! میرے رنگین لمحات کے خاموش
گواہ! مجھے یقین ہے کہ تو نے اس شام کو بھی فراموش نہ کیا ہوگا۔
جب ریت کے گھروندے بنانے اور بگاڑنے کے باعث کسی کے
نازک ہاتھ دُکھ گئے تھے۔ اور خوبصورت انگلیوں ریت کے ذرات
سے پاک کرنے کے لئے انھیں تیرے پانی سے دھویا گیا تھا۔ پھر

واپسی کے وقت ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے رفتہ رفتہ تیز ہونے لگے تھے۔ اور ابھی کشتی نصف راستہ بھی طے نہ کر سکی تھی کہ ہوا نے طوفان کی صورت اختیار کر لی تھی، شام کی دھندلی روشنی پر کامل تاریکی چھا گئی تھی۔ اور تو نے کہ چھوٹی سی کشتی اپنے بوڑھے ملّاح کے بس سے نکلی جا رہی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیرا جوش و خروش ہم ہنستے ہوؤں کو رولا کر رہے گا۔ اور یہ ہی ہوا بھی تھا۔

ہماری کشتی ڈگمگانے لگی تھی اور اس میں پانی بھرنے لگا تھا۔ یکایک ایک چیخ بلند ہوئی تھی اور ایسے دو دل جو ابتک دور ہی دور رہ کر دھڑکتے رہتے تھے اب ایک دوسرے سے قریب ہوکر دھڑکنے لگے تھے، مگر اے بے نیاز دریا! تو نے بھی یہ بات سمجھ لی ہوگی کہ جب دو دل ملکر ایک ہو جاتے ہیں تو رات کی تاریکی طوفان کے جھونکے اور امنڈتے ہوئے سمندر کے تھپیڑے بھی انھیں مرعوب اور مغلوب نہیں کر سکتے۔ کشتی ڈگمگائی، ڈوبی اور ابھری اس نے چکر کھائے حتیٰ کہ ایک دوسری کشتی سے ٹکراتے ٹکراتے بال بال بچی۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن پھر بھی کشتی بچ ہی گئی اور جب تو نے دیکھا کہ تیری کوئی کوشش بھی اس کشتی کو تباہ نہیں کر سکتی تو تو نے اُسے ایک خار دار ہی جھاڑی کے قریب کنارہ پر پہونچا دیا۔ مگر تیری

اس بے رحمی کا بھی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہاں! ایک باریک ڈوپٹہ کا کانٹوں میں الجھ کر دو جگہ سے پھٹ گیا۔ اور ڈھلوان راستہ پر پھسل جانے کے خوف سے ایک بار پھر کسی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ لیکن شاید تجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کہ اس سہمی ہوئی ہستی کو سنبھالنے کے لئے پہلے ہی سے دو قوی بازو تیار رہتے۔ اور جب صرف سہارے سے کام نہ چل سکا تو ان بازوؤں نے پھیل کر اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور اسی طرح اس جگہ تک لے آئے جہاں پھسلنے کا خطرہ نہیں تھا۔

اچھی نیلوفر! گذرے ہوئے زمانہ کی رنگین یاد نے مجھے اس درجہ مدہوش اور خود فراموش بنا دیا ہے کہ دل میں جو کچھ آرہا ہے اُسے زبانِ قلم سے بیان کرتا چلا جا رہا ہوں اور بھولے سے بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ میرا مخاطب کون ہے۔ میں ابتک آپ کو اپنا ایک مخلص دوست سمجھتا رہا ہوں۔ اور چونکہ ایک دوست کو دوسرے دوست کے ساتھ بے تکلفانہ گفتگو کا حق حاصل ہوتا ہے اس لئے میں بھی اس حق سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کو میری کوئی بات ناگوار ہو تو مطلع فرمایئے۔ آیندہ اس سے محترز رہوں گا۔ اب رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ اس شب بخیر کہہ کر رخصت ہوتا ہوں، اپنی امی جان اور بھائیصاحب کی خدمت میں میرا اسلام پہونچا دیجئے

آپ کا۔ مخلص جانثار۔

پٹنہ

۶ر جون ۱۹۳۶ء

محبوب دلنواز تسلیمات عرض ہے۔

آپ کا عنایت نامہ آج موصول ہوا خدا کا شکر ہے کہ آپ بعافیت ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا گذشتہ خط پسند آیا۔ اور میرے رنگین لمحات سے تعلق رکھنے والے واقعات کو آپ نے اسی نظر دیکھا۔ جس نظر انھیں میں دکھانا چاہتا تھا۔ اگر ان بے رنگ و رونق نقش و نگار کو غلط فہمی اور تنگ نظری کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو یہ ذرّے پہاڑ بن کر سکتے ہیں۔ مجھے وہ لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ جو ذرا ذرا سی بات پر بالکل چیں بجبیں ہو جاتی ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مرد ہو گا جس نے کبھی تانک جھانک نہ کی ہو۔ اور جو شخص اس کے خلاف دعویٰ کرتا ہے تو وہ دروغ ہے۔ آپ کے اس حقیقت افروز جملہ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لئے میرا شکریہ قبول کیجئے۔ اپنے پچھلے خط کو روانہ کرنے کے بعد میں برابر پچھتاتا اور دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا ہوں۔ لیکن آپ کے جواب نے میری پریشانی دور کر دی اور اب میں مطمئن ہوں۔

میڈیکل کالج ہوسٹل کا کمرہ نمبر ۲۶ کبھی میری آرزوؤں اور خوشیوں کا مرکز تھا۔ اس کے تخت نما لکڑی کے چھپر کھٹ پر مجھے جیسی نیندیں

آچکی ہیں ویسی شاید پھر کبھی نہ آئیں گی۔ پھر اسی چھپر کھٹ پر ہیں نے بے چینی کی کروٹیں بھی بدلی ہوئی ہیں آج بھی جب میں ان کا تصور کرتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میری زندگی کا وہی دور پھر لوٹ آئے۔ بڑے بھائی اس کمرہ میں چائے پیتے تھے اور گلوریاں چبا چبا کر اسی کے فرش پر پیلاک سے گلکاریاں فرماتے رہتے تھے اسی کمرہ میں مختلف دوستوں کے درمیان پر لطف مباحثے ہوا کرتے تھے۔ اور جب تاش کھیلنے کے لئے بیٹھ جاتے تو صبح ہو جاتی تھی اس کمرہ میں بارہا آپس میں مارپیٹ بھی ہوتے ہوتے رہ گئی ہے نہایت تلخ الفاظ کی بارشیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اور اگر کوئی نہ کوئی درمیان میں پڑ کر معاملہ کو رفت و گزشت نہ کر دیا کرتا تو اُن کے بہت زیادہ بڑھانے کا اندیشہ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ ہم نے اس قسم کی نوک جھونک کیلئے دو اصحاب کو چن لیا تھا۔ اور ان اصحاب کے نام بھی ہم نے گلیٹن اور کمہار ورکھ دیئے تھے، حُسنِ اتفاق سے پہلے صاحب پد قطع۔ انداز میں چوڑے چکلے اور موٹے تازے واقع ہوئے تھے۔ اور دوسرے صاحب اگرچہ پست قد تھے۔ لیکن تھے وہ بھی موٹے تازے۔ لیکن جہاں تک تنک مزاجی۔ خفگی۔ ترش کلامی اور اس کے بعد آپس میں گتھ جانے کا تعلق ہے۔ دونوں میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور جب دونوں میں میدان کارزار گرم ہوتا تھا۔ یا یوں سمجھئے کہ

گرم کرایا جاتا تھا تو سب دوست بقدرِ ظرف و ذوق اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود ان میں سے نہ تو کسی دوسرے دوست کی امداد قبول کرتا تھا اور نہ جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے دل میں کوئی کدورت باقی رکھتا تھا

پٹنہ کے قریب ہی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں سال بھر میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے اس میلہ میں شریک ہونے کیلئے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ جن میں غیر شائستہ اور دیہات کے باشندوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ لیکن ایسے شہریوں کی بھی کمی نہیں ہوتی جو اپنے اہل و عیال کی تفریح کرانے یا خود تفریح کرنے کے لئے آتے ہیں۔

ہمارے ملک کے عام میلوں کی طرح یہاں بھی مداریوں کی ڈگڈگی اور ہنڈولے کی چرخ چوں، نیز شعبدے بازوں کے مختلف مقرر دعوتی فقرے سننے میں آتے ہیں۔ اور مہذب لوگوں کی تفریح طبع کا سامان بہم پہونچانے کیلئے شہری نوجوانوں کو دعوتِ نظر بازی دینے والی بہت سی تتلیاں بھی پہونچ جاتی ہیں۔ اس موقع پر شہر کے تفریح پسند نوجوان۔ خیمے نصب کرا لیتے ہیں۔ اور انھیں خیموں میں داد و عیش و نشاط دیجاتی ہے۔ میلہ کی جگہ آم کے بڑے بڑے باغات واقع ہوئے ہیں اور دیہات کے باشندے انھیں درختوں کے نیچے ٹولیاں بنا بنا کر بیٹھتے ہیں۔ غرض کہ میلہ کے ایام

میں یہ قصبہ ایک بارونق شہر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں اور میرا دوست اس میلے میں سیر کر رہے تھے۔ کہ ایک خیمہ کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم نے کسی نہایت دل کش اور مشہور کن آواز سے گاتے ہوئے سُنا۔ اس جگہ لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ اور لوگ اچک اچک کر گانے والی صورت دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ مجمع زیادہ تر دیہاتیوں پر مشتمل تھا۔ اور وہ اپنے ہی انداز اور الفاظ میں گانے والی کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ لیکن شہر کے مہذب افراد بھلا ان لوگوں کی اس جسارت کو کیسے برداشت کر سکتے تھے، انھوں نے اپنے اِن ناخواستہ مہمانوں کو ڈانٹا جس سے پہلے تو یہ لوگ قہقہہ لگاتے رہے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا۔ کہ یہ شہری لطف و مسرت کو اپنے لئے ہی مخصوص کر لینا چاہتے ہیں تو انھوں نے چپکے سے خیمہ کی رسّیاں کاٹ دیں اور انھیں ڈانٹنے والے سب لوگ اس کے نیچے دب کر رہ گئے

اسی میلہ کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے اس کے بعد میں اپنا قصہ عرض کر دوں گا۔ گنواروں کا ایک جھنڈ حسب معمول ایک خیمہ کو گھیرے میں لئے ہوئے باہر سے جھانک کر ایک مجسمہ حسن و رعنائی کے جلوہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور نہایت سادگی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں اس تمام منظر پر اظہار خیال بھی

کرتا جارہا تھا۔ لیکن ان کا یہ دیہاتی مذاق شہریوں کے ذوق سماعت پر گراں گذر رہا تھا۔ حتیٰ کہ خیمہ کے اندر جو حضرات بیٹھے ہوئے مجرا سن رہے تھے۔ وہ ان گنواروں کے مذاق سے کچھ ایسے بوکھلائے کہ اپنی اپنی ٹوپیاں اور پگڑیاں پہن عزت اور آبرو کے ساتھ باہر نکلے اور رخصت ہو گئے۔ رئیسوں کے یوں اٹھ کر چلے جانے سے طوائفوں کو جو نقصان ہوتا ہے اور ان کی ہم پیشہ وہم چشم ان پر جو پھبتیاں کستی ہیں یہاں ان کا بیان مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں تک میلہ میں ان لوگوں کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے ہی کے لئے آتی ہیں اور اس آمد ورفت میں جو کچھ صرف ہوتا ہے اُسے پورا کرنے کے علاوہ کچھ نہ کچھ کمانا بھی چاہتی ہیں۔ بہر حال اس موقعہ پر بائی جی کی اماں خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی چائے بنانے کے لئے پانی گرم کر رہی تھیں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ رئیس اول تو آتے نہیں اور جو آتے ہیں ان دہقانوں کی یورش کے باعث بیٹھتے نہیں بلکہ کھڑے ہو کر واپس چلے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک دو بات کرتے ہیں اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ تو انھیں ان گنواروں پر بے حد غصہ آیا لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ انھیں منتشر کس طرح کیا جائے۔ یہ لوگ گاہکوں کا راستہ روکے سدِّ سکندری کی طرح کھڑے تھے۔ اس لئے بائی صاحبہ کی

اماں کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہونی ہی چاہیئے تھی۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد انھوں نے کھولتے ہوئے پانی کے چمچے بھر بھر کر انھیں گنواروں کی اس بھیڑ پر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کا منہ جلا تو کسی کا ہاتھ، کسی کے پاؤں پر پانی پڑا تو کسی کے سر پر۔ ایک شورش سی برپا ہو گئی۔ اور یہ لوگ خیمہ کے پاس سے ہٹ ہٹ کر بھاگنے لگے۔ میلہ میں لوگ اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ انھوں نے جہاں ان دہقانوں کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہوئے دیکھا تو انھیں تفریح کا ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا اور انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ بھاگو! بھاگو! پاگل ہاتھی چھوٹ گیا ہے۔

اس میلہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہر سال ایک دو اونٹ یا ہاتھی مست ہو کر بھاگ نکلتے ہیں اور دو چار تماشائیوں کو کچل ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اس آواز نے میلہ میں قیامت صغریٰ برپا کر دی اور دوسرے خیموں کے گرد جو لوگ جمع تھے وہ گھبرا کر جان بچانے کے خیال سے خیموں کے اندر گھس گئے۔ اور انسانوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب نے خیموں کے اندر کی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اگالدان پلٹے۔ پاندان الٹے۔ سارنگیاں ٹوٹیں اور طبلے پھٹ گئے انسانوں کا جو حال ہوا اس کا معمولی سا اندازہ اس بات سے ہو سکتا۔

کہ صنف نازک اور صنف کرخت دونوں کا کچومر نکل گیا۔ اور کچھ دیر کے بعد میلہ کا میدان جنگ کا میدان نظر آنے لگا۔ جگہ جگہ سے لوگوں کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کہیں کہیں لوگوں کی مرہم پٹی بھی کی جا رہی تھی۔ اس طرح بائی جی کی امی جان منچلوں کو اپنے خیمہ کے پاس سے ہٹانے میں تو کامیاب ضرور ہو گئیں لیکن کچھ دیر کے لئے میلہ کا سارا لطف جاتا رہا۔

اب اس تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالیئے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ معاملہ اسی جگہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس وقت دیہاتی بھاگ تو ضرور گئے لیکن انھوں نے بائی جی ان کی امی جان اور ان رئیسوں سے جنکی وجہ سے انھیں بھاگنا پڑا تھا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن ٹھہر کے نہیں۔ بلکہ دوسری طرح۔

اس میلہ میں لوگ آتش بازی بھی چھوڑتے ہیں شام کو جب پھر محفلیں جمائی گئیں تو نہ معلوم یہ دیہاتی کہاں سے کچھ چھچھوندریں لے آئے اور اس خیمہ کے پاس کھلے میدان میں انھیں چھڑانے لگے پھر آہستہ آہستہ انھوں نے جلتی ہوئی چھچھوندروں کو ادہر ادہر پھینکنا شروع کیا۔ سوئے اتفاق سے ایک جلتی ہوئی چھچھوندر بیٹھے ہوئے رئیسوں کے سروں پر سے گذرتی ہوئی ٹھیک بائی جی کے سامنے جا پہونچی اور رقص کرنے لگی۔

جلتی ہوئی چھچھوندر کی اس مداخلت اور رقص بے جانے خیمہ میں ایک مرتبہ پھر ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور تماشائی ایک دوسرے ہی پر نہیں بلکہ طبلوں، سارنگیوں حتی کہ خود بی صاحبہ پر بھی دست درازی ہی نہیں بلکہ پاؤں درازی بھی کرنے لگے۔ دیہاتی تماشائیوں کی اس بدحواسی یا شاید بے ڈھنگے رقص کو دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے اور لوگ دوسرے خیموں سے نکل نکل کر ان کے ہمنوا ہوتے جا رہے تھے۔ حتی کہ اس ہڑبونگ میں یہ محفل بھی برخاست ہو گئی اور بائی جی کی امی جان کو اپنے خیمہ کا چراغ بجھا دینا پڑا

یہ واقعہ تو پر لطف تھا لیکن اس قصّہ کے ختم ہو جانیکے بعد دیر تک میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ انسان صرف اپنی تربیت اور ماحول کی بدولت ذہنی طور پر کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہو گیا ہے ہم شہر کے رہنے والے تعلیم یافتہ اور نازک مزاج لوگوں کا حال ہے یہ کہ ہم اپنے علاوہ کسی کو انسان ہی تصور نہیں کرتے اور انھیں تفریح ایسے عام اور معمولی حق انسانیت سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر بی صاحبہ کی اُمّی جان اور تفریح پسند رئیسوں کے دلمیں اپنی برتری اور ان دیہاتیوں کی کمتری کا جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو وہ انکے ساتھ وہ سلوک نہ کرتے جسکی بدولت یہ سارا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ لوگ آتش بازی کے ذریعہ سے اپنی توہین کا انتقام لینے کی کامیاب کوشش نہ کرتے

ہمنے بھی میلہ میں پہنچکر ایک خیمہ کرایہ پر لے لیا تھا۔ ہم نے میلے میں وقت گذارنے کا پروگرام پہلے ہی سے تیار کر لیا تھا۔ اور ہم میں سے ہر شخص اپنے پروگرام کو جانتا تھا۔ فرش بچھانے اور بستروں کو قرینے

کے ساتھ جمانے کے بعد ہم سب بیٹھ کر خوش گپوں میں مصروف ہو گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد طے شدہ پروگرام کے ماتحت کچھ دوستوں نے گلیٹن کو بڑھا وا دینا شروع کر دیا۔ اور کچھ نے کمہارو کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ گفتگو کا آغاز تو معمولی باتوں سے شروع ہوا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد یہ سوال پیدا ہو گیا۔ کہ کل پروفیسر صاحب نے کم عقل انسانوں کو جن چیزوں سے تشبیہ دی تھی کیا ان میں گدھے کو شامل نہیں کیا جا سکتا؟ گلیٹن نے بحث کے دوران میں کہا کہ بیشک کم عقل انسان کو گدھے سے تشبیہ نہیں دیجا سکتی ہے۔ اور ان کے حامیوں نے فوراً ان کی تائید کر دی۔ مگر کمہارو کو اس بات سے اختلاف تھا۔ انھوں نے فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ کم عقل انسان کو گدھے سے تشبیہ نہیں دیجا سکتی۔ مگر آپ کو گدھا ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ سنتے ہی کمہارو کے ساتھیوں نے اس کی ہمت افزائی کے لیے ایک قہقہہ لگایا۔ مسٹر گلیٹن اس بات کو کب برداشت کر سکتے تھے وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ دوسری طرف کمہارو نے بھی آستین چڑھا لیں اور دوستوں کا مقصد پورا ہو گیا۔ یا تو خیمہ کے اندر پر لطف بحثیں ہو رہی تھیں یا یہ اکھاڑہ بن گیا۔ جب کافی دیر ہو گئی اور کہیں اس بات کا اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں گھن کی طرح ہم بھی نہ پس جائیں تو میاں مٹھو توان کا فیصلہ کرانے کے لیے اندر

گئے۔ اور ہم بھاگ کر تھوڑی دیر میں دہقانیوں کے ایک جم غفیر کو بٹیر کی لڑائی کا تماشہ دکھانے کے لئے ساتھ لگا لائے اور ان سے فی آدمی ۔ ر بھی وصول کیا چھتر کے میلہ میں ایسے تماشائیوں کی کوئی کمی نہیں جہاں دو چار آدمی جمع ہوئے اور خلقت کا ہجوم خود بخود لگ جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی بھیڑ لگ گئی ۔ لوگ بیقراری سے خیمہ کا پردہ ہٹنے کے منتظر تھے کہ جلد دیکھیں یہ بٹیر کیا بلا ہے اور کس طرح لڑتے ہیں ؛ سارے میلہ میں اس قسم کا کوئی شو نہ تھا ۔ اور جاہل اجڈ بٹیروں کے نام تک سے ناواقف تھے ۔ خیمہ کے اندر سے پھولے ہوئے سانس، زور آزمائی اور دیگر اقسام کی آوازیں دمبدم آرہی تھیں ۔ منشی نے آواز دی "کیا ہے بہادرو" یہ ہمارا پوشیدہ سگنل تھا جس کو سنتے ہی ہم نے ایک دم خیمہ کے سب پردے الٹ دیئے ۔ تماشائیوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندر دیکھنا شروع کیا ۔ دو نہایت سوٹ بوٹ سے آراستہ نوجوان بڑے جوش و خروش سے زور آزمائی میں مشغول تھے ۔ اتفاق سے جس وقت پردے ہٹائے گئے تو میاں گلٹین حضرت کھمارو کے پیٹ پر گھوڑ سوار کے انداز سے بیٹھے اپنے زبردست دشمن کا ایک ہاتھ سے منہ نوچ رہے تھے اور دوسرے سے اس کی ٹائی کھینچ رہے تھے ۔ گنواروں میں سے ایک نے بڑی خوشی سے چیخ کر کہا "وہ گل ٹھنگنا بڑا جبر جہات ہے (یعنی یہ ٹھنگنا بڑا زبردست بیٹر ہے) یہ سنکر ایک اور تماشائی نے تصدیق کی کہ اس نے بھی ایک کشتی پہلوانوں کی دیکھی تھی جس میں ایک پست قد پہلوان نے اپنے سے دس گنے سے زیادہ وزنی پہلوان کو دے مارا تھا ۔

خیمہ کے باہر تماشائیوں کے ہجوم اور ان کے شور سے ہم دونوں چونکے ، کھمارو

کو اپنی جگ ہنسائی پر شدید غصہ آیا اور وہ ایسا اچکے کہ گلبدن اس کوہ آتش فشاں کی چوٹی پر جم کر بیٹھ نہ سکے۔ اور زمین پر چاروں شانے چت آ۔ رہے اب زبردست زیر دست تھا اور زیر دست اپنی سبکی اور خجالت مٹانے کے لئے اس کی چھاتی کوٹ رہا تھا اور گلا دبا کر اس کی ٹائی نوچ رہا تھا، اس وقعہ تماشائیوں میں سے ایک مرد بزرگ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا "دھتکار، چھی چھی، ایک لٹکا (لڑکا)، پر ہاتھ چھوڑت لاج نہیں اوت" یعنی (ایک لڑکے پر ہاتھ چھوڑتے شرم نہیں آتی۔ جی ان بزرگ کی نظر میں پچیس سالہ گلبدن اب تک لڑکے ہی تھے۔

الغرض جب یہ بٹیروں کی لڑائی کا تماشہ ختم ہوا تو ہم خوب ہنسے، خوب ہنسے اتنا ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ ہماری اس منافقانہ کارروائی سے ہمارے یہ دو بٹیر کس قدر برہم ہوئے ہونگے؛ ان کی یہ برہمی عرصہ تک قائم رہی اور اس واقعہ کے بعد سے ہمارا اعتبار ان کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے گر گیا اور شاید اب تک گرا ہی ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی آمدنی کا جائزہ لیا تو دو روپے ساڑھے بارہ آنے ملے۔ جن سے ہم نے ہوٹل میں جا کر خوب مرغن کھانے اڑائے اور گولڈ فلیک سگریٹ پئے۔ ہماری اس دعوت میں کھلاڑیوں حضرات نے کچھ نہیں کھایا گرچہ ہم نے بہت اصرار کیا اور خوشامدیں کیں۔

نیلوفر صاحبہ، معاف کرنا، حکایت چونکہ لطیف تھی اس لئے دراز تر ہو گئی، اور چونکہ آپ نے اس قسم کے خط کی فرمائش کی تھی اس لئے ابھی رات کے تین بجے تک جاگ کر لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو اس خط سے میری ان بے فکری اور خوش فعلیوں کے دن کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دے گی جب میں پڑھتا تھا

اور اپنے دماغ میں بہت سے ایسے بلند خیالات کی پرورش کرتا تھا جن کو اگر آج دہراؤں تو مجھے خود اپنے سودائی ہونے کا شک ہونے لگے۔

خدا کرے یہ خط آپ کو بخیر و خوبی مل جائے۔ میں انشاءاللہ ۱۰ جون تک رانچی پہنچ جاؤں گا۔ یہاں کی گرمی اب قابل برداشت نہیں رہی۔

(میں ہوں آپ کا خیر طلب و خیر اندیش)

---

(۱۳)

رانچی

۲۵ جون ۳۶ء

ڈیر نیلوفر صاحبہ! تسلیم

میں جس دن سے یہاں لوٹ کر آیا ہوں کچھ عجیب قسم کی خبریں سن رہا ہوں پہلے تو مجھے ان افواہوں پر یقین نہیں آتا تھا مگر پرسوں جب آپ سے ملاقات ہوئی ہے میرا خیال خود بخود بدلتا جا رہا ہے میں نے دانستہ آپ سے ملاقات کی کہ دیکھوں ان گرما گرم خبروں کی حقیقت کیا ہے؟ پرسوں جان بوجھ کر میں نے ڈھٹائی کی اور دوڑا آپ کے ہاں پہنچ گیا۔ پہلے تو کریم نے مجھے دیکھتے ہی کہا "چھوٹی بیگم صاحبہ باہر گئی ہیں" مگر جب میں نے اصرار کیا کہ بلا سے چھوٹی بیگم صاحبہ باہر گئی ہیں، بڑی بیگم صاحبہ تو اندر ہیں؛ میں ان سے ملوں گا، بڑا ضروری کام ہے تو وہ سکھایا پڑھایا ہوا گرگ باراں دیدہ مسکرانے لگا اور یہ کہہ کر مجھے گول کمرہ میں بٹھا کر اندر چلا گیا "دیکھوں شاید چھوٹی بی بی واپس آگئی ہوں"

یہ آپ کا حبشی دربان اندر جا کر ایسا غائب ہوا جیسے تاریک رات میں سیاہ بلی۔ اس دوران میں میں نے آپ کے کمرے کی ہر چیز کو ایک نہیں ہزاروں بار دیکھ ڈالا، صوفے، گلدان، کرسیاں، مینٹل پیس اور اس پر رکھے ہوئے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گدھے، خچر، کتے، بلیاں، چوہے وغیرہ وغیرہ، الغرض میری نگاہ دوربین سے کوئی شئے محفوظ نہ رہی۔ مثلاً آپ کے فرش پر جو دری بچھی ہے اس میں ۷۳ نیلی اور ۴۵ سرخ دھاریاں ہیں، دری پر جو قالین پڑا ہے اس میں ۷۶ بڑے اور ۱۳۶ چھوٹے پھول بنے ہیں مینٹل پیس میں جھالریں لٹک رہی ہیں ان میں ۴۰ لڑیاں ہیں اور ۲۸۰ موتی۔

میں اپنے جوڑنے، گھٹانے اور ضرب دینے کے شغل میں کھویا ہوا تھا کہ پیروں کی آہٹ سنی۔ چونک کر اوپر دیکھا تو زرینہ بیگم ایک اور خاتون کے ہمراہ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ میں ان کو دیکھ کر خدا جانے کیوں گھبرا جاتا ہوں چنانچہ اس دفعہ بھی گھبرا اٹھا اور ان کے خیر مقدم کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ نئی خاتون کا مجھ سے یہ کہہ کر تعارف کرایا "آپ کا نام دردانہ بیگم ہے اور آپ وکیل محمود صاحب کی ہمشیرہ ہیں۔" میں نے مزاج پرسی کی اور بڑے تپاک سے بیٹھنے کو کہا۔ دونوں نے بیک وقت مجھ سے دریافت کیا "کیوں نیلو بہن کہاں ہیں؟" میں اس کے سوا اور کیا جواب دے سکتا تھا؟ مجھے اگر یہ معلوم ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔" میرے اس جواب پر زرینہ بیگم نے اپنی غلافی آنکھوں کو عجیب طرح سے گردش دی، اپنے خوب رنگے ہوئے لبوں کو سکیڑ کر کمان کی طرح بنا ڈالا اور "ہوں" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ٹھپ ٹھپ

کرتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ اب میں تھا اور دردانہ بیگم جن کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور دوسرا جاتا تھا۔

میں آپ سے ملنے گیا تھا مگر دردانہ بیگم سے ملنا پڑا۔ روزہ بخشوانے گیا تھا مگر نماز گلے پڑ گئی۔ میں موضوع کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور رہ رہ کر اپنی ٹائی کی گرہ کو ڈھیلا کرنے کی عبث کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے خود بات چھیڑی اور وہ بھی ایک دم غالب کے اس شعر سے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اس میں شک نہیں کہ دردانہ بیگم کی آواز بڑی پیاری ہے اس میں بلبل کی کوک اور ستار کی جھنکار ہے۔ یہ جب اس شعر کو نہایت ترنم سے پڑھنے لگیں تو میں کچھ حیرت اور کچھ لطف سے ان کی سیاہ اور گھنی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھنے لگا جو اس وقت آدھی کھلی اور آدھی بند تھیں۔ پھر میں نے ان کی پیشانی کو دیکھا جس کے بالائی کنارے سے ایک باریک سی مانگ گھنگھریالے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی چلی گئی تھی جیسے شب تاریک میں کہکشاں کی لہراتی ہوئی لکیر۔ پیشانی سے ہٹ کر میری نظر ان کے گالوں پر پھسلی اور اس گڑھے میں جا گری جو بائیں طرف ان کی ٹھوڑی سے ذرا اوپر بات کرتے وقت بن جاتا ہے۔ یہاں سے نظریں نکلیں تو ان لبوں پر جا کر جم گئیں جو پان کی سیاہی مائل سرخی سے رنگے ہوئے تھے اور اس وقت ان پر ایک چنچل سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

شعر پڑھ کر فرمانے لگیں "کہئے ڈاکٹر صاحب، آپ کا اس شعر کے متعلق کیا خیال ہے؟" بھلا میں کیا اور میرا خیال کیا؟ جو کچھ سمجھ میں آیا بکتا گیا اور آخر میں کہا "غالب شاعر حقیقت تھا، جو کچھ کہہ گیا ہے حرف بہ حرف صحیح ہے۔" کہنے لگیں "ہوگا میں تو اس کے برعکس دیکھتی ہوں کہ محبت کی آگ، جہاں چاہو لگا دو اور جب چاہو بجھا دو۔" میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھ کر دل میں کہا "بھائی شاید ایسا ہی ہو، تم خوبصورت اور شوخ ہو، جہاں اور جب چاہو گی ممکن ہے کہ آگ لگا دو مگر اس کو بجھانا تو تمہارے بس میں نہ ہوگا۔" اور میری زبان سے پہلے "ہاں" اور پھر فوراً "نہیں" نکل گیا وہ میری ہاں اور نہیں پر مسکرائیں اور ان کے گال پہ پھر وہی ننھا سا گڑھا بن گیا۔ مسکرا کر اپنے پرانے مصری طرز کے جوڑے کو ٹٹول اور اسے اپنی گردن پر چھوڑ کر سلک کی حد درجہ چکنی ساری سے اپنا سر ڈھانکنا چاہا مگر آنچل سر سے ڈھلک کر جوڑے پر دوبارہ آ گرا اور جہاں پہلے تھا وہیں پڑا رہا۔ انہوں نے اپنے بدتمیز آنچل سے اس کی گستاخی کے لئے مزید بازپرس نہ کی اور میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا "یہ ہاں اور نہیں دونوں بیک وقت کیسے مانے جا سکتے ہیں؟ یا تو ہاں کہئے اور میری دلیل مان لیجئے یا نہیں کہہ کر میری رائے کی غلطی دکھلایئے۔"

میرے پاس اس مثبت و منفی کے جھگڑوں کے لئے وقت نہ تھا اور اگر وقت بھی تھا تو پرائے جھگڑے کو مول لینے کا ارادہ نہ تھا۔ ٹالنے کے لئے میں کوئی چست فقرہ ڈھونڈ رہا تھا کہ نرملا نہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے صوفہ پر آ بیٹھیں اور ایک الہڑ مگر شوخ لڑکی کی طرح مجھ سے جواب کے لئے ضد

کرنے لگیں۔ میری ان کی پہلی ملاقات تھی اور ان کے متعلق محمود صاحب سے بھی سن چکا تھا کہ امسال علیگڈھ سے انہوں نے بی۔اے (آنرز) کیا ہے مگر اس کے معنی یہ نہ تھے کہ اس قدر جلد بے تکلف ہو کر بے باکی کی حد تک اتر آئیں اور ایک اجنبی مرد کے سامنے غالب کا حدورجہ رنگین شعر پڑھ کر اس پر اس قدر دلبری سے حاشیہ آرائی کریں۔

ان کی اس حرکت سے میرا خیال خواہ مخواہ علیگڈھ کی طرف چلا گیا اور علیگڈھ سے اس کے بانی کے متشرع چہرہ کی یاد آ گئی۔ اللہ اکبر، ببیں تفاوت رہ از کجاتا بکجا، میرا خیال علیگڈھ کے ان سیاہ برقعہ پوش نازنینوں کی طرف منتقل ہو گیا، جن کی بے قرار آنکھیں برقعہ کی جالی کے اندر بھی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور دیکھنے والوں کی نظریں برقعہ کی لہروں میں ڈوبتی نکلتی ہوئی انہیں جالیوں کے پھیلے ہوئے جال میں جا کر پھنس جاتی ہیں۔ ابھی میں ان کلول کرتی ہوئی ہرنیوں کے پیچھے کچھ اور دور تک بھاگنا چاہتا تھا کہ دردانہ بیگم نے ٹھنک کر کہا "وہ بتلائیے نا ورنہ میں غصہ ہو جاؤں گی"۔ میں نے کڑھ کر کہا "وہ کیا بتاؤں، بات کوئی ایسی ہو جو دل کو لگے تو کچھ خیال آرائی کی جائے، آپ تو ایک پامال مضمون کو لے کر بیٹھ گئی ہیں"۔ میرا یہ کہنا تھا کہ دردانہ بیگم نے رونا چہرہ بنا کر کہا "جی ہاں! میری تو ہر چیز آپ کے لئے پامال ہے۔ دیکھئے میں آپ کی شکایت نیلو سے کرتی ہوں کہ انہوں نے میرا اپمان کیا ہے"۔

چہ خوب، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! دردانہ بیگم آپ سے میری شکایت کی دھمکی دے رہی تھیں! آخر کس قصور پر؟ مگر پھر بھی میں ڈر گیا کہ خدا

نہ کرے میری شکایت کوئی آپ کے سامنے کرے۔ مفت میں بیٹھے بٹھائے آپ کے مزاج کو مکدر کر دے اس لئے میں نے ہنس کر کہا "وہ کیوں، آپ واقعی روٹھ گیئں؟ میرا منشا آپ کو چھیڑنے یا تکلیف پہنچانے کا نہ تھا مگر آپ کی ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ محبت کی آگ کو آپ بجلی کی روشنی کی طرح حسب ضرورت بٹن دبا کر جلا اور بجھا کیونکر سکتی ہیں ؟" اب پھر دردانہ بیگم کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھیں۔ کہنے لگیں "اجی ڈاکٹر صاحب، یہ ہم عورتوں کے بس میں ہے بلکہ یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دیکھئے کل تک شاید بہن نیلو آپ کے چرچے کیا کرتی تھیں مگر جب سے بھیا نے خالہ جان کے پاس ان کے لئے اپنا پیغام بھیجا ہے آپ کا کبھی بھولے سے بھی ذکر نہیں کرتیں اور جب میں ان کو بھابی کہہ کر چھیڑتی ہوں تو یہ جھینپ کر مسکرانے لگتی ہیں اور مجھ پہ غصہ تک نہیں کرتیں۔"

کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔ دردانہ بیگم کی بات سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور پیر تلے سے زمین نکل گئی۔ سر گھوم گیا، خیالات منتشر ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے کی ہر چیز سے چنگاریاں اڑنے لگیں آپ کے کلارک کا رکلاس جو اس وقت ساکن تھا ہلتا ہوا نظر آنے لگا اور دردانہ بیگم کا خوبصورت بیضوی چہرہ جگہ جگہ سے سکڑ اور پچک کر چسے ہوئے آم کی طرح دیکھنے لگا۔ کانوں میں بیک وقت سیکڑوں گھنٹیاں بجنے لگیں اور اس میں ایسا شور بلند ہوا کہ دردانہ بیگم کے ہلتے ہوئے لب دکھائی دیتے تھے مگر ان سے نکلی ہوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی شاید دردانہ کو میرے گم شدہ حواس کا پتہ لگ گیا۔ کمال نوازش سے وہ میری طرف کھسک آئیں۔ اور میرے زانو سے اپنا زانو ملا کر میرے جھکے ہوئے

سر کو اٹھا دیا اور میری پیشانی پر سے ٹھنڈے پسینہ کی بوندوں کو اپنے معطر رومال سے پونچھ کر بڑے پیار سے کہنے لگیں "۔ گھبرائیے نہیں، بلا سے نیلو نے آپ کو چھوڑ دیا۔ کیا دنیا میں اور لڑکیاں نہیں ہیں؟" میں ان کی باتوں کو شاید سن نہیں رہا تھا یا اگر سن رہا تھا تو کوئی اثر نہ لے رہا تھا۔ ابجے وہ مجھ سے اور قریب ہو گئیں۔ اور اپنے دوسرے بازو کو میری گردن میں حمائل کر کے اپنا منھ میرے منھ سے بہت قریب کر دیا۔ اور گھبرائی ہوئی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگیں "آپ کو میرے سر اور جان کی قسم، آپ میرا لہو پیئیں جو مسکرا نہ دیں، آپ کی بلا سے کوئی آپ کو یاد کرے یا نہ کرے، میری طرف دیکھئے، میں نے جب سے آپ کی تعریف سنی ہے خدا گواہ ہے کہ آپ سے ملنے کے لئے بے تاب تھی، آج خدا خدا کر کے یہ موقع ملا ہے کہ آپ کو دیکھ رہی ہوں اور آپ کی باتیں سن رہی ہوں للہ غمگین صورت نہ بنائیے۔ آئیے ہم لوگ خوشی خوشی غم دنیا سے الگ ہو کر اپنی دنیا آباد کر لیں۔ بولئے...... بولتے کیوں نہیں، آپ کو میری جان کی قسم......"

میں آپ اپنے یاس و حرماں کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور بیچاری دردانہ آئی تھیں اپنے کمزور بازو سے مجھے سہارا دینے اور مجھے بھنور سے نکالنے۔ کیا خوب۔ اچھی سچائی تھی کہ دوست بن کر مجھے میرے عزیز از جان دوست سے الگ کرنا چاہتی تھیں۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

میں اپنی کشمکش میں مبتلا تھا اور یہ بی جمالو آپ اپنی فکر میں تھیں۔ میرا غصہ سے سارا جسم کانپنے لگا اور اگر قرون وسطیٰ کا نیم بربری زمانہ ہوتا تو میں یقینی ان

بی صاحب کے سرخ سرخ گال پر اپنی پانچوں انگلیوں کے نیلے پیلے نشان بنا دیتا مگر افسوس ہم مہذب سوسائٹی کے افراد ہیں اور ہمارے قبضہ سے یہ حواکی بیٹیاں باہر نکل گئی ہیں! مگر کب تک میں ان کی سرگوشیوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلہ کو بیٹھا سنتا رہتا۔ تنگ آ کر میں نے کہا "مہربانی کر کے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے" یہ کہہ کر میں نے چاہا کہ اپنی گردن کو ان کے بازو سے چھڑاؤں اور ہاتھ سے میں نے ان کے چہرہ کو اپنے کان سے پرے ہٹانا چاہا۔

میں ایسا کر رہا تھا کہ اندر کا دروازہ کھلا اور آپ داخل ہوئیں۔ آپ کے پیچھے زرینہ بیگم مسکراتی چلی آ رہی تھیں۔ ابھی میں اچھی طرح زردانہ بیگم سے دور ہٹ کر بیٹھ بھی نہ سکا تھا کہ دوسری طرف سے محمود صاحب آ دھمکے۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ حالات جب اس قدر نازک صورت اختیار کر لیں اور ایک نے بد قسمت غلط فہمی کا قلب پر سکہ بیٹھ جائے تو پھر ایسی صورت میں میرے لئے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ تھا اس لئے اٹھا اور خاموشی سے چلا آیا یہ خط بھی شاید نہ لکھتا اگر از الہ غلط فہمی منظور نہ ہوتا۔

زردانہ بیگم کا میں مشکور ہوں کہ انہوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی جو میں سن رہا تھا۔ اچھا خدا حافظ! (خیر طلب شکستہ دل)

---

(۱۴)

رانچی

۱ جولائی ۳۶ء

محترمہ نیلو فر صاحبہ! اداب عرض ہے

میں نے اپنے گذشتہ خط میں جو کچھ لکھا تھا اس کو ماننا نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے اور اس کے متعلق میں اپنی طرف سے مزید صفائی کے لئے کچھ اور پیش نہیں کرسکتا۔ میں کوئی وکیل نہیں ہوں کہ ہر واقعہ کا چشم دید گواہ پیش کرتا پھروں۔ جب دلوں میں پھوٹ پڑجاتی ہے تو سچ بھی جھوٹ نظر آنے لگتا ہے۔ میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں اس لئے اور زیادہ سچ بول کر آپ کی نظروں میں اور زیادہ جھوٹا بننا نہیں چاہتا۔

آپ کو کیا سارے جہان کو ایسی دور از فہم کہانی پر اعتبار نہ آئے گا کہ ایک حد درجہ مہذب اور تعلیمیافتہ لڑکی کسی غیر مرد سے پہلی ملاقات میں یوں کھل کر ملے گی کہ دیکھنے اور سننے والے حیرت اور بے اعتباری سے اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لیں گے اگر خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید میں بھی اس قصہ کو سن کر آپ کی طرح کہتا "واہ کیا خوب افسانہ تھا۔ ایک ایسا اور لکھ بھیجئے۔" میں کوئی داستان گو نہیں کہ اگلی پچھلی باتوں کو جوڑ کر اور کچھ ادھر سے اور کچھ اُدھر سے کتر بیونت کر کے کوئی کہانی بنالوں اور پھر رنگین صورت بنا کر آپ کو سناؤں۔ اور آخر میں ذرا تن کر کہوں۔ "یہ خاص میری اپنی کہانی ہے۔" یہاں تو محترمہ اپنا یہ حال ہے کہ صرف وہی لکھتا اور بولتا ہوں جس کی ہوک دل میں اٹھتی ہے اور اگر اس کو بیان نہ کردوں تو کلیجہ پھٹ جائے۔

اور ور دانہ بیگم نے اپنے خود ساختہ انداز بے تکلفی کے متعلق کیا کہا؟ ان سے دریافت کر لیجئے۔ اگر وہ کچھ اور کہیں تو میرا ان کا سامنا کرا دیجئے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی

کیا؟ آپ خود فیصلہ کر لیں گی کہ سچ کون بول رہا ہے اور جھوٹا کون ہے؟

مجھے محمود صاحب کے جذبات برانگیختہ سے بڑی ہمدردی ہے اور کیوں نہ ہو؟ ایک بھائی اپنی آنکھوں سے اپنی بہن پر دست درازی ہوتے دیکھ کو خموش نہیں رہ سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس نظارہ کو دیکھ کر چپ کیوں رہ گئے اور مجھے بیک بینی و دو گوش واپس کیوں آنے دیا؟ مجھے جب کبھی محمود صاحب کا وہ اترا اور کچھ گھبرایا ہوا چہرہ یاد آتا ہے تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ نہ جانے وہ میرے متعلق کیا خیال کرتے ہوں گے۔ اور مجھے کس قدر برا آدمی سمجھنے لگے ہوں گے۔ اس ناشدنی واقعہ سے میں خود ایسا پشیمان ہوں جیسے میں واقعی گناہگار ہوں اور جب ہمت کر کے ان کے گھر جانا چاہتا ہوں کہ چل کر ان کی غلط فہمیوں کو دور کر دوں تو میرے پاؤں بندھ جاتے ہیں۔ اور ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھتا، پھر سوچتا ہوں کہ اگر ان کے ہاں چلا بھی گیا تو ان سے کیا کہوں گا اور کس طرح میری زبان کھلے گی کہ صاحب اس میں میرا قصور نہیں بلکہ آپ کی ......۔ اور اگر نہیں جاتا تو وہ سمجھیں گے کہ دیکھو اس کے دل میں یقینی چور تھا جب تو مجھ سے نہیں ملتا اور کلب تک نہیں آتا میں سخت الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

وہ شاید مجھ سے یقینی ناراض ہیں جب ہی تو آج ہفتہ ہو گیا مگر ایک بار بھی غریب خانہ پر تشریف نہیں لائے۔ اور ہاں صاحب اب وہ میرے ہاں کیوں آنے لگے؟ ان دنوں تو ان کا آسمان خیال آرزوؤں کے جھلملاتے تاروں سے پٹا پڑا ہوگا۔ اور اس آسمان میں نہ جانے کتنے آفتاب و ماہتاب رنگین قندیلوں کی طرح آویزاں ہونگے؛ اب میرا گھر تو ان کے لئے قید خانہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا ہوگا اور شطرنج کی

بازیاں ان کی نگاہوں میں قید تنہائی کی وقت گذارنے والی سزا ہوگئی ہوں گی!

میری قسمت ایسی کبھی بھی نہ تھی کہ کسی اور سے اس کا مقابلہ کرتا علی الخصوص محمود صاحب سے جو نہ صرف آپ کے عزیز ہیں بلکہ ہر لحاظ سے وہ مجھ سے بہتر ہیں اس لئے جب سے میں نے سنا ہے کہ وہ آپ کے خواہاں ہیں مجھے ایک طرح کی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کو ایک نہایت معقول جیون ساتھی مل رہا ہے۔ خدا کرے یہ ملاپ ہو طرح کی خوشیوں کا پیش خیمہ بنے اور اس جوڑے کو خدا گوناگوں مسرتوں سے مالا مال کرے۔ اس نامعقول واقعہ نے میری زبان بند کر دی ہے اور مجھے مجبور کر دیا ہے ورنہ میں خود محمود صاحب کو مبارک باد پیش کرتا اور کہتا "کبھی تمہاری لنظر انتخاب کے میں صدقے! کیا خوب پسند تم نے پائی ہے اور کیا اچھا دوست تم نے چنا ہے"!

حالات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی ہے کہ قرب فاصلہ میں اور حال ماضی میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ میں جس کو جھیل سمجھ کر اپنی پیاس بجھانے آیا تھا وہ بدقسمتی سے سراب نکلا۔ اب میرے لئے اور کیا باقی رکھا ہے کہ کشمکش زیست کے سمندر میں اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو چپوؤں کی للد کو بی سے سطح آب پر قائم رکھوں۔ ڈوبنے دیجئے اسے اور ساتھ میں ان ارمانوں کو بھی تہ آب جانے دیجئے۔ جس کو محض ہوائے موافق کے تھپیڑوں نے تھوڑی دیر کے لئے حباب بنا کر ابھارا تھا اور پھر خود ہی اسے توڑ دیا۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ کچھ دنوں کے لئے باہر چلا جاؤں۔ اچھا خدا حافظ!

(خیر اندیش)

---

# (۱۵)

مدھو پور
۲ اگست ۱۹۶۳ء

ڈیر نیلوفر صاحبہ! تسلیمات عرض ہے!

جی ہاں آپ کا ہر خط جو آپ نے مجھے یہاں کے پتہ پر روانہ کیا وہ مجھے ملا مگر میں نے دانستہ جواب نہیں دیا کہ ان خطوں میں کوئی ایسی جواب طلب بات نہ تھی اور نہ میرا جی چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں۔ جب سے یہاں آیا ہوں طبیعت گری گری سی رہتی ہے، جی اداس رہتا ہے اور کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اس سے پہلے مدھو پور جب کبھی آیا تو ہمیشہ خوش رہا کرتا تھا اور یہاں کا پرسکون ماحول مجھے بہت پسند تھا۔ میرا بنگلہ کچھ ایسی بلندی پر واقع ہے کہ دور دور تک کی پہاڑیاں اور ان پر اگے ہوئے سبز پودے اور جھاڑیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جگہ چونکہ پہاڑی ہے اس لئے دھول کبھی نہیں اڑتی اور صبح شام کا سماں جب سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے تو اتنا نظر فریب اور دل کش ہوتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جی ہاں، زرینہ بیگم اور ان کی والدہ یہاں اپنے کسی رشتہ دار سے ملنے آئی تھیں۔ ان کے والد صاحب بھی دو دن کے لئے تشریف لائے تھے مگر ضروری کام کے سبب سے پھر کلکتہ لوٹ گئے۔ ان کی والدہ یہاں سے لکھنؤ چلی گئیں اور زرینہ بیگم، پتہ نہیں کہاں گئیں۔ مگر نہیں، آپ نے تو لکھا ہے کہ وہ رانچی آگئی ہیں۔ کیا کہا انہوں نے کہ ان سے میری ملاقات صرف دو بار ہوئی اور میں یہاں بہت سی لڑکیوں سے بلا تکلف روزانہ ملتا ہوں اور مسز داس گیتا نام کی عیسائی لڑکی ہر

گھڑی گویا میرے ہاں پڑی رہتی ہے۔ اب میں کیا عرض کروں کہ وہ آپ کی سب سے چہیتی سہیلی ہیں، ان کے خلاف کچھ بول کر میں جھوٹا کیوں بنوں اور کھوئے ہوئے اعتبار کو اور کھو دوں؟

اور اگر ایسا ہو بھی تو آپ کو کیا غرض، اب میں کسی سے ملوں اور میرے گھر میں کوئی بھی پڑا رہے۔ اس سے آپ کو کیا پڑا رہنے دیجئے۔ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں اور خدا حافظ کہتا ہوں۔ (دل برداشتہ وجاں دادہ خیر طلب)

---

(۱۶)

مدھوپور
۷ اگست ۳۶ء

محترمہ نیلوفر صاحبہ! مزاج مبارک!

میں آپ کا مخلص دوست ہوں اور انشاء اللہ مرتے دم تک رہوں گا۔ میرا اخلاص کسی لالچ کے سبب سے نہیں میں کوئی ملا مسجد نشین نہیں کہ روٹیوں کی فکر میں نمازیں پڑھتا رہوں۔ اور جب دو اور دو کو جمع کرنے کے لئے کہا جائے تو چار روٹیاں گنا دوں۔ آپ اگر "پر لطف باتیں" لکھ بھیجئے کا وعدہ نہ بھی کرتیں تب بھی میں آپ کا حکم بجالانے کو تیار تھا۔ جہاں دردانہ بیگم کے واقعات بلاکم وکاست بیان کرنے میں مجھے کوئی رکاوٹ نہ تھی تو وہاں زرینہ بیگم کی ملاقاتوں کا حال سنانے میں مجھے کیا جھجک ہوسکتی ہے؛ سنئے اور شوق سے سنئے مگر خدارا اسے سنکر پھر نہ لکھ بھیجئے کہ افسانہ مزیدار تھا۔ ایک آدھ اس طرح کا اور لکھ بھیجئے۔ چونکہ میں کسی سے بھی

جھوٹ نہیں بولتا اس لئے اس کی عادت نہیں اور آپ کے سامنے تو شاید یہ ممکن بھی نہیں۔

ایک دن شام کو میں اپنے احاطہ کے چھوٹے سے باغ میں کچھ پھول کے پودوں کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری کیاری میں نصب کرنے کے لئے مالی کو حکم دے رہا تھا کہ دیکھا سامنے سڑک پر موٹر آ کر رکا۔ میں نے سمجھا کہ پڑوس میں کوئی صاحب آئے ہوں گے۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی احاطہ کے بڑے پھاٹک کے کھولنے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو اسلم آ رہے تھے۔ یہ یہاں کے ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر خان بہادر انصار احمد کے شاید بھتیجے یا بھانجے ہوتے ہیں اور ایف۔ اے میں پہلے پٹنہ، پھر کلکتہ اور بعد میں علیگڈھ سے دوبارہ فیل ہو کر اب پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور یہی کچھ مرغیوں اور کچھ گلاب کے پھولوں کا کاروبار شروع کیا ہے۔

ان سے میری ملاقات ایک بار ریلوے اسٹیشن پر ہوئی۔ اور دوسری بار خود ان کے ہاں جب میں خان بہادر صاحب کے علاج کے سلسلہ میں گیا تھا۔ مجھے اپنی طرف مخاطب پا کر مسکرانے لگے اور پھر آگے بڑھ کر کہا "ڈاکٹر صاحب معاف کیجئے۔ رانچی سے میری ماموں زاد بہن ذرینہ بیگم آئی ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں اور وقت ملاقات دریافت کیا ہے"۔ میں نے کہا "ہاں ہاں وہ شوق سے مل سکتی ہیں۔ وقت ملاقات کچھ بھی نہیں، ان کا گھر ہے جب چاہیں آئیں یا مجھے بلوا بھیجیں، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔" مجھے پرتپاک دیکھ کر پہلے ہنسے اور پھر کہنے لگے "وہ اگر ایسا ہے تو وہ اسی وقت آپ سے ملیں گی۔ باہر موٹر میں تشریف رکھتی

ہیں "یہ سنکر میں ذرا دیر کے لئے کچھ حیرت میں آگیا مگر فوراً خوش ہو گیا کہ آپ کی دوست ہیں، ابھی رانچی سے آرہی ہیں، آپ کی کچھ نہ کچھ تازہ خبر مل ہی جائے گی۔

میں لپک کر باہر نکلا اور بلومس زرینہ کہتا ہوا ان کے موٹر کا دروازہ کھول دیا اور ان کو نہایت عزت اور خوشی سے اپنے ہاں لے آیا۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں، میرے باغ اور بنگلہ کی ہر چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ مگر آپ کے متعلق میرے ہر سوال کا جواب بس ایک طرح سے دیا "ہاں اچھی ہیں، خوش ہیں، آپ کو کبھی کبھی یاد بھی کر لیتی ہیں، محمود صاحب آتے ہیں، خوش ہیں، ابھی ان کو کوئی جواب نہیں ملا ہے وغیرہ وغیرہ" زرینہ بیگم نے میری ہر چیز سے بے انتہا دلچسپی کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ مٹرپل سی ایک تصویر جو دیوار پر لٹک رہی تھی اُس کو بھی ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے پرکھا اور اس کے جملہ عیوب و ہنر پر ایک ماہر فن کی طرح نکتہ چینی کی مگر میرے سوالات آپ کے متعلق، جن میں جان و دل سے منہمک تھا وہ ان کی عالمگیر دلچسپیوں کو اپنی طرف مخاطب نہ کر سکے اور جب کبھی میں اپنے سوال کے مفصل جواب پر اصرار کرتا تو وہ ادائے خاص سے ہنس کر فرماتیں "کہتی ہوں ذرا صبر بھی کیجئے"

ان پر سیمابی کیفیت کچھ دیر تک طاری رہی یعنی کسی پہلو قرار نہ آتا تھا، میں اس فکر میں تھا کہ وہ بیٹھیں تو کچھ کام کی باتیں کروں، ان سے پوچھوں کہ کچھ چاد وا پئیں گی مگر وہ تو جیسے پر لگا کر آئی تھیں، ہلکے آسمانی رنگ کی تیتری کی طرح کبھی یہ دیکھ، کبھی وہاں جا، کبھی اس کو اٹھا اور کبھی اس کو رکھ کے شغل لطیف میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر جدھر اور جہاں جہاں جاتیں ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے یا پھر ہماری نظریں ان کے پیچھے پیچھے چلتیں آخر خدا خدا کر کے وہ کچھ شانت ہوئیں اور ایک کرسی پر

بیٹھ گئیں جو پیانو کے قریب رکھی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا "چائے حاضر کروں" میرے سوال سے جیسے کوئی کڑوی چیز نکل کر ان کے منہ میں چلی گئی اور چہرے پر وہ کل نشانات ابھر آئے جو کونین کے گھونٹ میں پینے والے کے چہرہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ میں نے مسکرا کر اسلم صاحب کی طرف دیکھا کہ کہیں میرے اس سوال سے انہوں نے بھی کونین تو نہیں پی لی مگر وہ خود بھی زرینہ بیگم کے چہرہ کو حیرت اور کچھ گھبراہٹ سے دیکھ رہے تھے، ہمیں پیچ و تاب میں پا کر وہ مسکرائیں، اپنے رنگے ہوئے نچلے لب پر ڈرتی ہوئی زبان پھیر کر ذرا سی جھکی لی اور کہنے لگیں "وہ چائے پی کر چلی ہوں مگر دوبارہ پی لینے کو تیار ہوں"!

میں نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے پوچھا "یہاں کب آئیں، مجھ سے کبھی آپ نے ذکر بھی نہیں کیا کہ آپ کے کوئی رشتہ دار یہاں رہتے ہیں؟" اسی دوران میں ان کا بایاں ہاتھ شاید لاشعوری طور پہ پیانو کے کرخت سر والے پردوں پر گر گیا جو دفعتاً جھنجھنا اٹھے۔ زرینہ بیگم نے چیخ کر اپنا ہاتھ اس پیانو پر سے ایسا ہٹا دیا جیسے سانپ نے ان کو (خدا نہ کرے) کاٹ کھایا ہو۔ ادھر ہاتھ کھینچا اور ادھر اچک کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں، چہرہ زرد پڑ گیا، ماتھے پر ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے، اور سر سے پاؤں تک کانپ کر نہایت نحیف آواز میں بولیں "الٰہی میری توبہ ہے!" ان کے اس دفعتاً چیخ کر اٹھ کھڑے ہونے سے ہمارا کلیجہ بھی دھک سے ہو گیا اور ہم بھی کھڑے ہو کر تعلق اور ہمدردی سے ان کی طرف دیکھنے لگے!

ہمیں یوں گھبرائے ہوئے دیکھ کر انہوں نے "آئی ایم ویری سوری" مجھے بہت افسوس ہے" کہا اور بناوٹی غصہ سے پیانو کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے

لگیں "یو بروٹ، آئی ول پنش یو فور دو پٹ دیا جی، ٹھہریں تیری خبر لیتی ہوں"
یہ کہہ کر ہنس پڑیں، ہماری طرف معذرت خواہ نظروں سے دیکھا جن میں شوخی
کہہ رہی تھی "دو اگر میں ڈر گئی تھی تو آپ کو کیا ہوا تھا؟" ہم بھی ہنسنے لگے اور کچھ آپ ہی
آپ جھینپ کر اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ زرینہ بیگم نے پلٹ کر فریب ناکردہ
گنہگار پیانو کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔ پیانو کی داد فریاد سے سارا
کمرہ گونج اٹھا اور کمرہ کی ہر چیز لرزہ براندام ہو گئی۔

زرینہ بیگم پیانو کے کان کھینچ رہی تھیں کہ اسلم نے کہا "وہ غریب کافی پٹ چکا اب
اسے معاف کر دو" مگر وہ ہماری طرف پشت کئے کھڑی رہیں اور "نہیں، نہیں نہیں
نہیں" کہتی ہوئی پیانو کے پردوں پر انگلیاں پھیرنے لگیں، چنانچہ ہر نہیں کے ساتھ
پیانو کے ذوپھٹو اپردے بول اٹھتے اور یہ نہیں نہیں کا مترنم بول کبھی کھادے
پنجم سر میں اور کبھی پنجم سے کھاد میں چلا جاتا تھا۔ اسلم سے اب نہ رہا گیا، خوشامدانہ
لہجے میں کہنے لگے "بھئی پیانو کو سزا دے چکیں اب ہمیں جو خواہ مخواہ چونکا کر متوحش
کر دیا تھا اس کا جرمانہ ادا کرو" فرمانے لگیں "وہ کیسے؟" میں بھی اس نہیں نہیں
کی گت سے متاثر ہو چکا تھا جستہ کہہ بیٹھا "وہ گا کر"!

"جی! آپ گانا سنیں گے؟" یہ کہہ کر زرینہ بیگم نے میری طرف دیکھا اور ایسے بھولپن
سے اپنے گندم گوں چہرہ پر بناوٹی حیرت و استعجاب کی سلوٹیں پیدا کیں کہ میں نے سمجھا
میں کسی تصویر کے پردہ پر نہایت باکمال آرٹسٹ کو دیکھ رہا ہوں، ان کی کشادہ
اور منور پیشانی پر دونوں بھنوؤں کے بیچ میں گھڑی لکیریں ابھر آئیں، آنکھیں نہ
بڑی اور نہ چھوٹی کچھ ادھ کھلی سی ہو گئیں اور ان کی سیاہ سیاہ پتلیاں ذرا اوپر

کی طرف اٹھ گئیں، نچلا لب جو ہر وقت رس سے بھرا ہوتا ہے پھیل کر اوپر سکڑ کر دوسرے لب سے مل گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ ان لبوں نے پہلے کمان کھینچے اور پھر تیر چلا دیا۔ میں محو حیرت تھا اور شاید اسلم صاحب بھی اسی قسم کی حالت میں مبتلا ہونگے کہ زرینہ بیگم نے ہنس دیا اور ان کی ہنسی کے ساتھ ساتھ کمرہ کی جاندار اور غیر جاندار چیزیں بھی مسکرا پڑیں، میں نے ایک لمبا سانس باہر پھینکا، اسلم نے پہلو بدل کر آرام کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹیک لیا، زرینہ بیگم نے اپنے سر کو جنبش دی کہ گھنگھریالے بالوں کی لٹیں جو بکھر کر جو ان کے ماتھے پر آگئی تھیں وہ پیچھے جا گریں اور کرسی کو ٹھیک سے پیانو کے قریب جا کر بیٹھ گئیں اور دونوں ہاتھوں کی چھریری انگلیوں کو جن کے سرے پر ناخنوں کی جگہ لال نگینے جڑے تھے پیانو کے پردوں پر پھیر کر ایک تان لی۔ جگر کی اس غزل کو ایسے لب ولہجہ میں گایا کہ گویا رگوں سے جان کھینچ رہی ہیں ؂

اب ان کا کیا ٹھکانا وہ آئیں یا نہ آئیں؛

آ، اے غم محبت تجھ کو گلے لگائیں !!

جب تک گاتی رہیں ایک سماں تھا کہ بندھ گیا تھا جس میں ہمارے دلوں نے بھی دھڑکنا بھلا دیا تھا اور شاید ہوا بھی اپنا چلنا فراموش کر چکی تھی، یہ محسوس ہو تا تھا کہ زمین سے لیکر آسمان تک، ہر شے میں زرینہ بیگم کے مدھر سنگیت سے ایک ہلکی سی کپکپاہٹ پھیل گئی ہے، زمین کے جمادات اور نباتات، آسمان کے چاند اور تارے سب کے سب اپنی جگہ پر ساکن ہو کر کانپ رہے ہیں اور ان کے غم محبت سے متاثر ہو کر رو رہے ہیں، وہ گا رہی تھیں، ان کی تیز رو انگلیاں پیانو کے پردوں کو اپنی سبک خرامی سے تھپکیاں دے رہی تھیں اور ان کی ہارمونیک آواز کے زیر و بم میں

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری روحیں تحلیل ہو کر آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہیں۔
پتہ نہیں کیوں، ان کے گانے سے میں اتنا متاثر ہوا کہ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور میں نے ہزار کوششیں کیں کہ میری اس کمزوری کا راز اسلم صاحب پر ظاہر نہ ہو۔ مگر شاید میرے تمام جتن کے باوجود انہوں نے مجھے آنسو پونچھتے دیکھ ہی لیا۔ میں ان کو گاتے دیکھ کر ان گھڑیوں کو یاد کرنے لگا تھا جب ایسی صحبتوں میں آپ بھی ہوتی تھیں زرینہ بیگم کو پیانو بجاتے دیکھ کر مجھے اکثر دھوکا ہو گیا کہ یہ شاید آپ ہیں۔

غزل تمام ہوئی، میں شدت جذبات سے ایسا مجبور ہو گیا تھا کہ ان کی داد نہ دے سکا۔ اور اپنی کرسی پر۔۔ بیٹھا کھوئی ہوئی آنکھوں سے ان کے پتلے نقوش اور دھان پان جسم کو دیکھتا رہا، اسلم نے میری طرف سے بھی گویا خوب خوب ان کی داد دی اور حوصلہ افزائی کی۔ اتنے میں ملازم چائے لے کر آگیا، زرینہ بیگم نے ہم سے پوچھ پوچھ کر ہماری چائے کی پیالیوں میں شکر ڈالی اور چائے بنا کر ہماری طرف بڑھایا۔ ہم پینے لگے۔ میں نے پوچھا "معاف کیجئے گا، میں اس خیال میں تھا کہ بی۔ اے کرنے کے لئے آپ لکھنؤ جا چکی ہوں گی۔" چائے کے ایک گھونٹ کو جیسے زہر مار کر کے بولیں "جی ارادہ تو کچھ ایسا ہی تھا مگر صحت اس کی اجازت نہیں دیتی، آپ دیکھتے ہیں کہ میں کیسی کمزور ہوتی جا رہی ہوں؟" میں نے چائے ختم کر کے ایک سگریٹ سلگایا اور کہا "صحت آپ کی خدا نہ کرے کہ اتنی خراب ہو جتنا آپ سمجھ رہی ہیں البتہ ذرا دبلی ہیں انشا اللہ بہت جلد یہ حالت بھی جاتی رہے گی، فکر نہ کیجئے، رانچی میرے خیال میں آپ کے لئے اس سے بہتر جگہ تھی" چائے کی پیالی کو طشتری میں رکھ کر بولیں "جی، رانچی اچھی جگہ ہے مگر وہاں کے پانی میں شاید لوہے کا جز زیادہ ہے اس لئے اکثر مجھے قبض رہتا تھا اور معدہ بھی خراب رہتا تھا۔"

اب شام ہو چکی تھی، غروب آفتاب کا خوبصورت منظر سنہرے اور سرمئی رنگ کے بادلوں سے ڈھکنے لگا تھا، پورب میں آموں کے گھنے باغ کے پیچھے کالے کالے بادل امنڈ کر جمع ہونے لگے تھے اور ان بادلوں کی موٹی تہوں کو بجلی کا باریک سا خنجر بار بار رہ رہ کر چیرنے لگا تھا، مرطوب ہوا کے تیز جھونکے زرینہ بیگم کی باریک آسمانی رنگ کی ساری کو پھریرے کی طرح لہرانے لگے تھے۔ اسلم نے کہا "وہ بارش ہونے والی ہے، اب ہمیں چلنا چاہئے سمجھے" ہم کمرے سے اٹھ کر باہر آئے، باغ کی کیاریوں میں سفید اور سرخ رنگ کے گلاب کھلے ہوئے تھے اور اس وقت ہوا کے تیز جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ زرینہ بیگم نے چلتے چلتے جھک کر دو پھول توڑے، ایک سرخ اور ایک سفید، سرخ کو اپنے جوڑے میں لگایا اور سفید کو میری طرف اچھال کر بولیں۔ "یہ لیجئے، نیلو بہن کا تحفہ" میں نے پھول کو روک کر مسکراتے ہوئے پہلے اسلم صاحب کی طرف دیکھا، وہ اس وقت احاطہ کا کنواں جھانک رہے تھے اور جب میں نے زرینہ بیگم کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ اس سے بہت پہلے میرے احاطہ سے باہر نکل کر موٹر میں بیٹھ چکی تھیں اور جب تک اسلم گاڑی تک پہنچیں وہ خود موٹر کو چلانے لگیں اور ہماری طرف ایک ہلکے نیلے رنگ کے رومال کو ہلاتی ہوئی نظروں سے غائب ہو گئیں۔

اسلم صاحب کی کھسیانی ہنسی اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ان کی طوطے کی چونچ جیسی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے اور چونکہ میری ان سے زیادہ بے تکلفی نہ تھی اسلئے زرینہ بیگم کی اس عجیب حرکت سے ان کی جو سبکی ہوئی اس کو مٹانے کے لئے بے معنی سی ہنسی ہنس کر کہنے لگے "نہ ہوں، ہوں عجیب شوخ لڑکی ہے" میں نے ان کی خجالت مٹانے کے لئے کہا "اچھا اسلم صاحب شکر کیجئے کہ آپ اس وقت

اپنے مکان سے بیسیوں میل دور کسی جنگل میں نہ ہوئے ورنہ مزہ آجاتا، زرینہ بیگم کو شاید آپ اچھی طرح نہیں جانتے، ان سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ آپ کو اپنے گھر سے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر چھوڑ دیتیں" پھر ہم تھوڑی دیر تک وہیں پھاٹک سے لگ کر کچھ بے ربط سی گفتگو کرنے لگے۔ اسلم صاحب کا سخن تکیہ ہے "بجھے، بجھے آپ وغیرہ" چلتے وقت بڑے اصرار سے کہنے لگے "اتوار کے دن ہمارے ہاں ضرور تشریف لائیے، بجھے" میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں سے اب بارش کے قطرے ٹپکنے والے تھے۔ کہا "جی، سمجھا، انشاءاللہ آنے کی ضرور کوشش کروں گا"

خط لمبا ہو گیا اور میں نے زرینہ بیگم سے مدھوپور میں پہلی ملاقات کے مفصل حالات لکھ کر شاید آپ کو ایک غیر ضروری بکواس سننے پر مجبور کیا ہے، معافی چاہتا ہوں اگر آپ نے پسند فرمایا تو دوسرے خط میں دیگر ملاقاتوں کا حال مختصراً بیان کروں گا۔

یار زندہ صحبت باقی، خدا حافظ

(خیر طلب)

---

(۱۷)

مدھوپور

۲۲ اگست ۳۶ء

ڈیر نیلوفر صاحبہ! تسلیم

میں اپنے ایک دوست سے ملنے گریڈیہہ چلا گیا تھا اور وہاں گوناگوں پروگراموں میں پھنس کر جلد واپس نہ آسکا اس لئے جواب خط میں تاخیر ہوئی، معافی چاہتا ہوں۔ میں یہ پڑھ کر از حد خوش ہوا کہ آپ نے زرینہ بیگم کی پہلی ملاقات کا

حال پسند کیا۔ شکریہ، اب جا کر کہیں میری محنت ٹھکانے لگی اور میں نے سمجھا رات کے ۲ بجے تک کا جاگنا اکارت نہ گیا۔

ابھی آپ کے خط پر تبصرہ نہ کروں گا، آپ پہلے پورے حالات سن لیجیے تب خود فیصلہ کر لیجیے گا کہ ان کی خفگی صحیح ہے یا غلط، اس میں میرا قصور تھا یا اور کسی کا۔ اتوار کے دن حسب وعدہ خان بہادر کے ہاں گیا وہ بیچارے گٹھیا کے پرانے مریض ہیں اور قریب قریب ہر وقت اپنے کمرے میں لیٹے حقہ پیتے رہتے ہیں، ان کے کمرے سے صرف تین قسم کی آوازیں بلند ہوتی سنائی دیتی ہیں، حقہ پینے کی، کھانسنے کی، اور عبدالرحمان ملازم کو پکارنے کی، عبدالرحمان خضر صورت پرانا ملازم ہے، جواب کانوں سے اونچا سنتا ہے، اس لئے بیچارے خان بہادر کو پوری قوت سے پکارنا پڑتا ہے اور اپنے پکارنے کی آسانی کے لئے اس کے ذرا لمبے نام کو پکارتے وقت دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں یعنی عبد اور رحمان، عبد آہستہ سے کہتے ہیں اور رحمان زور سے۔ میں نے ایک دفعہ انہیں کی آسانی کے لئے ان کو رائے دی تھی کہ ملازم کے نام سے عبد گرا دیجئے اور صرف رحمان کہہ کر پکارا کیجیے مگر وہ میری بات پر راضی نہ ہوئے، کہنے لگے "صرف رحمان کہہ کر پکارتا ہوں تو یہ خدا کا نام ہے اور یہ اس رب العزت کی شان میں گستاخی ہوگی، اب آخری وقت ہے کم از کم ایسے گناہوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھ لوں تو غنیمت ہے۔"

میں جب پہنچا تو پہلے اسلم نے اور بعد میں مس زرینہ بیگم نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا، بیٹھ کر کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اپنی والدہ سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی والدہ سے مل کر میرا دل بہت خوش ہوا، ماشاءاللہ اس عمر میں بھی اتنی

زندہ دل واقع ہوئی ہیں کہ ایک منٹ کے لئے بھی ان کی صحبت میں جی نہ گھبرایا چست پائجامہ، ڈھیلا کرتا اور اس پر ہلکے رنگ کا دوپٹہ، ان کی معصوم صورت پر بڑا زیب دیتا ہے۔ عمر کے لحاظ سے جسم بھی چھریرا ہے مگر میں بھی کیا احمق ہوں، ان کی والدہ کا حلیہ آپ سے بیان کرنے بیٹھا ہوں، آپ نے ان کو بارہا دیکھا ہوگا اور مجھ سے زیادہ اچھی طرح۔

اس وقت سہ پہر کے ۴ بجے تھے، بارش ہو کر مطلع صاف ہو چکا تھا اور ہر طرف سبزہ اور پہاڑ نہا دھو کر نکھر گئے تھے اور ان کے مخملی سبز رنگ پر نگاہوں کو پڑے رہنے میں آرام و سکون ملتا تھا، اسلم اور زرینہ نے شام کی چائے کسی جنگل میں چل کر پینے کا سامان مکمل کر رکھا تھا، اسلم نے کہا "چلیے، ڈاکٹر صاحب، آج ہم پکنک کے لئے باون بیگھا چلیں۔ چائے کا سامان موٹر میں رکھا جا چکا ہے، سمجھے"! میں اسلم صاحب کی باتیں ان کے "سمجھے"! سے بہت پہلے سمجھ جاتا ہوں، ہم موٹر میں بیٹھ کر باون بیگھا پہنچے۔ یہ کسی پرانے انگریز کی کوٹھی کا نہایت وسیع اور کشادہ احاطہ ہے جس میں زمین کے باون بیگھے ہیں۔ اب یہ کس مپرسی کے عالم میں ہے اور وہ درخت جو کبھی قرینہ سے لگائے گئے تھے ان کا جنگل سا ہو رہا ہے، ہم نے ایک پہاڑی نالے کے کنارے گھنے برگد کے درخت کے نیچے اپنا فرش بچھایا اور اسٹوو جلا کر چائے بنانے لگے،

زرینہ بیگم کو صبر آزما کاموں سے الجھن ہوتی ہے۔ یہاں اسٹوو پر کیتلی چڑھائی گئی اور وہ آہستہ سے اٹھ کر خودرو پھولوں کو توڑنے اور ان پھولوں کے گرد ننھی ننھی زرد رنگ کی تیتریوں کو پکڑنے چلی گئیں۔ ہم ادھر پانی ابلنے اور سینڈوچ کے لئے روٹی تراشنے میں منہمک تھے اور ادھر زرینہ بیگم مدھم سروں میں گنگناتی ہوئی

دور نکل گئیں، ان کا گانا جوں جوں وہ دور ہوتی گئیں زیادہ بلند آواز میں ہوتا گیا۔ ان کے گانے کی ایک کڑی تھی "کوئیلیا بولے کو ہو کو ہو" کچھ دیر بعد ہم سے وہ اتنا دور ہو گئیں کہ گانا صاف سنائی نہ دینے لگا۔ صرف "کو ہو کو ہو" کی آواز آرہی تھی، میں اسٹوو میں ہوا بھر رہا تھا کہ دور سے "کو ہو کو ہو" کی آواز آئی اور پھر نزدیک سے میں چونک پڑا مگر یہ میرے کانوں کا دھوکا تھا، نزدیک کسی درخت کی شاخ پر کوئل بیٹھی بول رہی تھی اور دور زرینہ کے گانے کا کو ہو کو ہو تھا۔ دونوں آوازوں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ میرے عجیب قسم کے تخیل نے پہلے زرینہ بیگم کو رنگین تیتری میں تبدیل ہوتے دیکھا پھر ان کو کوئل بن کر کو ہو کو ہو کرتے سنا.....

دور بہت دور ایک چیخ کی آواز بلند ہوئی اور کو ہو کو ہو کی وہ صدائے بازگشت دفعتاً بند ہو گئی۔ اسلم نے میری طرف اور میں نے اسلم کی طرف معنی خیز اور متوحش نگاہوں سے دیکھا، ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ پھر دوسری چیخ کی آواز آئی، ہم گھبرا کر اٹھے، اسلم نے صرف لفظ "سمجھے" کہا اور ڈبل روٹی کاٹنے کی چھری جو ان کے ہاتھ میں تھی وہ لیے ہوئے چیخ کی طرف دوڑے، میں نے شدید گھبراہٹ کی حالت میں اٹھنا چاہا کہ میرے ہاتھ کی ٹھوکر سے گرم پانی کی کیتلی اسٹوو سے نیچے گری اور کھولتا ہوا پانی میرے بند جوتے میں گھس گیا، سوزش سے میں بلبلا اٹھا مگر اپنے بھاگنے کی رفتار میں کمی نہ کی، ہم بھاگتے، دوڑتے اور ہانپتے ہوئے وہاں پہنچے جہاں سے چیخوں کی آواز بلند ہو رہی تھی، دیکھا زرینہ بیگم جھرنے کے کنارے جھک کر چیخ رہی ہیں، ہم نے پھولتے ہوئے سانس کو بڑی مشکل سے دبا کر بیک وقت پوچھا "خیریت ہے، کیا ہوا، کیا ہوا کیوں چیخ رہی ہو" انہوں نے انگلی کے اشارے سے پانی کی طرف دکھایا، ہم پھلانگ

کر نالے کے کنارے پہنچے، ہمارے کودنے کی دھمک سے چند مینڈک غڑاپ سے پانی کی تہ میں بیٹھ گئے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھ کر جب کوئی خوفناک چیز نہ پائی تو پلٹ کر زرینہ سے پوچھنا چاہا کہ وہ کیا بلا تھی جس نے ان کو اس قدر گلا پھاڑ کر شور کرنے پر مجبور کیا تھا، زرینہ بیگم نے ہمیں اپنی طرف مخاطب ہوتے دیکھ کر بڑی معصومیت سے کہا "اب بھاگ گئے!" "وہ کیا؟" "آپ نے دیکھا نہیں؟" "جی نہیں" زرینہ نے مسکرا کر چھیڑنے کے انداز میں کہا "اجی وہی مینڈک!" "لاحول ولا قوۃ، ان مینڈکوں کو دیکھ کر اتنا شور مچایا گیا تھا؟ آپ بھی واللہ عجیب بزدل ہیں؟" زرینہ نے کڑھ کر منہ بسور لیا اور کہنے لگیں "اجی میں اتنی بزدل نہیں ہوں، میں تو شور اس لئے کر رہی تھی کہ دیکھوں یہ شور سنکر بھاگتے ہیں یا نہیں؟" ہم نے پھر لاحول بھیجی مگر وہ شیطان اس کی زد سے باہر نکل چکی تھی اور ہنستی ہوئی چھلاوہ کی طرح ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی،

ہم نے اسٹوو پھر جلایا اور اس بار زرینہ بیگم کو قید کر لیا کہ جب تک وہ ہمیں چار بنا کر نہ پلا لیں ان کو جانے نہ دیا جائے گا، ان کا چار بنانا بھی قابل دید تھا، کوئی دس بار گرم پانی سے ان کی انگلیاں جلیں (برائے نام) اور ہر بار "اوئی، آہ، ہوں" کی صدائے رنگیں سے فضا مرتعش ہو گئی، کبھی فرش پر شکر گر گئی اور کبھی چار دانی کا ڈھکن ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ اگر مجھے اسلم صاحب کی دلچسپیوں کا خیال نہ ہوتا تو میں کہتا۔ "محترمہ، آپ تکلیف نہ کیجئے، میں چار بنا کر آپ کو پلاتا ہوں۔" مگر میری اس حرکت سے شاید اسلم صاحب کی طلسماتی دنیا کو دھچکا لگتا اور ان کے من مندر کی سب مورتیاں گر کر چکنا چور ہو جائیں۔ اسلم اب اس بات پر مصر ہو گئے کہ ہمیں گانا سناؤ۔ شاید

ان کی دل چسپیاں اب مرغبوں سے کم ہو کر زرینہ بیگم کے چہکنے کی طرف مائل ہونا چاہتی تھیں!

اس دفعہ نہ جانے کیوں، بڑی خوشامدوں کے بعد گانے کے لئے تیار ہوئیں مگر جب گانے لگیں تو جنگل رقص کرنے لگا اور درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیوں نے اپنی نواسنجی بند کر دی۔ غالبؔ کی یہ غزل اور زرینہ کی زبانی، کیا کہوں، بس یوں سمجھیے کہ ذکر محبوب تھا، شیریں اور کیف آور، سنتے جاؤ مگر تسکین نہ ہو، پیے جاؤ اور پیاس نہ بجھے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟

یہ غزل ختم ہوئی، معلوم ہوا جیسے یک لخت سارے عالم میں خلا سا پڑ گیا، زرینہ بیگم کی رسیلی آواز کائنات کے ہر ذرّہ میں پیوست ہو گئی تھی اور جب یک بیک انکا گانا ختم ہوا تو ہر شے میں کمی سی محسوس ہونے لگی یہ کمی ہم پر بڑی گراں گذری خاصکر اسلم صاحب تو یوں چونک پڑے جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر ان کو مزیدار نیند سے جگا دیا ہو، وہ پھر اصرار کرنے لگے "دہرا دو، ایک سے کچھ بھی نہیں ہوا، سمجھیں، ایک اور سنا دو"۔ مگر زرینہ بیگم نے ان کا منہ چڑا کر کہا "اک اور سنا دو، ہم اب یوں نہیں گاتے جب تک کہ ..... جب تک کہ ....." ہم اس انتظار میں تھے کہ جملہ تمام ہو تو ان کی شرط معلوم ہو مگر یہ جب تک کا سلسلہ نا ختنا ہی گویا شیطان کی آنت ہو گیا میں نے تھک کر سگریٹ سلگائی اور اس کے نیلگوں مائل سفید دھواں کے حلقوں کو دیکھنے لگا، مگر اسلم نے پھر اصرار سے جملہ پورا کرنے کو کہا، زرینہ بیگم نے ادھر ادھر

دیکھ کر کوئی ۲ فرلانگ کے فاصلہ پر ایک گولڈ مہر کے درخت کو دکھاتے ہوئے کہا "جب تک کہ آپ دوڑتے ہوئے اس درخت تک نہ جائیے اور وہاں سے میرے جوڑے کے لئے سرخ سرخ پھولوں۔ ایک گچھا نہ لائیے!"

شرط کٹھن تھی، اسلم صاحب کی ذرا سی بھینگی آنکھیں گولڈ مہر کے درخت کو دیکھنے میں کچھ اور آڑی ترچھی ہوگئیں مگر گانا سننے کا شوق کچھ اس طرح بھوت بن کر سوار تھا کہ یہ فوراً اٹھے اور بھاگتے ہوئے پھول لانے کو چلے، زرینہ بیگم کی ڈھٹائی اور بے رحمی ملاحظہ ہو، بیچارے جب کچھ دور چلے گئے تو انہوں نے اپنا منہ تھوتھا کر کے کہا۔ "ایڈیٹ، گانا سنے گا، یہ منہ اور مسور کی دال!" پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور کہنے لگیں "کیا کل حاضر خدمت ہوسکتی ہوں، یہی کوئی ۳ بجے سہ پہر کو!" میں نے کہا "شوق سے!" پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگیں "کیا اسلم صاحب کو بھی ساتھ لاؤں؟" میں نے کہا "دانشمندی تو یہی کہتی ہے، آدمی بھی مزیدار ہیں، دیکھئے بیچارے کس محنت سے درخت پر چڑھ کر آپ کے لئے پھول توڑ رہے ہیں!" زرینہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "یہ تو ان کا پیشہ ہے، مالی اگر درخت پر چڑھے تو کونسا احسان کرتا ہے اور کس پر؟"

ہم چپ ہوگئے، مجھے زرینہ بیگم کی یہ تیزاب جیسی پھبتی اچھی معلوم نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی کہنے لگیں "اُف دنیا بھی کیسی اداس جگہ ہے، جسے دیکھو اپنی فکر میں آپ گرفتار ہے، ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے؟" ملاحظہ ہوں زرینہ بیگم کے دو انتہائی پہلو، روشن اور تاریک، رنگین اور اداس، میں نے آج تک انکو اس لہجہ میں بات کرتے نہیں سنا تھا، کچھ حیران سا ہوا مگر اس میں کونسی نئی بات

تھی۔ ہر شخص کے دو روپ ہیں، ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ اس وقت شاید زرینہ بیگم نے اپنا چمکیلا لبادہ اتار کر پھینک دیا تھا اور اپنی روح کی عریاں گہرائی سے بات کر رہی تھیں مجھے خواہ مخواہ ایک چنچل چڑیا کو سوگوار دیکھ کر کچھ افسوس سا ہوا، میں نے اخلاص سے کہا "زرینہ صاحبہ، آپ شاید اس وقت تھک گئی ہیں جب ہی غمگین باتیں کر رہی ہیں، اٹھیئے ہم ذرا اس ٹھنڈے پانی کے جھرنے میں اپنا منہ دھو آئیں"۔ اب کے انہوں نے ایک آہ بھری اور کہا "اے کاش جھرنے کا ٹھنڈا پانی اس جلن کو مٹا سکتا"۔ "وہ جی کس جلن کو؟ جلن تو میرے پاؤں میں ہو رہی ہے یہ دیکھیے"۔ میں نے ان کو چھیڑنے اور بہلانے کے لئے یہ بھونڈا سا جملہ کہا مگر اس کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

اب اسلم صاحب پھولوں میں لدے پھندے آپہنچے تھے اور دور ہی سے چلا کر بولے "لیجیے، جناب، کتنے پھول لیجیے گا" یہ کہہ کر پھولوں کو زرینہ کی گود میں ڈال دیا اور پھر اپنے اصرار پر اتر آئے۔ زرینہ کو جب چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو نہایت غمگین آواز میں گانے لگیں ؎

بے خواب ہر بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

دل ماہئ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

اس غزل نے ایک بار پھر فضا میں سوگواری کی لہر دوڑا دی، درختوں کے پتے، چلتی ہوئی ہوا، ذرا جھیل میں ڈوبتا ہوا سورج سب کے سب مغموم ہو کر سرنگوں ہو گئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ زرینہ واقعی دل کی بیتابی کی وجہ جاننے کے لئے بیقرار ہیں، ہم دونوں نہ جانے کیوں بہت مغموم ہو گئے، اسلم بیچارے تو سچ مچ رونا چاہتے

تھے مگر شاید میرے خیال سے اندر ہی اندر گھٹ رہے تھے ، غزل گونا تمام چھوڑ کر زرینہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہتی ہوئی موٹر کی طرف چلیں "اب مجھ سے گایا نہ جائے گا، چلئے لوٹ چلیں" ہم نے جلد جلد سامان باندھا اور موٹر میں بیٹھ کر واپس چلے آئے۔

دوسرے دن صبح سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی ، ندی نالے بھر گئے ، ہر طرف جل تھل ہو گیا مگر آسمان تھا کہ آنکھ کھولنے کا نام ہی نہ لیتا تھا ، صبح سے بارہ بج گئے ، پھر ایک ، دو ، تین اور ساڑھے تین ، بارش تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ عنقریب طوفان نوح اٹھے گا ، اور سارے جہاں کو غرق کر دے گا ، کلارک نے چار بجائے ۔ میں نے کہا "زرینہ بیگم اب نہ آئیں گی" مگر ابھی میرا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں اسلم بیچارے چھتری لگائے زرینہ بیگم کے ساتھ چلے آرہے ہیں ، میں نے بڑھ کر اسلم سے کہا "بھئی غضب کرتے ہو ، اس بارش میں خود بھیگے اور زرینہ بیگم کو بھی تر کر دیا" وہ چھتری اور برساتی کوٹ کو باہر چھوڑتے ہوئے بولے "یہ مجھ سے نہ کہئے ، سمجھے ، یہ ان کا حکم تھا جو ماننا ہی پڑا" میں اس وقت زرینہ بیگم کے برساتی کوٹ کو اتارنے میں مدد دے رہا تھا ، اسلم صاحب کی بات سنکر ان سے کہنے لگا "زرینہ صاحبہ ، یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ ایسے وقت میں بھی آپ غریب خانہ پر تشریف لائیں ، اگر میں عرض کرونگا کہ یہ وقت تکلیف کرنے کا نہ تھا" وہ میری بات کا جواب دیئے بغیر اندر چلی آئیں اور پھر اسی کرسی پر بیٹھ گئیں ، جو پیانو کے قریب رکھی تھی ، ہم بھی آکر بیٹھ گئے ، میں نے ملازم سے گرم گرم چائے لانے کی فرمائش کی اور زرینہ کی طرف دیکھ کر ان کی مزاج

پرسی کی۔ کہنے لگیں "شکر ہے" اس شکر ہے میں وہ غم، طعن، مایوسی اور اداسی تھی کہ کم از کم اسلم صاحب اس کے اثر سے بے چین ہو کر کھنکارنے لگے اور اپنی انگلیوں سے اپنے گھنے بالوں میں کنگھی کرنے لگے، میں نے دل میں کہا "خدایا خیر، آج فتنہ کوئی نیا فتنہ پیدا کرنا چاہتا ہے!" اور بات کا پہلو بدلنے کے لئے کہا "آج کی جھڑی الاماں، بلائے آسمانی سے کم نہیں" میرا یہ جملہ مشکل سے تمام ہوا تھا کہ بجلی اتنے زور سے چمکی کہ ہماری آنکھیں خود بخود جھپک گئیں اور فوراً بعد وہ گڑگڑاہٹ کا شور بلند ہوا کہ در و دیوار ہل گئے، میز پر رکھی ہوئی ہر چیز جھنجھنانے لگی، کہیں قریب ہی بجلی گر گئی تھی۔

ادھر بجلی چمک کر گرجی اور ادھر زرینہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر کرسی پر ڈھیر ہو گئیں، ہم نے لپک کر ان کو اٹھایا اور صوفے پر لٹا کر ہوا دینے لگے، منہ پر ٹھنڈے پانی کی چھینٹیں ماریں، میں نے ان کی نبض دیکھی تو اچھی چل رہی تھی، دل کو اطمینان ہوا، اور ان کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا، کافی دیر بعد ان کو ہوش آیا تو اٹھنا چاہا، میں نے کہا "ابھی آپ نہ اٹھئے، آرام سے لیٹی رہیئے" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں، میں نے پھر ان کی نبض دیکھی، ٹھیک تھی، مگر بہت کمزور، چائے آ گئی اور میں نے گرم گرم چائے کی پیالی اصرار سے ان کو پلائی، چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ بیٹھیں اور ہم اپنی گفتگو میں پھر مشغول ہو گئے۔

میں نے اسلم سے پوچھا "کہئے آپ کا کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ آپ نے تو بہت کارآمد چیزیں چنی ہیں، جو امید ہے کثرت سے فروخت ہوں گی۔ انڈے بھی

روز ملنے چاہئیں اور پھولوں کے لئے کلکتہ بہت بڑی منڈی ہے۔" اسلم صاحب نے جواب دینے میں دیر لگائی اور کچھ ہاں ہوں کر کے ٹال گئے۔ میرا جہاں تک خیال ہے ان کو اپنے کام سے دلچسپی نہیں، یہ محض خان بہادر صاحب کی وجہ سے یہ ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں، ان کا بس چلے تو شاید آج ہی کاروبار بند کر کے لکھنؤ کی طرح گھر بیٹھ رہیں اور بزرگوں کی گاڑھی کمائی کو چشم زدن میں پھونک ڈالیں میں نے دیکھا کہ یہ مرغی کے انڈے اور گلاب کے پھول کی بات زیادہ دلچسپ ثابت نہیں ہو رہی ہے اس لئے چپ ہو گیا

زرینہ بیگم نے کہا "امی مجھے لکھنؤ چلنے کو کہہ رہی ہیں مگر میرا جی وہاں الجھتا ہے میں رانچی واپس چلی جاؤں گی۔" اسلم صاحب نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ضرور، انسان کا جہاں جی چاہے رہیں رہنا چاہئے ورنہ جینا وبال ہو جاتا ہے سمجھیں۔" میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے۔" زرینہ نے مجھ سے پوچھا "آپ کب رانچی واپس جا رہے ہیں؟" میں نے واپسی کی کوئی تاریخ مقرر نہ کی تھی اس لئے ان کے اس سوال کا جواب نہ دے سکا،

زرینہ بیگم کی اداسی اور ہلکی سی نقاہت کی وجہ سے ہماری یہ صحبت کچھ پھیکی رہی کچھ دیر بعد یہ اٹھے اور اسی طرح مسلا و ہمارا پارٹنر میں واپس چلے گئے

اس ملاقات کے چوتھے دن وہ پھر آئیں اور پوچھا "شیلا کا کوئی خط آیا ہے؟" میں نے کہا "ہاں" پوچھا "کیا لکھا ہے؟" میں نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں بس معمولی خیر صلاح ہے۔" اس دن اسلم صاحب آئے ضرور تھے مگر فوراً چلے گئے۔ ان کا کوئی کلکتہ کا ایجنٹ انڈے خریدنے آیا تھا۔ زرینہ بیگم کو

تنہائی میں باتیں کرنے کا اچھا موقع ملا۔ کہنے لگیں "کچھ پوچھوں، برا تو نہ مانیے گا"
میں نے ہنس کر جواب دیا "نہیں برا کیوں ماننے لگا ہوں" میرے اس جواب کو
سن کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئیں پھر احتیاطاً چاروں طرف دیکھ کر کہا "کیا
آپ نیلو سے محبت کرتے ہیں؟" میں اس سوال پر چونک پڑا، ظالم نے دکھتی رگ
پکڑ لی تھی مگر جواب دینا ضرور تھا، میں نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے؟" میرا سوال
بھی ان کے لئے شاید اتنا ہی بیڈھب ہو گیا مگر فوراً سنبھل گئیں اور کہا "میں
کسی کے دل کی بات کیا جانوں؟" میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا "نہیں" اور
ان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کہنے والی تھیں کہ میں نے پھر "ہاں"
کہہ دیا۔ میری اس نہیں پر وہ کچھ مسکرائیں اور کہا "ڈاکٹر صاحب، آپ مجھ سے
مذاق تو نہ کیجئے، میں آپ کی بھلائی کے لئے یہ پوچھ رہی تھی کہ اگر آپ کو ان سے
محبت ہے تو شاید آپ نے تھوڑی سی غلطی کی ہے۔" اب میں نے دیکھا کہ اس
موضوع کو یوں ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ اور اس بحث کو تمام کرنا پڑے گا۔ میں نے
پوچھا "وہ کیسے؟" کہنے لگیں "آپ شاید نیلو کے مزاج سے واقف نہیں، وہ
حد درجہ شرمیلی اور اپنے والدین کے قبضہ میں ہیں۔ اگر ان کے والدین کسی اور جگہ
سے ان کا دامن باندھ دیں گے تو وہ اسی کی ہو کر رہ جائیں گی۔ میں نے بے چینی
سے قطع کلام کرنے کے لئے کہا "یہ مجھے معلوم ہے۔"

آفتاب غروب ہونے کے لئے پچھم طرف کی پہاڑیوں کے پیچھے اترنے لگا تھا
اس کی سنہری روشنی پہاڑیوں کی چوٹی کو زرنگار بنا رہی تھی، فضا میں برسات
نے ہلکی سی خنکی اور تازگی پیدا کر دی تھی اور ہم باہر احاطہ کے باغ میں ٹہل ٹہل کر

باتیں کر رہے تھے۔ زرینہ بیگم گہرے سبز رنگ کی ساڑی باندھے ہوئے تھیں اور اسی رنگ کے سینڈل ان کے پاؤں میں تھے جن کے سبز تسمے ان کے گورے گورے پاؤں پر پڑے بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے وہ بولیں "دیکھئے غلط فہمی کی شرط نہیں میں آپ کی صرف خیر خواہ ہوں مگر نیلو کی خاص سہیلی۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ محمود صاحب نے ان کی والدہ کے پاس نیلو کے لئے اپنا پیغام بھیجا ہے اور یہ بات غالباً اُن کے حسب خواہ طے پائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر آپ کیا کریں گے؟" میں نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا۔ "اس میں کیا ہرج ہے، وہ کسی کی ہو جائیں، میرا بھی اللہ مالک ہے اور سچ پوچھئے تو اب تک میں نے کبھی اپنے دل کے اندر اتنی بلند آرزو کی پرورش بھی نہیں کی، زرینہ صاحبہ، بہت ہوا چھوڑئیے ان باتوں کو" مگر وہ تو جیسے قسم کھا کر آئی تھیں کہنے لگیں "یہ بات ایسی نہیں کہ ٹال دی جائے، بدقسمتی سے اس دن نیلو نے آپ کو اور دردانہ بیگم کو خوب گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ بہت برہم ہوئیں اور کہنے لگیں میں نے ہرگز ان کو ایسا آدمی نہ جانا تھا"۔

آج پھر دو ماہ بعد اس نامراد واقعہ کی یاد دلائی گئی۔ میں اندر ہی اندر سلگنے لگا۔ اس وقت میرا جی یہی چاہتا تھا کہ کاش دردانہ بیگم اس وقت میرے سامنے ہوتیں تو میں ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا اور کہتا "اے غارت گر صبر و شکیب، یہ تجھے کیا سوجھی تھی کہ تو نے صرف آدھ گھنٹے کے اندر میرے نام پر سیاہ روشنائی کی ایسی مہر چپکا دی کہ دھوئے نہیں دھلتی ہے، اس کا بدلہ میں تجھ سے حشر کے دن اس قوت کے سامنے لوں گا جو تنہا میری معصومیت کی گواہ ہے"۔ میں پیچ و تاب کھا رہا تھا مگر کہہ ہی کیا

سکتا تھا۔ پھر وہ دلشیں برجانت دروش ۔زرینہ بیگم میرے جواب کے لئے میری طرف دیکھ رہی تھیں، میں نے کہا یہ اب کیا کیا جائے ، میں نے جان بوجھ کر ایسی حرکت نہیں کی تھی کہ جس کو دیکھ کر نیلو فر صاحبہ کو رنج ہوا، یہ تو محض ایک اتفاقی امر تھا جس کا مجھے بھی از حد افسوس ہے، مگر اب پچھتائے کیا ہوتا ہے، صبر کرنا پڑیگا۔"

زرینہ بیگم یہ سنکر مسکرائیں، اس دفعہ ان کی مسکراہٹ ہنسی کے پہلے درجہ تک پہنچ گئی تھی جس میں ان کے موتی جیسے سفید دانتوں کی جگمگاہٹ لبوں کے باہر نکلی جاتی تھی۔ کہنے لگیں "اس دن مجھے آپ کی دردانہ بیگم کے ساتھ حد درجہ کی بے تکلفی دیکھ کر بڑا تعجب آیا۔ مگر خیر، ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ اسی کو شاعر حرکت غیر اختیاری کہتے ہیں۔ اب دیر ہو گئی مجھے اجازت دیجئے۔" یہ کہہ کر زرینہ بیگم چلنے لگیں، موٹر میں بیٹھنے سے پہلے کہا "مجھے نیلو کی سخت گیری سے ہمدردی نہیں، وہ اس دن سے آپ سے خفا ہیں اور آپ کے متعلق ان کا خیال بہت کچھ بدل گیا ہے، میں آپ کو آگاہ کئے دیتی ہوں، کہ اگر آج کل میں آپ ان کی منگنی کی خبر سنیں تو زیادہ غم نہ کیجئے گا۔ خدا حافظ۔"

زرینہ بیگم نے مجھے آنے والے خطرے سے آگاہ کر کے، آپ کا کیا خیال ہے کہ مجھے مدافعتی تدابیر کے لئے سینہ سپر کر دیا؟ جی نہیں بلکہ مجھے قبل از وقت مار ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، کل کا مرتا میں آج ہی مرنے لگا، ان کے جانے کے بعد سے رات کے ایک بجے تک جو عالم مجھ پر گذرا ہے وہ جانکنی سے کم نہ تھا بلکہ یوں کہئے اس وقت سے لیکر اب تک یہ عالم نزع مجھ پر طاری ہے، ہر گھڑی دھڑکا سا لگا ہے، ڈاکیہ کی صورت سے وحشت ہونے لگی ہے اور اکثر جی چاہتا ہے کہ کہیں ایسی گمنام جگہ میں بھاگ

جاؤں جہاں اپنی یہ خودی تک بھول جاؤں اور میرے یہ تمام احساسات جو اس شدت سے جاگ اٹھے ہیں وہ اٹوٹ نیند سو جائیں۔

نیلو صاحبہ، یہ خطاب اپنی حد سے گذر کر افسانہ بن گیا، میں بھی اسے لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں۔ آیئے اسے یہاں ختم کر دیں اگر اتنا سننے کے بعد بھی آپ کا جی نہ بھرے تو پھر مجھے حکم دیجئے، میں زرینہ بیگم کی ملاقاتوں کا باقی حال دوسرے خط میں لکھ بھیجوں گا۔ وہ دیکھئے، پھر پورب سے گھٹا اٹھی، بادلوں میں گرجنے کا شور دمبدم آنے لگا۔ جب موسم یوں عالم خمار میں ہو تو پھر میرا لکھنے پڑھنے میں جی نہیں لگتا بلکہ شیخ چلی کی طرح طلسماتی دنیا کی سیر کرنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دیجئے، آداب عرض۔

(دور افتادہ)

---

(۱۸)

بدھو پور

۳۰ اگست ۳۶ء

مہربان نیلوفر صاحبہ! خوش رہیئے۔

اگر آپ کے خط میں شدید تقاضا نہ ہوتا کہ جیسے ہی میرا خط ملے فوراً جواب لکھئے تو کم از کم میں آج اپنا قلم نہ اٹھاتا، آج سے گیارہ سال پیشتر، ٹھیک اسی وقت یعنی دس بجے دن کو اس شہر میں جہاں ان دنوں آپ براجمان ہیں، میری مسمیہ سے عزیزہ ہستی نے مجھے یک بیک خدا کے حوالے کر دیا اور آپ خود وہاں چلی گئیں جہاں سے پھر کوئی نہیں لوٹتا۔ میں اسی کل کا ایک جزو ہوں، میرا جسم، میری روح، الغرض میری

سب چیزیں ان کے خون سے پرورش پائی ہوئی ہیں۔ ان کا مرجانا میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے اور اس حادثہ کے غم کو آج کے دن خموش رہ کر امد روکر تازہ کرتا ہوں کیا ماں سے بڑی کوئی نعمت ہے اور کیا اس نعمت کے کھو جانے کے بعد اس کا کوئی نعم البدل ہو سکتا ہے؟

آپ نے اپنے خط میں مجھے پھر لالچ دیا ہے۔ محترمہ! میں ایک بار عرض کر چکا ہوں کہ میں لالچی نہیں، میں نیکی کسی جنت کے لالچ میں نہیں کرتا بلکہ بقول غالب میں ایسی جنت کو دوزخ میں ڈالنے کو تیار ہوں، جو مے وانگبیں کے لالچ میں حاصل کی گئی ہو، آپ مجھ سے تفصیل پوچھتی ہیں اور ساتھ ہی تقاضا کرتی ہیں کہ جلد لکھ بھیجئے، تفصیل اور جلدی کا آپس میں ازلی بیر ہے۔ لیجئے کوشش کرتا ہوں کہ یہ دونوں شرطیں پوری کی جائیں۔

اس دن کے بعد، شاید تیسرا یا چوتھا روز تھا کہ اسلم صاحب، گھبرائے ہوئے آئے اور کہنے لگے "رات سے زارو کو بخار ہو گیا ہے، ان کی والدہ بہت گھبرائی ہوئی ہیں اور ان کے والد صاحب کو کلکتہ سے بلانے کے لئے تار بھیجا ہے ریجھے!" اس وقت صبح کے ۹ بجے تھے، میں تازہ نگار کے پرچے میں ایک دلچسپ مگر بھدی سی دلیل پڑھ رہا تھا جو ایک مولوی صاحب نے میرے مضمون "حیات بعد الموت" کو پڑھ کر اس کے علمی حقائق کے خلاف پیش کی تھی۔ میں نے اسلم صاحب سے پوچھا "و کیا بخار زیادہ ہے" کھڑے کھڑے اپنے ہاتھوں کو ہوا میں اچھال کر بولے "اوہ، بہت، اٹھیئے، جلد چلیئے، آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

میں جس وقت ان کے ہاں پہنچا خان بہادر صاحب کے "رحمان" کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی، میں سیدھا زنانخانہ میں داخل ہوا، کچھ مستورات جو مجھ سے

پردہ گرتی تھیں وہ ہٹ گئیں، دیکھا زوبینہ بیگم ایک شاندار چھپرکھٹ پر فیروزے رنگ کی ریشمی چادر اوڑھے لیٹی ہیں، ان کے گھنے سیاہ رنگ کے بال بے ترتیبی سے ان کے تکیے پر پڑے ہیں، چہرہ بخار کی تکلیف سے ماند پڑ گیا ہے اور رنگین لبوں پر بخار کی تمازت سے ہلکی سی خشکی پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر آنکھوں سے مسکرائیں اور آداب کہا، میں وہیں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا، نبض دیکھی اور نسخہ تجویز کیا۔ ملیریا بخار تھا جو دو دن کے اندر جاتا رہے گا، میں کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا۔

شام کو پھر گیا، ان کے والد صاحب بھی آ گئے تھے، کلکتہ میں کارپوریشن کے کسی محکمہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں اور معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور آخر میں بڑی تشویش سے کہا، "ڈاکٹر صاحب، آپ کا کیا خیال ہے، زارو کل تک اچھی ہو جائے گی؟" میں نے ان کو یقین دلایا کہ انشاءاللہ کل صبح تک بخار ضرور اتر جائے گا، سگریٹ کی ڈبیہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "آپ کو معلوم ہے، میری یہی ایک بچی ہے جو ہمارے لئے دنیا میں سب کچھ ہے، ہم نے اس کی موجودگی میں کوئی بیٹا نہ ہونے کا کبھی غم نہ کیا اور خدا نے ہمیں جو کچھ دے رکھا ہے وہ سب کچھ اس کے لئے ہے۔" گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے محبت کرنے والے دیگر باپوں کی طرح بولتے رہے "ہم سے جو کچھ ہو سکا ہم نے اس کی تعلیم پر خرچ کیا، پہلے کلکتہ اور علیگڑھ میں تعلیم دلوائی اور اب بی۔ اے کے لئے لکھنؤ بھیجنے کا ارادہ ہے مگر اس کی صحت کی طرف سے مجھے اطمینان نہیں، یہ اچھی ہو جائے تو کوئی ایسا ٹانک تجویز کیجئے کہ اس کی صحت سنبھل جائے۔ لڑکی ماشاءاللہ بہت تیز اور نہایت ہشیار ہے، اس نے سکول اور کالج میں اتنے سارے انعامات حاصل کئے ہیں کہ

ان سے ہمارا ڈرائنگ روم بھر گیا ہے۔ بیڈمنٹن، ٹینس، گانا، سینا، پرونا، الغرض بہت سی چیزوں میں اسے تمغے ملے ہیں۔" اب میں بے چینی سے پہلو بدلنے لگا تھا اور دعا کر رہا تھا کہ کوئی اندر سے بلانے آئے تو گلو خلاصی ہو۔

مگر گلو خلاصی ایک خوش گوار خواب کی طرح دور دور رہی اور ان کے والد صاحب نے اچھی طرح اپنی دختر نیک اختر کی تعریفوں سے گویا مجھے حلق تک بھر دیا۔ ان کے آخری جملے سننے کے قابل تھے "اب مجھے فکر ہے کہ اس کی شادی کسی اچھے لڑکے سے ہو جائے جو برسرِ روزگار ہو۔ میں نے زآرو کو انتخاب کا پورا حق دے دیا ہے۔ وہ مجھ سے جہاں کہے گی میں اس کی شادی کر دوں گا۔ یوں تو باتیں اکثر جگہ سے آرہی ہیں مگر میں چپ ہوں اور خود زآرو بھی خموش ہے، اسے کچھ شاید پسند نہیں ڈاکٹر صاحب، آپ بھی اس خیال میں رہیے گا، اگر آپ کے کوئی ساتھی یا دوست آپ کی نظر میں ہوں تو مجھ سے کہیے گا، میں تمام پیشوں پر ڈاکٹری کو ترجیح دیتا ہوں۔" میں نے سعادت مندانہ لہجہ میں "جی اچھا" کہا۔ اور اپنے خیال میں ہنسنے لگا کہ جناب کو شاید خبر نہیں کہ میرے ساتھیوں میں وہ دو بیٹے بھی ہیں جو اب تک طالب العلم ہیں اور شاید بڑی خوشی سے ان کی فرزندی میں آنا قبول کریں گے۔

زرینہ بیگم کا بخار کم ہو چلا تھا، شام کو جب میں انہیں دیکھنے گیا تو مسکرا رہی تھیں اور چادر کے اندر ان کا جسم شوخیوں سے پھر آہستہ آہستہ تھرکنے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ اب آپ اچھی ہو رہی ہیں اور کل تک بالکل اچھی ہو جائیں گی۔" زرینہ نے غمگین لہجہ میں ذرا آہستہ سے کہا جو صرف میں ہی سن سکوں "مگر مجھے نہیں ہے۔" یہ وقت بحث کرنے کا نہ تھا۔ وہاں ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ یہ جلد سے جلد اچھی ہو جائیں مگر

یہ خود کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ میں بولتا تو کیا بولتا اور کس منھ سے کس کو یہ بات سناتا؟

دوسرے دن صبح جب میں گیا تو زرینہ بالکل تندرست ہو گئی تھیں، پلنگ سے اتر کر آرام کرسی پر بیٹھی تھیں اور پاس ہی ان کی والدہ بیٹھی تھیں، اسلم صاحب کبھی اندر کبھی باہر آجا رہے تھے اور مریضہ کے لئے ہر دوا اور پرہیز کا سامان مہیا کرنے میں ضرورت سے زیادہ چستی دکھا رہے تھے۔ میں نے جب یہ کہا کہ زرینہ بیگم اب بالکل اچھی ہو گئی ہیں تو ان کی والدہ کی باچھیں کھل گئیں، بہت خوش ہوئیں اور مجھے دعائیں دے کر اپنی گفتگو کا سلسلہ جو جاری کیا تو گھنٹے سے اوپر ہو گیا، وہی پرانی باتیں، زرینہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے اور آخر میں ان کے لئے ایک اچھے سے بر کی تلاش اور یہ کہ ایک ڈاکٹر کو وہ سب پر ترجیح دیں گی، زرینہ اپنی ماں کے گفتگو کے آغاز کے تھوڑی دیر بعد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں، کمرہ میں میں اور ان کے والدین تھے۔

آخر خدا خدا کر کے ۱۲ بجے دن کو مجھے ان کے ہاں سے نجات ملی اور بھاگ کر سیدھا گھر پہنچا، جہاں کافی دیر تک سر میں درد رہا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد میں کمپنی کے میدان میں شام کو چہل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا زرینہ بیگم ایک سانولی رنگ کی عیسائی لڑکی کے ساتھ مصروف خرام ہیں، میں نے چاہا کہ دور سے نکل جاؤں مگر ان کی نگاہ پڑ گئی اور پکارنے لگیں۔ جانا پڑا۔ اپنے ملنے والی سے تعارف کرایا "مس مینی داس گپتا، ایم۔ اے، پروفیسر داس گپتا کی بہن"۔ میں ان سے مل کر خوش ہوا، اس لئے کہ ان کے بھائی صاحب تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آئے ہوئے تھے اور میرے منگلے کے بہت قریب ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر ہم ایک بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، شام ہو گئی تھی اور بارش

کا سامان ہو رہا تھا، اس لئے ہم اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

نیبنی داس گپتا نے فلسفہ میں ایم۔اے پاس کیا ہے، دبلی پتلی سانولی سی چھریرے جسم کی کوئی ۲۵ سال لڑکی ہیں، آنکھیں نہایت حسین، سیاہ اور خوب روشن ہیں، ان کے پتلے نقوش والے چہرہ پر ان کی آنکھیں بڑی جاذب اور جاندار معلوم ہوتی ہیں ان سے باتیں کرنے والا ان کی آنکھوں کی کشش سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور جب تک بات کرتا رہتا ہے ٹکٹکی باندھے ان کی آنکھوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ یہ گاتی بہت اچھا ہیں مگر صرف بنگلے گانے اور وہ بھی ربی بابو یا نذرالاسلام کے رومانی اور انقلابی گیت، جن کو میں کچھ نہیں سمجھتا۔

پہلی ملاقات کے بعد مس داس گپتا روزانہ شام کو اور کبھی کبھی صبح کو بھی تشریف لانے لگیں۔ ان کے بھائی اعصابی مریض ہیں، تنہائی پسند اور بہت چڑچڑے اس لئے میں ان سے ملنے صرف وہاں گیا۔ مس گپتا کو فلسفہ پڑھنے اور سمجھنے کا نہ صرف شوق ہے بلکہ خبط ہے۔ ان کی نظر سے شاید ہی کسی مشہور فلسفی کی کوئی کتاب نہ گذری ہو ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سب فلسفیوں کے خیالات سے واقف ہیں۔ ان میں ایک ادراکی بات ہے اور وہ شاید ان کے عورت ہونے کی وجہ سے ہے کہ جس فلسفی کی کتاب ان کے زیر مطالعہ ہوتی ہے یہ اس کی ہم نوا ہو کر اپنے خیالات کو اسی سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ چنانچہ اگر آج افلاطون کے رنگ میں ہیں تو کل دیوجانس کلبی کے جبیں میں۔ آج ہیگن اچھا معلوم ہو رہا ہے تو کل شوپنہار العرض جیسی کتاب ہاتھ میں ہے ویسے ہی خیالات دماغ میں بھرے رہتے ہیں۔

مگر ان تمام فلسفیوں کی بکواس میں جہاں ذات کا رنگ ہوتا رہتا ہے وہاں

ان پر ایک رنگ نہایت پختہ چڑھا ہے وہ یہ کہ اپنے بھائی کی طرح جنم بھر کے لئے کنوارا رہنے کا عہد کر لیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہاں اپنے ان فلسفیوں کی تقلید کیوں نہیں کرتیں جنہوں نے شادیاں کر لی تھیں اور اپنے بعد بہت سی اولادیں چھوڑ گئے تھے۔ خیر مجھے اس سے بحث کیا۔ وہ میرے پاس آ کر اکثر اس بات پر بحث کرتیں کہ اسلام میں فلسفہ نہیں، یہاں دماغ کو عقل رسا سے خالی رکھنے کے لئے ہر طرح کی سختی سے کام لیا گیا ہے، ڈرایا گیا ہے، اور مرنے کے بعد سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں چونکہ اسلام میں فلسفہ کی کیا حیثیت تھی اور ہے اس سے واقف نہ تھا، اس لئے ایسی بحث میں زیادہ تر چپ رہتا تھا، ایک دفعہ میں نے کہا "مگر ابن رشد تو مسلمان تھا، کیا اس نے فلسفہ کی دنیا میں ہلچل نہ ڈال دی تھی؟"

مس گپتا یہ سنکر مسکرانے لگیں، بالکل فلسفیوں کی طرح، طنز موالی مسکراہٹ، اور کہنے لگیں "ابن رشد بیچارہ مسلمان ہوتا تو اسے قرطبہ کی جامع مسجد سے کیوں نکال باہر کرتے اور شہر بدر کر کے اس کی مٹی پلید کرتے اور وہ فلسفی تھا مگر صرف ۱/۲ اور وہ بھی قرون وسطیٰ کا جب انسانی خیالات وحشت کے غاروں میں پڑے تھے اب اس کی بات کو کوئی نہیں مانتا۔" مس گپتا کی یہ باتیں سنکر میں چپ ہو گیا، ان سے اس معاملہ میں مزید گفتگو کرنا اپنی حماقت تھی جب انہوں نے دیکھا کہ میں ان کی فلسفیانہ گفتگو میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا تو وہ مجھ سے ڈاکٹری معاملوں اور انسانی دماغ کی ساخت پر مزید ار باتیں کرنے لگیں۔

یہاں ایک بات عرض کئے بغیر آگے نہ بڑھوں گا۔ مس گپتا کی تعلیم اور علمی قابلیت کو دیکھئے اور ان کی روزانہ زندگی کو ملاحظہ فرمائیے۔ علی الصباح اٹھتی ہیں، گھر کا سارا

کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرتی ہیں، بھائی کی خدمت اور ان کی عجیب عجیب فرمائشوں کو پوری کرتی ہیں۔ مثلاً ایک دن پروفیسر گپتا نے ان سے کہا کہ مجھے گن کر بتاؤ کہ آج کے اسٹیٹس مین اخبار میں کتنے الفاظ ہیں، بیچاری صبح سے شام تک بیٹھ کر الفاظ گنتی رہیں۔ شام کو بلاناغہ آفتاب غروب ہونے کے آدھ گھنٹہ بعد سے بھائی کو گانے سناتی ہیں۔ بھائی صاحب کتاب لئے مصروف مطالعہ رہتے ہیں، مگر یہ غریب کی ڈیوٹی ہے کہ ہارمونیم اور کبھی سرمہار لے کر گاتی رہیں اور اس وقت تک گاتی رہیں

جب تک کہ وہ "بس ہوں" نہ کردیں۔ مس گپتا نے کہا کہ ایک رات دو بج گئے مگر بھائی صاحب نے "بس ہوں" نہ کیا۔ یہ گاتے گاتے تھک کر بیہوش سی ہو گئیں تو وہ چونکے اور کہنے لگے "پیارے تم اب تک گا رہی ہو، میں "بس ہوں" کرنا بھول گیا تھا"۔ اللہ اللہ یہ محبت اور یہ خدمت! وہ کون بہن ہے جو بھائی کے لئے اپنی ساری زندگی خدمت میں گذارے گی اور کبھی اپنی زبان سے اف نہ کرے گی؟

میں نے آج تک مس گپتا کو سوائے معمولی سفید ساری کے دوسرے لباس میں نہیں دیکھا، پاؤں میں بہت کفایت قسم کی چپل اور کلائیوں میں ڈو ڈو کانچ کی چوڑیاں، بس یہی ان کا لباس ہے، اتوار کے دن بھی میں نے ان کو اسی لباس میں دیکھا۔ نیلوفر صاحبہ کی مس گپتا میں ان لڑکیوں کے لئے ہوس عبرت نہیں جو سیکڑوں روپے کی ساریاں باندھتی ہیں اور خوشبو، زیورات، غازہ، لپ اسٹک وغیرہ پر روپیہ پانی کی طرح بہاتی ہیں اتنے ٹیم ٹام کے بعد بھی کھوپڑی میں دیکھئے تو بھس بھرا ہوا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ آفتاب چلتا ہے یا دنیا گھومتی ہے؟ ہر گھڑی اپنے رومانی خیالوں میں ڈوبی رہتی ہیں اور یہ کبھی نہیں سوچتیں کہ والدین کس مصیبت یا پریشانی سے ان کے اخراجات پورے کر رہے

ہیں۔ اور معاف کرنا، میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جو لڑکی جتنا بناؤ سنگار کرتی ہے اور اپنے آپ کو بہت حسین اور بہت بلند سمجھتی ہے وہی اپنی زندگی میں دھوکے کھاتی ہے، اسی کو بیوقوف بنایا جاتا ہے اور آخر میں تمام عمر پچھتانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مس گپتا میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک برائی بھی ہے۔ یہ مجھ سے ملتی ہیں، گھنٹوں باتیں کرتی ہیں، ہنستی ہیں اور کبھی کبھی گانے بھی سنا دیتی ہیں، مگر آج بھی مجھ سے یہ اتنی ہی دور ہیں جتنی کہ پہلی ملاقات میں تھیں، یا دہی النظر میں جیسا کہ زرینہ بیگم کو کئی بار دھوکا ہوا، ہم بالکل شیر و شکر کی طرح گھل مل کر باتیں کرتے ہیں مگر یہ میرا دل جانتا ہے کہ وہ مجھ سے بہت دور ہیں، جیسے زمین کے رہنے والوں کے لئے آسمان کے تارے، میں نے محض دیکھنے کے لئے کئی بار گفتگو کے رخ کو اس طرح بدلا کہ اس کی گرمی ان کو محسوس ہو مگر ہر بار اس گرمی سے میں پسینے پسینے ہو گیا مگر وہ خدا کی بندی میرا بائی کی طرح ہاتھ میں سمرن لئے اور آنکھیں بند کئے گاتی رہیں "میرے تو گر دھر گوپال....." میرا بائی کے گردھر گوپال کو ساری دنیا جانتی ہے مگر مس گپتا کے مدن موہن کون ہیں۔ اس کا آجتک پتہ نہ چلا!

یہ دنیا میں رہ کر ساری دنیا سے دور اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی اور میں نے بارہا کوشش کی کہ کسی طرح اس کی زندگی کے اس قلعہ کی ایک جھلک دیکھوں جو اس نے اپنے لئے بنا رکھا ہے اور طوفان و باراں کو اپنے گرد جمع ہوتے دیکھ کر بھاگتی ہے اور اسی قلعہ میں پناہ لیتی ہے۔ میں نے اس قلعہ کی اونچی اونچی فصیلوں پر چڑھنے کے لئے ہر طرح کی سیڑھیاں لگائیں، کمند پھینکے مگر سب بے کار، یہ حد درجہ ہوشیار سپہ سالار کی طرح اپنے قلعہ کو حملہ سے محفوظ رکھے رہی، یہ میرے اس وقت کے

خیالات تھے جب میں ان سے زیادہ واقف نہ تھا مگر اب یہ میرے توہمات فنا ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ یقین کی ٹھوس بنیاد لے رہی ہے۔ مس گپتا شاید دنیا کی سب سے زیادہ معصوم اور سب سے زیادہ تنہا لڑکی ہیں، ان کے متعلق میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں اور کچھ بھی نہیں۔

زرینہ بیگم اس کے بعد غریب خانہ پر کئی بار تشریف لائیں۔ اتفاق کی بات جب جب وہ آئیں مس گپتا کو میرے ہاں بیٹھا پایا۔

ایک دو بار کچھ دیر تک زرینہ بیگم اور اسلم صاحب بیٹھے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ ایک دن زرینہ بیگم نے کہا "اب آپ کے ہاں آنا فضول ہے" میں نے ہزار پوچھا کیوں مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چلی گئیں، ان کے شاید اس جملہ سے یا ایک عورت دوسرے کے قلب کو زیادہ اچھی طرح جان سکتی ہے، خیر وجہ کچھ بھی ہو، مگر مس گپتا نے اس دن کے بعد سے اپنا یہ اصول بنا لیا کہ ادھر زرینہ بیگم آئیں اور یہ چلیں۔ مجھے عورتوں کی ایک عادت پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد دوست بن جاتی ہیں اور ان کو دشمن بننے میں بھی دیر نہیں لگتی، کہاں زرینہ بیگم مس گپتا کے نام پر مٹی جا رہی تھیں اور اسکول کی پُر لطف باتوں کو یاد کر کے خوب ہنستی تھیں اور کہاں یک بیک ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھیں۔

ایک دن جب مس گپتا اٹھ کر چلی گئیں تو زرینہ بیگم نے نہایت بدمزگی سے منھ بنا کر کہا "یہ کل موہی دیکھتی ہوں ہر وقت آپ کے پاس رہنے لگی" میں بھی اس وقت نہ جانے کیوں چڑچڑا سا ہو رہا تھا، مجھے ان کا یہ طریقہ گفتگو پسند نہ آیا، جل کر کہہ دیا "زرینہ صاحبہ، معاف کیجئے، آپ کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ کسی کو ایسے بھونڈے طریقہ سے یاد

کریں "زرینہ بیگم بہت زود رنج اور ضدی ہیں۔ برابر مس گیتا کو برا بھلا کہتی گئیں، میں خاموش رہا، ایسے موقع پر سوائے خاموشی کے اور کیا چارہ تھا۔ جب ان کا غصہ کچھ مدھم ہوا تو میں نے کہا "آپ ناحق اس بھگتن سے خفا ہوتی ہیں وہ بیچاری تو آپ اپنے فلسفیانہ خیالات میں ایسی کھوئی ہوئی ہے کہ اس کو ان رنگین باتوں کی خبر تک نہیں" زرینہ بیگم کا غصہ پھر پلٹ پڑا۔ چمک کر کہنے لگیں "بس کیجئے بس، میں خوب جانتی ہوں ان بھگتنیوں کو، جو بے کھاگر ابے حج کو چلی ہیں" اب واقعی مجھے غصہ آگیا تھا اس لئے خاموش رہا اور اس وقت تک جب تک کہ زرینہ بیگم نے خود موضوع گفتگو بدل نہ دیا۔

خط پھر لمبا ہو گیا، آپ کی سہیلی کا ذکر جمیل حد درجہ دلچسپ ہونے کے سبب سے خواہ مخواہ دراز تر ہو جاتا ہے۔ اب معافی چاہتا ہوں، بقیہ واقعات آئندہ خط میں لکھ بھیجوں گا۔ آپ جن مزیدار باتوں کا مجھے لالچ دلا رہی ہیں کیا ابھی ان کے لکھ بھیجنے کا وقت نہیں آیا؟ مجھے لالچ دے کر میرے صبر وشکر کی عادت بگاڑنا چاہتی ہیں، شام ہو گئی ہے، ڈاک کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ خدا حافظ وناصر۔ (خیریت کا طالب)

---

(۱۹)

مدھو پور

۸ ستمبر ۳۶ء

مائی ڈیر نیلوفر صاحبہ! خوش رہیئے

اب دیکھئے، غلط فہمی کی شرط نہیں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا اور پورا حال بالتفصیل لکھنے کو کہا اس لئے بغیر کسی مبالغہ کے میں نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو میرے دل میں تھا۔

البتہ رنگین بیانی کی خاطر کہیں کہیں میں نے کچھ ایسی تصویریں کھینچ دی تھیں جو ممکن ہے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیں مگر میں نے اس کا وعدہ آپ سے لے لیا تھا کہ آپ ایسا نہ کریں گی۔ میں آپ کو ان عام لڑکیوں کی سطح سے بہت بلند سمجھتا ہوں اس لئے خدارا آپ کچھ ایسا نہ سمجھئے جو عام لڑکیاں محض اپنی جہالت کے سبب سے سمجھ بیٹھتی ہیں۔ اور اگر آپ ایسا کریں گی تو یہ لیجئے میں خط ختم کرتا ہوں۔ خدا حافظ (آزردہ قسمت)

---

(۲۰)

مدھوپور

۶ استمبر ۳۶ء

آداب

اچھی نیلوفر صاحبہ!

آپ نے دیکھ لیا کہ کبھی کبھی میں بھی روٹھ سکتا ہوں۔ میں کم از کم آپ کے سامنے اپنا ظاہر و باطن آئینہ کی طرح روشن رکھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ دیکھ لیں کہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں جو واقعات کو صحیح صحیح بیان کرنے میں ہچکچاؤں اور آپ پوچھیں "وہ کہاں گئے تھے؟" "وہ کہیں نہیں!" "وہ کیا کر رہے تھے؟" "وہ کچھ بھی نہیں!" "وہ چپ کیوں ہیں!" "وہ کہاں چپ ہوں؟" وغیرہ

میں اب بھی کہہ رہا ہوں اور ہمیشہ کہتا رہوں گا کہ زرینہ بیگم یا مس گپتا سے میں ملتا رہا ہوں اور کبھی کبھی ان سے شگفتہ بیانیوں پر بھی اتر آیا ہوں مگر اس سے کچھ زیادہ کیا ہو یا کبھی بھولے سے بھی میری نیت ڈگمگائی ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔ یہ کیسی تنگ نظری ہوگی کہ کوئی میرے ہاں آئے، مجھ سے کھل کر بات کرے، دو گھڑی بیٹھ کر

ہنس مل لے مگر میں منہ بسورے بیٹھا رہا ہوں، ان سے کچھ نہ بولوں اور اگر کچھ لب کشائی کروں تو وہ اس طرح "مہربانی کر کے آپ میرے یہاں سے چلی جائیے، یہ گھر زاہد خشک سال کا ہے، یہاں جوان عورتوں کا کام نہیں" یہ کہہ کر میں دروازہ بند کر لوں یا عورتوں کی "نگاہ تیز تیر" سے بچنے کے لئے غسل خانہ میں چھپ جاؤں یا پردے کی اوٹ میں ہو جاؤں۔ کیوں، آپ کو میری یہ ادائے مجوبانہ پسند آئے گی؟"

جانے سے ایک دن پیشتر زرینہ بیگم اسلم صاحب کے ساتھ آئیں مگر ان کو تھوڑی دیر بعد بازار بھیج دیا کہ ان کے لئے کچھ پاؤڈر اور لپ اسٹک خرید کر لا دیں۔ مجھے اسلم سے ہمدردی ہو گئی ہے، بیچارہ خچر کی طرح ہر وقت خبار رہتا ہے اور زرینہ بیگم کی سواری میں رہنا اپنی عین خوش نصیبی سمجھتا ہے مگر شاید قسمت کا ہیٹا ہے کہ جس کی نگاہ کرم کا منتظر رہتا ہے وہ اسے کچھ نہیں سمجھتی اور بات بات پر ٹوکتی ہے، چند بناتی ہے اور کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ میں اگر ان کی جگہ پر ہوتا تو زہر کھا کر خودکشی کر لیتا، دامن پھاڑ کر جنگل میں بھاگ جاتا مگر ایسے محبوب کی نظر میں ذلیل نہ ہوتا۔

اسلم صاحب، خدا جانے مجھے کیوں اپنا دوست سمجھنے لگے ہیں، بیچارے ایک دن چپکے سے میرے پاس آئے اور بغیر میرے پوچھے ہوئے سچ سچ اپنے دل کا پورا ماجرا سنا دیا کہ کس طرح وہ ایک عرصہ سے زرینہ بیگم کو بہت چاہتے ہیں اور ان کی ایک ایک ادا پر مٹتے ہیں مگر وہ آفت روزگار ان کی مطلق پروا نہیں کرتی بلکہ الٹا ان کا مذاق اڑاتی ہے۔ میں نے ان سے مخلص ہمدردی کا اظہار کیا تو وہ اور کھل گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمانے لگے "میری قسمت کچھ شروع سے ناراض ہے، ہوش ہوئی تو ماں باپ کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، ساری دنیا میں لے دے کر ایک سگا بھائی ہے

وہ مجھ سے عمر میں بہت بڑا ہے مگر شومیٔ قسمت سے وہ اس قدر نکما، فضول خرچ اور آوارہ ہے کہ بزرگوں کی تمام جائداد کو ختم کر چکا ہے اور آج میرے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں جس کو میں اپنی کہوں جب سے سن شعور کو پہنچا ہوں خان بہادر صاحب کی روٹیوں پر پڑا ہوں، کہنے کو انہوں نے بھی مجھے اپنا متبنٰی بنا لیا ہے مگر کس کام کا۔ پیسے پیسے کو محتاج ہوں اور ہر بات میں ان کا دست نگر ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ اب یہ چیپ نہ ہوں گے تو مجبوراً ملازم کو آواز دی کہ کرایہ کی کوئی گاڑی لے آئے۔ یہ سنکر کہنے لگے یہ آپ کو باہر جانا ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہ کروں گا۔ صرف ایک بات اور کہہ کر اپنی اس گفتگو کو بند کروں گا۔ قسمت گو بری ہے مگر طبیعت بری نہیں، نزہت بیگم کو دیکھ کر دل مچلتا ہے اور ارمان پاؤں پھیلاتے ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا، گھبرا کر ایک دن میں نے تنہائی میں ممانی جان سے کہا کہ میں جو کچھ اور جیسا بھی ہوں مگر آپ کا بھانجہ ہوں کیا آپ ازراہ ذرہ نوازی مجھے اپنی فرزندی میں قبول نہ فرمائیں گی؟ میں نے بڑی آرزوؤں سے اور بہت ڈر ڈر کر یہ کہا تھا مگر قسمت ملاحظہ ہو کہ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ وہ مجھ پر بہت غصہ ہوئیں۔ میری پاک نیت پر لعن طعن کیا اور آخر میں دھمکی دی کہ "دو ٹکے کے لونڈے تیری شکایت ڈپٹی صاحب سے کر کے ہوں۔ تو نے سمجھا کیا ہے، ذرا اپنی صورت تو آئینہ میں دیکھ، بڑا آیا کہیں کا شاہزادہ، مونا نان بائی کا خنگا بنا پھرتا ہے۔"

اگر اسلم صاحب کی ذرا بھیگی آنکھوں میں آنسوؤں کے ورشہوار کو چمکتے نہ دیکھتا تو شاید میں ان کی ممانی جان کے حسب فقروں پر زور سے ہنس پڑتا مگر یہاں ایسا کرنا مناسب نہ تھا اس لئے چپ رہا اور زبان اور تالو کے تصادم سے اظہار ہمدردی

کرتا رہا۔ آخر میں وہ بولے "وہ ممانی جان کی خفگی سے میرے آئے تو اس جانے رہے
جوں توں ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس دن سے وہ مجھ سے بہت کم بات کرتی
ہیں مگر زرینہ بیگم مجھ پر اب تک پہلے کی طرح مہربان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! آپ کا
زرینہ بیگم بہت خیال کرتی ہیں بلکہ اکثر ماں بیٹی کے درمیان آپ کے اخلاق کی
تعریف ہوتی رہتی ہے۔ کیا آپ ایک گدائے بے نوا کے حال پر رحم کر کے میری
سفارش نہ کر دیں گے؟ دیکھیے نا کاروبار شروع کر دیا ہے اور کچھ دن بعد آمدنی شروع
ہونے لگے گی۔ آمدنی اور معقول اب تک ہو گئی ہوتی مگر خدا برا کرے اس برسات کا
آدھے سے زیادہ مرغیاں مر گئیں اور تمام گلاب کے درختوں کو کسی نامعلوم کیڑے نے
راتوں رات چاٹ لیا۔ آپ اگر میرے لئے سفارش کریں تو یہ ضرور کہہ دیں کہ وہ
خان بہادر کا وارث بھی ہے۔ اگر کاروبار نہ چلا تو گھر تو اچھا ہے اور زرینہ بیگم کو بڑے
آرام سے رکھے گا۔"

مجھے اسلم صاحب کے شیخ چلی جیسے منصوبوں پر دل ہی دل میں ہنسی آئی
مگر ساتھ ہی بیچارے کے بلند خیالات سے ہمدردی بھی ہوئی۔ یہ انسان کی شاید سب سے
بڑی حماقت ہے کہ وہ خود اپنے کو اس روشنی میں نہیں دیکھ سکتا۔ جس میں دوسرے
اسے دیکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے بہت سے جرائم ختم ہو جاتے اور بہت سے
قلوب کی سوزش مٹ جاتی۔ اگر اسلم صاحب کو یہ معلوم ہو جاتا کہ زرینہ بیگم ان کو
کس نگاہ سے دیکھتی ہیں اور وہ خود اپنی عادت اور حالت کا جائزہ لیتے تو آج ان کو
میرے پاس خوشامد کے لئے آنا نہ پڑتا اور اس حماقت کے بعد جو صدمہ ان کو لازمی
ہوگا اس سے محفوظ رہتے۔ میں نے ان کی تسلی کی۔ صبر و شکر کرنے کو کہا اور وعدہ کیا کہ

موقع ملنے سے ان کی سفارش ضرور کروں گا مگر آخر میں اتنا ضرور کہہ دیا "اسلم صاحب میرے خیال میں زرینہ بیگم آپ کے لئے بہت گراں پڑیں گی اور آپ کی زیر باریوں میں اضافہ ہو جائے گا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اپنے کاروبار کے چل نکلنے تک خاموش رہتے یا پھر اس درمیان میں اگر خان بہادر صاحب تشریف لے گئے تو راستہ خود بخود کھل کر ہموار ہو جائے گا۔"

اتنی کچھ خفت اٹھانے کے بعد بھی اسلم صاحب کی فرمانبرداری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ زرینہ بیگم نے جونہی بازار جانے کو کہا یہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اب ہم اکیلے رہ گئے، زرینہ بیگم نے کہا "میں کل جا رہی ہوں۔" میں نے اسی لہجہ میں جواب دیا "آخر اتنی جلدی کیا پڑی ہے؟ آپ تو تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آئی تھیں۔" بڑی نحیف اور غمگین آواز میں جواب دیا "آئی تو اسی غرض سے تھی مگر یہاں کے ماحول سے جی اکتا گیا ہے۔ تبدیل آب و ہوا نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔" میں نے اظہار افسوس کیا اور کہا "میں بھی عنقریب واپس جا رہا ہوں۔ انشاءاللہ آپ سے ملاقات رہے گی۔" کہنے لگیں "دیکھئے اب میرا جی وہاں بھی نہ لگے گا، بی۔ اے کرنے لکھنؤ چلی جاؤں گی۔"

ان کو مایوس دیکھ کر میں نے چھیڑنے کے لئے کہا "رانچی میں آپ کا جی یقینی لگے گا، وہاں آپ کی سہیلی نیلو اور ان کے محمود صاحب آپ کی دل دہی کرنے کے لئے موجود ہیں۔" زرینہ بیگم یہ سنکر اور بھی مایوسانہ لہجہ میں کہنے لگیں "اب نہ نیلو اور نہ کسی اور سے جی بہلے گا۔ ساری دنیا اپنے مطلب کی دیوانی ہے۔" میں چپ رہا اور دل ہی دل میں حیرت سے ان کی باتیں سنتا رہا، زرینہ بیگم جن کا چہچہانا اور ہنسنا اب تک

کانوں میں گونج رہا تھا وہ ایسی غمگین باتیں کر رہی تھیں، کہیں میرے کانوں کو دھوکا نہ ہو رہا ہو؟ ۔ پھر خود بخود سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب، انسان سب کچھ کرسکتا ہے مگر قسمت کے لکھے کو ٹال نہیں سکتا۔ مجھے دیکھئے میں نے آسمان سے تارا توڑنے کے لئے کونسا جوڑ توڑ نہ کیا مگر اب تک اسی دنیا میں ہوں اور وہ ظالم ستارا میری قسمت کا ستارا بن گیا ہے"

اب ان کی باتیں قطعی پہیلی بن گئی تھیں اور ان کا سمجھنا میری عقل سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے بہت کچھ پوچھا کہ "صاف صاف کہئے وہ ایسی کونسی چیز ہے جو آپ کو اس قدر مغموم کئے ہے۔ مجھے بتائیے۔ میں شاید کچھ آپ کی مدد کرسکوں" مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہیں اور جب میں نے اصرار کیا تو کڑھ کر کہنے لگیں "آپ میری مدد کیا کرسکتے ہیں، پہلے آپ اپنی مدد تو کیجئے کہ آپ جس پر جان چھڑکتے ہیں وہ کسی اور کی ہونا چاہتی ہیں" یہ میری تمام ہمدردیوں کا نہایت بے رحم معاوضہ تھا جس کو پاکر میں زخمی کی طرح تڑپ اٹھا۔ کیا ان کا کہنا ٹھیک نہ تھا اور کیا میری حالت ان سے بدتر نہ تھی؟ زرینہ نے ایک حقیقت بیان کی تھی مگر چونکہ سچ بات کڑوی ہوتی ہے اسلئے میرا دل جل اٹھا، میں نے بھی جواب دیا "آپ کی بلا سے ہونے دیجئے مگر کسی کی طرح گھل گھل کر پانی نہیں ہو رہا ہوں" شاید تیر نشانے پر لگا، وہ تلملا اٹھیں اور کہنے لگیں۔ "آپ کو محبت نہ ہوگی جب ہی تو پتھر کی طرح پسیجتے تک نہیں" میں نے آہستہ سے کہا۔ "محبت نقلی نہیں، اصلی ہے۔ سہنے کی ہے دکھانے کی نہیں"

زرینہ بیگم غصہ سے بیتاب ہوگئیں، اٹھ کر جانے لگیں، مگر اتنا ضرور کہتی گئیں۔ "دیکھتی ہوں اصلی محبت کب تک نقلی محبت کو دبائے رکھتی ہے، آپ نے میرا ایمان

کیا ہیں! اس کا بدلہ لوں گی ۔" وہ تیزی سے جا رہی تھیں کہ مس گپتا آتی دکھائی دیں۔ یہ ان کو بھی گرگویا جامہ سے باہر ہوگئیں اور کہا "یہ موئی منحوس، کل موہی سا پن، ہر روز میرا راستہ ضرور روکے گی، خدا اس سے سمجھے "۔

مس گپتا نے ریحانہ بیگم کو آداب کیا مگر وہ راستہ کاٹ کر آگے بڑھ گئیں۔ مس گپتا نے کہا "ڈاکٹر صاحب، آپ نے میری بہن کو ضرور ستایا ہے جب ہی وہ غصہ سے چور ہو کر چلی گئیں اور میرے سلام تک کا جواب نہ دیا۔" میں نے خفیف آواز میں جواب دیا "مس گپتا، میں ان کو کیوں ستانے لگا، وہ میری کون ہوتی ہیں، جو ان سے بدتمیزی کرتا"۔ مس گپتا نے خلاف معمول ہنسکر کہا "آپ ان کو کچھ نہیں سمجھتے مگر وہ آپ کو سب کچھ سمجھتی ہیں اور جب آپ ان کی امیدوں کے خلاف کچھ حرکت کرتے ہیں تو وہ بہت کڑھ جاتی ہیں اور برہم ہو کر غصہ کرنے لگتی ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ ہیکل نے انسان کی اس فطرت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے "۔

ہم اب گول کمرے میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا مگر شفق کی سرخی اب تک باقی تھی جو آہستہ آہستہ سرمئی ہو کر سیاہ ہوتی جا رہی تھی، جیسے معشوق کا چہرہ شدید غصہ میں لال بھبوکا ہو کر پھر ماند پڑ جائے۔ مس گپتا نے مجھے غمگین اور سست دیکھ کر کہا "ورگما ناسناؤں، کچھ جی بہل جائے گا۔" میں ہتھیلی پر پیشانی ٹیکے بیٹھا تھا اور اندرونی کشمکش میں مبتلا تھا۔ مس گپتا نے پیانو بجا کر نہایت مدھم سروں میں کچھ مسکراتے ہوئے ردپی بابو کا وہ مشہور نغمہ گایا جس میں ایک برہا کی ماری الھڑ ناری بڑی حیرت اور دکھ سے پوچھتی ہے کہ کوئل کی آواز سے اسے ایسی جلن کیوں پیدا ہوتی ہے؟ مس گپتا کی آواز کی تشبیہ کس چیز سے دوں بس یوں سمجھیے کہ نرم رو جھرنا ہے جو ہوا پر تیرتا ہوا سر سے گذر

جاتا ہے اور ہمیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم ڈوب رہے ہیں۔ ان کی موسیقی بڑی سادہ، صاف اور پہلی نظر میں کچھ بھی نہیں ہوتی مگر آہستہ آہستہ شراب کے نشہ کی طرح اثر کرتی ہے حتیٰ کہ سننے والا مدہوش ہو کر بے خود ہو جاتا ہے۔

مس گپتا نے مجھے خوش کرنے کے لئے دو گانے گائے اس میں شک نہیں کہ ان کے گانوں سے دل ہلکا ہو گیا اور خیالات پر جو غبار سا چھا رہا تھا وہ چھٹ گیا۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مس گپتا میں ایک خاص قسم کی صفت ہے جس سے وہ مغموم انسان کو اپنے بس میں کر لیتی ہیں۔ شاید ان کو اس بات کا ملکہ اپنے بھائی کی خدمت کرنے سے ہو گیا ہے یا فلسفہ کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے سے۔ وہ خاموش اور مغموم انسان کو بات کرنے یا خوش ہونے پر مجبور نہیں کرتیں بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس میں مغموم انسان خود بخود دلچسپی لینے لگتا ہے اور یوں آہستہ آہستہ ماحول کو اپنے مزاج کے موافق تبدیل کر کے اپنے مریض کو اپنے قابو میں کر لیتی ہیں۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ اور اس حکمت کے لئے انسان کا مزاج پہچاننا بہت ضروری ہے ورنہ اگر ہر ایک کے ساتھ ایک ہی نسخہ استعمال کیا جائے تو نتیجہ تباہ کن ہو گا۔

مجھے بیان کرنے میں افسوس ہو رہا ہے مگر شاید اسے سنکر آپ کو خوشی اور اطمینان ہو کہ مس گپتا آج چار دن ہوئے کہ اپنے بھائی کے ساتھ کلکتہ لوٹ گئیں۔ مجھے افسوس یوں ہو رہا ہے کہ وہ جب تک یہاں رہیں میرا شام کو کبھی جی نہیں گھبرایا اور ان کی وہ خصوصیت جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ میرے بہت کام آئی یعنی جب کبھی میں اداس یا مغموم ہو جاتا تو وہ طرح طرح سے مجھے اس آسانی سے بہلا لیتیں کہ مجھے ان کی اس ہوشیاری پر حیرت ہوتی۔ اب جب کہ وہ جا چکی ہیں اور پتہ

نہیں ان سے پھر کبھی ملاقات ہوگی یا نہیں۔ ان کی اس حکمت عملی کی ایک مثال پر خط کو ختم کرتا ہوں۔

میں ایک دن شام کو اداس بیٹھا تھا، وہ آئیں اور مجھے سوگوارانہ انداز سے بیٹھے دیکھ کر کچھ نہ بولیں، پاس کی کرسی پر بیٹھ گئیں، طوفانی ہوا باہر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد خود ہی بولیں "اف بڑی گرمی ہے" اور قبل اس کے کہ میں کچھ بولوں انہوں نے اٹھ کر بڑی کھڑکی کھول دی۔ طوفان کا ایک زبردست جھونکا آیا اور میری میز پر جتنے کاغذات پڑے تھے ان کو تتر بتر کرکے باہر لے چلا۔ یہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں، کبھی اس کاغذ کو پکڑتیں کبھی اس پردہ کو سنبھالتیں، تنہا کیا کیا کرتیں، مجھ سے نہ رہا گیا، میں بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر اڑتے ہوئے کاغذوں کو سنبھالنے لگا۔ اور اس کام میں ایسا کھو گیا کہ اپنے تمام غم بھول گیا۔ مس گپتا نے جب دیکھا کہ میں کمرہ کی گرتی اور اڑتی ہوئی چیزوں میں دلچسپی لینے لگا ہوں تو ہنس کر کھلی ہوئی کھڑکی کو بند کرکے بولیں "ہم بھی نرے احمق ہیں، وجہ کو چھوڑ کر اثرات کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں" کیسا ستھرا مذاق تھا اور کس خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا۔

لیجئے محترمہ، خط تمام ہوا، امید ہے کہ اس کے بعد آپ کے دل میں بدگمانیاں باقی نہ رہیں گی جو بدقسمتی سے آپ کی سہیلی نے میرے خلاف آپ کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں صاف گو ہوں، جو کچھ بات ہوتی ہے اسے صاف صاف بیان کر دیتا ہوں۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ مجھے اپنی وہ مزیدار باتیں سنائیں گی جن کا وعدہ آج کوئی مہینہ بھر سے ہو رہا ہے؟ خدا حافظ

(خیر طلب و خیر اندیش)

(۲۱)

مدھوپور
۵ ۲ستمبر ۳۶ء

اچھی نیلو صاحبہ! خوش رہیئے

میں آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ آپ نے ان تمام واقعات کو جو میں اگلے خطوں میں لکھ چکا ہوں، یقین کرکے مجھ پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ افسوس اس وقت آپ نہ ہوئیں ورنہ دیکھتیں کہ میں خوشی سے کس قدر مدہوش ہو رہا ہوں۔ یہ خدا کی مہربانی تھی کہ اس نے آپ کے دل کی آنکھوں کو روشن کرکے مجھے تاریکی کے غار سے نکلوا لیا اور مجھے ایک بار پھر اس قابل بنا دیا کہ ماحول سے کچھ دلچسپی لوں اور کھلی ہوا میں سانس لوں۔ میری زندگی کے یہ دن کس طرح گذرے ہیں اور میں نے کس مشکل سے اپنی زخمی خیالات کو چھپائے رکھا ہے ان کو بیان کرنے کا ابھی موقع نہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ دن پہاڑ ہو گئے تھے اور راتیں لمبی ہو گئی تھیں۔

دنیا کیسی عجیب جگہ ہے اور یہاں کے رہنے والے بھی اس سے کچھ کم عجیب نہیں ہیں خودغرضی یہاں کے ہر فرد بشر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور جسے دیکھو وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا اپنی فکر میں مبتلا ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے اس میں خودغرضی کا رنگ غالب ہے۔ کیا یہ دنیا کی سب سے بڑی ٹریجدی نہیں اور کیا خودغرضی کو پیدا کرکے قدرت خود پشیمان نہ ہوگی؟ زرینہ بیگم کو میں آپ کا مخلص سمجھتا تھا اور ہمیشہ میں نے ان کی عزت اس لئے اور بھی کی کہ وہ آپ کی ملنے والی ہیں اور اکثر آپ سے ملتی رہتی ہیں۔ ان کے یہاں ایک دم آنے سے اور پھر کچھ عجیب طرح کی حرکتیں کرنے سے میں

پہلے ہی کچھ گھبرا گیا تھا اور ماتھا ٹھنکا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے مگر یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ وہ یوں مجھ سے خواہ مخواہ خفا ہو کر چلی جائیں گی اور وہاں پہنچکر ایسے گل کھلائیں گی۔

کیا آپ تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ یقین کر سکتی ہیں کہ میں نے بھولے سے کبھی ایسی حرکت کی ہوگی جو ان کے شایان شان نہ ہو۔ میں ہر وقت گویا ان کے آگے بچھتا رہتا تھا، وہ مجھے جہاں جہاں اور جب کبھی لے جانا چاہتی تھیں میں جاتا تھا، وہ ہنستی تھیں میں ہنستا تھا، وہ روتی تھیں اور میں مخلصانہ ہمدردی کا اظہار کرتا تھا الغرض میں ان کے احکام کو اپنی مرضی پر ترجیح دیتا تھا اور جس طرح بھی مجھ سے ہو سکا میں نے ہمیشہ ان کو خوش رکھنے کی کوشش کی، ہاں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ میں ان کے ساتھ مل کر پریم کے گیت گاتا، وہ تیتری بن کر اڑتیں اور میں ان کے پیچھے بھاگتا پھرتا، وہ کہتیں "دیکھو دن ہے" میں کہتا "ہاں دن ہے۔ وہ دیکھو سورج چمک رہا ہے" وہ کہتیں "دیکھو رات ہے" میں کہتا "جی، رات ہے، اب سورج دکھائی نہیں دیتا"۔ محترمہ، آپ میرے مزاج سے واقف ہیں، اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی تو میں ایسی خوشامد میں کسی اور کی کرتا جہاں اور جس کے ساتھ میرا جی لگتا ہے اور اسے دیکھ کر میرا دل خود بخود گانے لگتا ہے!

زرینہ بیگم کو یہ بولتے ذرا جھجک نہ آئی کہ میں ان سے ملنے کے لئے صبح شام ان کے گھر پر دھرنا دئے رہتا تھا، کیا خوب ڈھٹائی ہے! ماشاءاللہ چشم بد دور شاید ان کو اپنے متعلق بہت سے دھوکے ہیں۔ میرے پاس یہاں موٹر کہاں جو دس دس میل کی سیر کراتا، اور کیا سیر اور پکنک کے لئے میں تمام سامان مہیا کرتا تھا؟ وہ اگر ایسی

بات اسلم صاحب کے متعلق کہتیں تو شاید زیب دیتی۔ وہ بچارہ نیند میں تھا اپنی مرغیوں اور گلاب کے پھول میں کھویا ہوا، انہوں نے آکر اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور وہ جب اچھی طرح جاگ کر دوڑ دھوپ کرنے لگا تو اس کی زبان بند کر دی گئی اس کی ٹانگوں میں بیڑیاں پہنا دی گئیں اور اسے ایک بار پھر کہا گیا "میاں تم تو ٹانگ پھیلا کر سو رہو، اور اگر نیند نہ آئے تو اپنی جان کو پیٹو، مرغیوں کے انڈے جمع کرو اور گلاب کے پتوں پر سے رینگنے والے کیڑوں کو بھگاتے رہو" کیا یہ صریح ظلم نہیں اور کیا یہ ایک بھولے بھالے انسان کو ورغلا کر خراب کرنے کی ترکیب نہ تھی؟ میری نظر میں یہ ایک ہتیا سے کم گناہ نہیں اور اس گناہ کے مرتکب کو وہی سزا ملنی چاہئے جو شیطان کو ملی تھی!

وہ جس دن سے تشریف لے گئی ہیں، بچارے اسلم کی بری حالت ہے۔ وہ نہ اب اپنے مرغی خانہ سے دلچسپی لیتا ہے اور نہ گلاب کے پھولوں سے، اور اس کی اس غفلت کی خبر کو خان بہادر کی بیگم ثانی ومبدم ان کے کانوں تک پہنچاتی رہتی ہیں۔ ڈپٹی صاحب نے اب اسلم کی مدد کرنے سے بالکل انکار کر دیا ہے۔ وہ غریب سخت پریشانی میں مبتلا ہے، شوہر کی تیوری بدلتے دیکھ کر بیوی نے نت نئے ظلم کرنا شروع کر دیئے ہیں، کبھی اسلم کو ناشتہ نہیں ملتا، کبھی رات کو کھانا غائب، کبھی اس کو بلا کر برا بھلا کہا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے "موئے، ناشدنی، اپنا کہیں جا کر منہ کالا کیوں نہیں کرتا؟" بچارہ گھبرا اٹھا ہے، اپنا منہ کالا کرنا چاہتا ہے مگر کوئی نہیں کرتا ملازمت کے لئے ہر طرف درخواستیں بھیج رہا ہے مگر کوئی شنوائی نہیں۔ بلبلا اٹھا ہے اور اکثر مشورہ کے لئے میرے پاس آتا ہے مگر ایسی صورت میں صرف مشورہ کافی

نہیں ہوتا۔

میں اگر مس گپتا پر مرنے لگتا تو سمجھ لیجئے کہ میں مصر کی قلوپطرہ یا بہزاد کے نقوش پر بھی جان دینے لگوں گا۔ یہ زرینہ بیگم کی انتہائی کم ظریفی ہے جو وہ مجھ پر یہ بہتان لگاتی ہیں۔ انہوں نے مس گپتا کا تعارف مجھ سے خود کرایا اور اب کہتی ہیں کہ مجھے جوان لڑکیوں کو ڈھونڈ نکالنے کی بڑی مہارت حاصل ہے! کیا خوب، ایسا سفید جھوٹ نہ کبھی آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا۔ میں شاید اپنے کسی خط میں لکھ چکا ہوں کہ مس گپتا آفتاب غروب ہونے کے بعد ہی، روزانہ بلا ناغہ اپنے بھائی کو گانا سناتی ہیں اور جس دن وہ گانا نہ سنائیں تو ان کے خبطی بھائی صاحب تمام رات جاگ کر بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ ان کی خدمت جب ایسی سخت ہو اور ان کی موجودگی اپنے بھائی کے سامنے اتنی ضروری ہو تو وہ کیونکر میرے ساتھ رات گزار سکتی ہیں؟ یہ مس زرینہ کا نہایت گندہ الزام ہے۔ ایک معصوم لڑکی کی نیک نامی پر اور ان کو کم از کم مس گپتا کے عورت ہونے کا لحاظ ہونا چاہئے تھا جس جنس کی وہ خود ایک فرد ہیں، میں ایسی نامعقول اور بیہودہ بات پر مزید گفتگو کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

یہ بھی جھوٹ ہے اور قطعی جھوٹ ہے کہ میں نے زرینہ بیگم کے سامنے اس بات کا اقبال کیا کہ یہ میرا قصور تھا اور یہ میری پیش دستی تھی۔ دردانہ بیگم کے معاملہ میں زرینہ بیگم کی یہ غلط بیانی مجھ پر سراسر بہتان ہے۔ میری دردانہ بیگم سے پہلی ملاقات تھی، میرا فرشتہ تک اس سے پہلے ان سے ناواقف تھا، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک مرد بالکل انجان عورت سے دن دھاڑے اس قدر بے حیائی اور حماقت سے ملتفت ہو جائے میں اس معاملہ میں پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور اپنی صفائی میں اس سے کچھ اور زیادہ

نہ تو کہہ سکتا ہوں اور نہ یہ ممکن ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ زرینہ بیگم کو مجھ سے یہ اللہ واسطے کا بیر کیوں ہو گیا ہے، میں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا، ان کی شان میں گستاخی کبھی نہیں کی پھر یہ کیوں میرے پیچھے دامن جھاڑ کر پڑی ہیں۔ جیسے اگر ان کا بس چلے تو مجھے دار پر کھنچوا دیں۔ خیر صاحب اکڑنے دیجئے جو کچھ ان کے من میں آئے، جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھ سکتا ہے؟

نیلوفر صاحبہ میں کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کروں جو مجھے ہو رہی ہے۔ یہ آپ کی والدہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے محمود صاحب کا پیغام پاکر اس کی منظوری اور نامنظوری کا قطعی فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں دے دیا ہے، کیا دنیا کی اور کوئی ماں اتنی مہربان اور دانشمند ہو سکتی ہے؟ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کے لئے کبھی اس سے زیادہ بھی عقل و ہوش سے کام لیا ہوگا؟ اگر ہندوستان کی تمام مائیں اپنی بیٹیوں کے ذاتی معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیں تو آج بہت سے سوگوار دل خوشی سے کھل جائیں اور بہت سی آنکھیں جو آنسوؤں سے بھیگی رہتی ہیں وہ خوشی سے چمکنے لگیں۔ اگر میں آپ کی اماں جان سے زیادہ بے تکلف ہوتا تو ان کو بھی شکریہ کا خط لکھتا۔

مگر مجھے یہ خوشی کیوں ہو رہی ہے؟ آخر وہ کونسی دولت مجھے مل گئی ہے کہ میرا دل بے اختیار رقص کر رہا ہے؟ بات بس اتنی سی ہے کہ مریض کو ایک طبیب کے علاج سے نکال کر دوسرے معالج کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مرض اپنی جگہ پر ہے، کہنہ اور تکلیف دہ، صرف معالج بدلا گیا ہے مگر کیا طبیب کا بدلا جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ یا تو مریض لب گور ہے یا پھر معقول علاج کی امید ہے؟ یہ دونوں حالتیں میرے لئے خوشی کا باعث ہیں۔ اگر پہلی صورت ہے تو اچھا ہوگا ہمیشہ کے لئے درد و تکلیف سے

نجات مل جائے گی اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوسکتا ہے اور میں اپنی اس خوشی پر ناز کیوں نہ کروں ؟

فیصلہ ، اف کیسا خوفناک اور کیسا حسین لفظ ہے ؟۔ یہ دودھاری تلوار کی طرح دونوں طرف کاٹ سکتا ہے ، دوست کو بھی اور دشمن کو بھی ۔ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کے ذمہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے ! میں جسے اس قدر عزیز رکھتا ہوں وہ جج کا لباس پہن کر مجھے اپنا فیصلہ سنائے گا ! کیا یہ میرے لئے اجتماع جنت نظر اور فردوس گوش نہیں ؟ کیا میری زندگی کا اس سے زیادہ اور کوئی خوش گوار لمحہ ہو سکتا ہے کہ میری قسمت کا فیصلہ ایک عدد رجہ حسین چہرہ سنائے جس کے بال سنہرے ، آنکھیں مدبھری اور قد سرو جیسا ہے ؟ کیا ایک حسین جج کا فیصلہ سوائے حسین ہونے کے کچھ اور ہو سکتا ہے ؟ مجھے جواب دیجئے ، للہ جلد ، کہ جواب کے لئے آنکھیں فرش راہ ہیں اور کان دروازہ کی آہٹ پر لگے ہیں ۔ فقط (بے تاب ...)

---

(۲۲)

مدھوپور

۱۲ اکتوبر ۳۶ء

اچھی نیلوفر ! خدا خوش رکھے

گذشتہ خط کے لکھنے کے بعد سے آج تک کے دن اور راتیں جس طرح گذری ہیں وہ کچھ میں جانتا ہوں یا میرا دل ۔ خدا خدا کر کے صبح ہوتی تھی تو شام نہیں ہوتی تھی ، اور شام کا آنا گویا مرگ سست رفتار کا آنا ہوتا تھا ۔ خط ڈالنے کے فوراً بعد سے

اس کے جواب کی فکر دامنگیر ہو گئی تھی اور مبالغہ نہ ہو گا اگر یہ کہوں کہ میرے تخیلات کی آنکھیں اس خط کے ساتھ ساتھ جا رہی تھیں دل رہ رہ کر بار بار یہ کہتا تھا "اب اسٹول پہنچا ہو گا، اب آدرہ، اب پورولیا سے سوار ہو گیا ہو گا اور شاندار قدرتی مناظر کے درمیان ہوتا ہوا میرا خط چلا جا رہا ہو گا...... اور اب آپ کے پاس پہنچ گیا ہو گا، خدایا خیر، دل دھڑکتا ہے اور آنکھیں پھڑکتی ہیں، نہ جانے کیا جواب لکھ رہے ہونگے، خدا کرے!... خدا کرے!!..." ہاں "لکھدیں! آمین" میں نے جس خلوص سے بار بار آمین کی رٹ لگائی ہے ویسے خشوع و خضوع سے میں نے کبھی دعا نہیں مانگی تھی میرے تصور کی آنکھیں آپ کے فرضی خط کے ساتھ پھر لوٹیں اور منزل بہ منزل یہاں پہنچ گئیں مگر بدقسمتی سے ان کے ساتھ وہ ہدہد پیامبر دکھائی نہ دیا۔ تمام دن ڈاکیہ کا انتظار رہا مگر وہ نہ آیا۔ یہ دو دن انتظار اور شدید انتظار کے، راہ تکتے کٹے، ہارے وہ آج صبح آیا اور آپ کے خط کو دے کر چلتا بنا۔

آپ کے اس خط نے مجھے خوب اچھی طرح وحشت میں مبتلا کر دیا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ بار بار پڑھتا ہوں۔ اف یہ اندھیر اور ایسی دلیری۔ ہم ایسی باتیں ممالک غیر کی خبروں میں پڑھا کرتے تھے اور حیرت کرتے تھے مگر اس ملک میں اور خاص اپنے ملنے والوں میں ایسی جسارت کی امید نہ تھی۔ میں شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں، جو سنتا ہو گا وہ کیا کہتا ہو گا؟ اف، توبہ بڑی گندی خبر ہے جس کو سنکر ابکائیاں آتی ہیں۔ مگر غور کیجیے تو یہ واقعہ اتنا حیرت انگیز نہیں۔ اس کا آج یا کل ہونا بالکل یقینی تھا، زرینہ بیگم کے مزاج کی لڑکیاں جن کو والدین کے غلط لاڈ پیار نے بگاڑ رکھا ہے وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں، اجی محمود صاحب پر کیا وہ قبر کے گڑھے

مردوں پر استغاثہ دائر کر دیں کہ مرحوم نے مجھے راہ چلتے ایک بار دیکھ لیا تھا۔
کیا زرینہ بیگم نے اس نالش کے متعلق آپ سے رائے لی تھی، مگر نہیں، وہ رائے مشورہ کی قائل نہیں، ان کے جوجی میں آئے گا وہی کریں گی چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ ان کے والدین بیچارے خواہ کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہوں مگر ایسی باتوں میں بیٹی کا ساتھ نہ دیتے۔ شاید زرینہ نے ان سے رائے نہیں لی ورنہ وہ ان کو ایسی نادانی سے ضرور روکتے اور کہتے یہ بیٹی نالش فریاد سے دولہا نہیں ملتا، یہ جانور تو صرف محبت کے جال میں پھنسایا جاتا ہے۔"
زرینہ کا دعوے کہ محمود صاحب نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر کے مجھے دھوکا دیا اور اب وعدہ خلافی کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں کچھ جبر سا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں محمود صاحب کے خطوط جو انہوں نے پیش کئے ہیں ممکن ہو جعلی ہوں۔ مجھے جہاں تک علم ہے محمود صاحب زرینہ بیگم کی طرف مائل ضرور تھے مگر اتنے نہیں کہ عشق و محبت کے خطوط لکھیں اور ان پر اپنی جان چھڑکیں۔ زرینہ بیگم کو دیکھ کر اور ان سے پہلی بار مل کر وہ کون ہے جو مدہوش نہیں ہو جاتا اور اگر ایسا محمود صاحب نے کیا تو کونسی نئی بات کر دی ؟ بیچارے اسلم کو دیکھو، وہ اب تک گھائل پڑا ہے اور سسکیاں لے رہا ہے اور زرینہ بیگم کو ایک نہیں ہزاروں خط لکھنے کے لئے بہانے ڈھونڈ رہا ہے کیا زرینہ بیگم اس معصوم گنہگار کو بھی کسی اجلاس میں گھسیٹ کر لیجائینگی اور اس کے خطوط کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کریں گی ؟
زرینہ بیگم کی اس حماقت سے آپ کی والدہ کو جتنا بھی غصہ ہو کم ہے۔ مگر محمود صاحب کو صاف جواب دے دینا شاید ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس میں بیچا

کا کیا قصور تھا، یہ تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ بزرگوں کی باتوں میں دخل دینا جائز نہیں، ممکن ہے ان کا کہنا صحیح ہو کہ جب تک کوئی بات نہیں ہوتی ناحق کوئی کسی کو نہیں پکڑتا مگر معاف کیجئے شاید آپ کی والدہ محترمہ زرینہ بیگم (اور دردانہ بیگم بھی) کے مزاج کی لڑکیوں سے واقف نہیں۔ یہ راہ چلتے جھگڑا مول لیتی ہیں اور بہت بلندیوں پر اڑتی ہوئی چڑیوں کو بھی لاسا لگا کر پھانسنا چاہتی ہیں۔

آپ کی والدہ محترمہ نے زرینہ بیگم سے آپ کے تعلقات منقطع کر کے مجھے بڑا خوش کیا ہے۔ یہاں ان کے رویوں کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں کڑھتا تھا اور اکثر چاہتا تھا کہ آپ کو مجبور کروں کہ آپ ان سے ملنا چھوڑ دیں مگر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آپ کے اور ان کے گہرے تعلقات دیکھ کر میں ڈر جاتا تھا کہ کہیں ایسا کرنے میں الٹا مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے جیسا کہ ایک بار غالب کے ساتھ ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سنکے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

مگر زرینہ کے ساتھ محمود صاحب کا آنا بھی بند کر دیا گیا۔ اس میں کیا منطق تھی وہ سمجھ میں نہ آئی۔ آپ کی والدہ کے اس حکم سے غریب کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ اب وہ ہر گھڑی "خالہ جان! خالہ جان!" کہہ کر کس کو مخاطب کریں گے اور خوشامد میں کس کی جوتیاں سیدھی کریں گے؟ مجھے ان کے جذبات مایوس سے گہری ہمدردی ہے۔ آسمانی بلاؤں نے گویا ان کے سر کو پہچان لیا ہے نیچے اترتی نہیں

کہ ان پر نازل ہو گئیں، خدا ان کو جلد ان مصیبتوں سے نجات دلائے اور خوش رکھے۔

آپ نے میرے گذشتہ خط میں مانگے ہوئے فیصلہ کو نہیں سنایا۔ آپ ہرگز اس امید میں نہ رہیے کہ آپ کے ٹالنے پر میں ٹل جاؤں گا۔ میں نے انتظار و تشویش کی بہت سی راتیں اور بہت سے دن تڑپ تڑپ کر کاٹے ہیں۔ آپ کی سرد مہریوں کو لہو کا گھونٹ بنا کر پیا ہے اور آپ نے مجھے جس طرح اور جہاں رکھا ہے میں نے صبر و شکر کیا ہے مگر ضبط و برداشت کی ایک حد ہوتی ہے، میں کب تک اس حال میں پڑا رہوں اور کب تک مجھے اس تاریکی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا اور نہ میں اس قابل ہوں کہ کچھ مانگوں۔ میں محض آپ کی نظرِ عنایت کا خواہاں ہوں۔ مجھے صرف ایک جملہ لکھ کر آپ میری تمام پریشانیوں کو دور کر سکتی ہیں اور تقریباً ایک سال کی جلن کو مٹا سکتی ہیں۔ جملہ بہت سادہ اور بہت معصوم ہے، صرف اتنا سا لکھ بھیجئے: "ہاں مجھے آپ سے محبت ہے"

آہ! شاید آپ نہیں سمجھتیں کہ آپ کی صرف ایک "ہاں" پر میری ساری کائنات کا دارو مدار ہے۔ دیکھئے اگر آپ نے اپنے اس خط جواب میں "ہاں" نہ لکھا تو میں یہاں سے کچھ اور دور چلا جاؤں گا اور آپ شاید اس جگہ کا کھوج بھی نہ لگا سکیں گی۔ فقط

(جواب کا منتظر)

---

(۲۳)

مدھوپور
۲۰ اکتوبر ۳۶ء

میری اچھی نیلو!

تمہارے اس جملہ کو جواہرات میں تولا جائے تب بھی اس کی قیمت کے پاسنگ برابر نہیں "وہ آپ کے تقاضوں سے خاک میں دم ہو گیا ہے، میری توبہ الٰہی، اس "ہاں" "وہ ہاں" "میں کیا رکھا ہے کہ وہ نہیں" "وہ نہیں" "کہوں" "میری اچھی نیلو خوشی سے کلیجہ پھٹا جاتا ہے اور زبان شدت جذبات سے گنگ ہوئی جاتی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی قسمت پر ناز کروں اور اپنی جگمگاتی دنیا کی ایسی تصویر کھینچوں کہ آسمان پر زہرا اپنا رقص بھول جائے اور جنگل میں ناچتے ہوئے مور شرما جائیں، آج میں جتنا خوش ہوں اور میرے ارمانوں کے باغ میں جس طرح جھوم کر بہار آئی ہے اس کے بیان سے اگر چاہوں تو سارے عالم کو رنگین بنا دوں، یہ پہاڑ، یہ جھرنے، یہ زمین اور یہ آسمان سب کے سب پھولوں سے ڈھک جائیں اور ان پھولوں سے وہ مستانہ بو نکلے کہ سارا جہان مدہوش ہو کر ناچنے لگے میری مرجھائی اور سوکھی ہوئی زندگی کے چٹیل میدان میں سبزہ اگ رہا ہے، رنگ رنگ کے پھول لہلہا رہے ہیں اور رنگا مصروف خرام ہلکی سی ہوا، ان پھولوں کو جھولا جھلا رہی ہے اور گدگدا رہی ہے، میں ہنس رہا ہوں، میرا دل ٹھٹھے لگا رہا ہے، یہ چرند یہ چوپائے، یہ کھیت یہ باغ سب کے سب مل کر میرے ساتھ ہنس رہے ہیں اور گا رہے ہیں، میری نیلو، تمہاری ایک "ہاں" نے دنیا کا نقشہ بدل دیا ہے اور یہ سوکھی، جھریوں سے بھری

ہوئی پوپلے منھ والی بڑھیا ایک بار پھر جوان ہو گئی ہے، دیکھو، وہ دیکھو، وہ مسکرا رہی ہے اور اپنی مسکراہٹ سے میرے دل میں گدگدی کر رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہنس دوں گا! ۔ ۔ ۔ ۔ لو میں ہنسا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہنس رہا ہوں!

جب دل خوش ہوتا ہے تو فطرت بھی خوشیوں کے تحفے بھیجکر اپنا نام احسان کرنے والوں کی فہرست میں درج کرا لیتی ہے ۔ تمہارا خط صبح کی ڈاک سے ملا اور اسی دن شام کی ڈاک سے ایک اور خط ملا ۔ چونکہ اس خط میں مجھے قسم دی گئی ہے کہ کسی کو خط نہ دکھاؤں اس لئے خط کے ضروری اور دلچسپ حصے کی نقل بھیج رہا ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ تم بھی اس کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرو گی اور بات خود تک رکھو گی ۔

علیگڑھ

۱۵ اکتوبر ۳۶ء

ڈیر ڈاکٹر صاحب! تسلیم

ایک گنہگار کی طرح یہ خط لکھتے وقت ہاتھ کانپ رہے ہیں، دل دھڑک رہا ہے اور پیشانی عرقِ خجالت سے بھیگی جا رہی ہے ۔ اگر بات اتنی ضروری نہ ہوتی اور معاملات اس قدر طول پکڑ کر الجھ نہ جاتے تو شاید اس خط کے لکھنے کی نوبت نہ آتی اور اقبالِ جرم کی ضرورت نہ پڑتی ۔ قبل اس کے کہ میں کچھ لکھوں کیا آپ مجھے اپنا مخلص اور سچا وعدہ دیتے ہیں کہ مجھے معاف کر دیں گے اور کسی کو میرا خط نہ دکھائیں گے ۔ میں نے آپ کے متعلق جو کچھ سنا ہے اس سے آپ کی طبیعت کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے اور اسی اندازے کے بھروسے پر آج ایک راز فاش کرنے کی ہمت پڑی ہے ۔

گذشتہ گرمیوں کی شاید وہ شام آپ کو یاد ہو جب آپ نیلو بہن کے انتظار میں بیٹھے تھے، میں اور زرینہ بیگم بھی آپہنچی تھیں۔ زرینہ نے میرا آپ سے تعارف کرایا تھا۔ وہ اندر چلی گئی تھیں مگر میں باہر بیٹھی آپ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اس ملاقات میں مجھ سے جو نامعقول حرکتیں سرزد ہوئی تھیں ان کی یاد سے واللہ اب تک مجھے پسینہ آجاتا ہے۔ آپ بھی کہتے ہوں گے وہ کمبخت کیسی چھچھوری اور گری ہوئی لڑکی تھی کہ تسمہ پیر سے کی طرح لپٹ گئی تھی۔" میں قسمیہ عرض کرتی ہوں کہ میں اتنی چھچھوری اور گری ہوئی لڑکی نہیں کہ ایسی بازاری حرکتیں کروں۔ میں نے اس شام جو کچھ کیا وہ محض اپنی نادانی سے کیا اور مجھے ایسا کرنے کے لئے سبز باغ دکھا کر دھوکہ دیا گیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ محمود صاحب ہم تین بہنوں میں اکیلے بھائی ہیں اور ہم ان سے جتنی محبت کرتے ہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا جہاں پسینہ گرے وہاں ہم اپنا خون بہانے کو تیار ہیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ نیلو بہن کو از حد چاہتے ہیں مگر نیلو بہن شاید ان کو ناپسند کرتی ہیں اور جیسا کہ ہم نے پتہ چلایا تھا ان کا میلان خاطر آپ کی طرف تھا۔ محمود بھائی کی پریشانیاں ہم سے دیکھی نہیں جاتی تھیں اور ہم اس فکر میں تھے کہ کسی طرح محمود بھائی کو خوش کیا جائے، زرینہ بیگم ہمارے ساتھ تھیں اور اکثر یہ کہہ کر ہمیں تلملایا کرتیں "وہ آپ اپنے بھائی کے لئے کچھ نہیں کرتیں، دیکھئے غریب کا منھ اتنا سا نکل آیا ہے۔"

آخرش زرینہ بیگم کے مسلسل غیرت دلانے سے میں اس بات کے لئے رضامند ہوگئی کہ زرینہ بیگم جو کچھ کہیں گی وہ کروں گی۔ چنانچہ ان کی رائے سے پروگرام بنایا گیا اور بڑے پس و پیش کے بعد میں اس ڈرامہ میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوگئی۔

زرینہ بیگم نے پتہ لے لیا کہ اس وقت آپ نیلو بہن کے ہاں بیٹھے ہیں مجھے ساتھ لیکر وہاں پہنچیں اور میرا آپ سے تعارف کرا کے اندر چلی گئیں۔ اس کے بعد مجھ کمبخت سے جو نازیبا حرکتیں سرزد ہوئیں وہ آپ جانتے ہیں۔ زرینہ بیگم نے مجھے یہاں پارٹ ادا کرنے کے لئے باہر چھوڑا اور خود جان بوجھ کر نیلو بہن کو ایسے وقت میں باہر لائیں کہ وہ اپنی آنکھوں سے، الٰہی توبہ، ہماری بے تکلفی کو دیکھ لیں۔ اس واقعہ سے صرف دو چار دن پہلے محمود بھائی نے نیلو بہن کے لئے اپنا پیغام بھیجا تھا۔ زرینہ نے یہ وقت اس لئے پسند کیا تھا کہ یہاں نیلو بہن کا دل آپ کی طرف سے پھیر دیں اور ان کے دل میں آپ کی طرف سے بدگمانیاں پیدا کر کے ان کو محمود بھائی کی طرف مائل کر دیں۔

یہاں انہوں نے مجھ سے یہ کہا اور دوسری طرف محمود بھائی کو بھی نیلو بہن کے ہاں آنے کی دعوت دے دی۔ ان کو ایسے وقت میں بلایا کہ وہ آئیں اور خواہ مخواہ ان کی نگاہ میری بے تکلفیوں پر پڑے اور وہ برہم ہو کر مجھ سے غصہ کرنے لگیں۔ بھائی جان کے بلانے میں ان کی کیا مصلحت تھی وہ اب تک میری سمجھ میں نہ آئی۔ بجز اس کے کہ ان کی فطرت اس طرح کی ہے کہ کسی کا گھر جلے اور وہ تاپیں۔ آپ خیریت ہوئی کہ اس وقت چلے آئے ورنہ بھائی جان کی برہمی ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ سے کیا عرض کروں کہ میرا کیا حال ہوا، اگر زمین پھٹتی تو میں اس میں سما جاتی۔ جوں توں کر کے بیٹھی رہی اور بھائی جان کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔ گھر پہنچکر بھائی صاحب نے مجھے وہ جلی کٹی سنانا شروع کیں کہ میں رونے لگی مجھے روتا سنکر میری بہنیں دوڑی آئیں اور انہوں نے حسب قسمیں کھا کھا کر ان کو یقین دلایا کہ یہ محض ڈرامہ کر رہی تھی اور صرف ان کی خاطر تو وہ مسکرانے لگے اور

کہا وہ اب ہرگز ایسی حرکت نہ کرنا اور زرینہ کی باتوں میں نہ آنا عجیب ذلیل فطرت کی انسان ہے۔ یہاں یہ کرتی ہے اور وہاں مجھ سے کچھ اور کہتی ہے۔ اگر آج کے دن سے تم نے زرینہ کا نام لیا یا اس کے ساتھ کہیں گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

زرینہ بیگم نے بھائی جان پر شادی کے جھوٹے وعدے کرنے کا الزام رکھ کر نالش کر دی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا۔ ان کی اس کمینی اور بے شرم حرکت سے ہم لوگوں کو جو تکلیف ہو رہی ہے وہ کس سے بیان کروں۔ دنیا کو زرینہ بیگم کی نسبت کیا معلوم، وہ خواہ مخواہ بھائی جان پر شک کرے گی اور کہے گی "جب تک آگ نہ ہو دھواں نہیں نکلتا" افسوس میں مرد نہ ہوئی ورنہ زرینہ کو وہ مزہ چکھاتی کہ وہ بھی چھٹی رات کا دودھ یاد کرتیں۔ جب سے یہ خبر سنی ہے اور نیز یہ کہ بھائی جان کا پیغام خالہ بی نے لوٹا دیا ہے کچھ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ ایک طرف بھائی کی محبت ہے اور دوسری طرف ایک معصوم بے گناہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خبر کو سنکر خوش ہوں یا روؤں۔ اس جواب سے بھائی جان کو جو تکلیف ہو رہی ہو گی دونا ہر ہے اور اس پر زرینہ بیگم کی نامراد نالش نے ان کو کس قدر پراگندہ خاطر کر دیا ہو گا۔ افسوس!

اب خط کو اس التجا پر ختم کرتی ہوں کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ کالج میں چھٹیاں ہو گئی ہیں اور میں رانچی جانے والی ہوں۔ اگر میرے دوران قیام میں آپ کا وہاں آنا ہو تو ایک بار حاضر خدمت ہو کر پھر معافی مانگوں گی۔

(جناب کی مخلص دردانہ)

دردانہ کے اس خط نے زرینہ بیگم کی بچی کھچی عزت بھی میرے دل سے مٹا دی۔

ہے۔ اس خط نے امید ہے کہ میری بے گناہی کا نقش تمہارے دل پر بٹھا دیا ہوگا اب میرا جی یہاں نہیں لگتا اور جلد سے جلد رانچی پہنچکر تم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب تم کیسی ہوگئی ہوں گی؟ تمہارے دیدہ زیب نقوش پتہ نہیں اب اور کس قدر جاذب نظر ہوگئے ہوں گے؟ اے کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں تو تم کو خوب جی بھر کر دیکھتا اور اپنی آنکھوں کی بے تاب پیاس بجھاتا جس کو ساری کائنات کا حسن سیراب نہیں کر سکتا۔ خط کا جواب جلد دو اور محمود صاحب کے مقدمہ کا مفصل حال لکھ بھیجو۔ خدا حافظ و نگہبان۔

(تمہارا اور صرف تمہارا)

---

(۲۴)

مدھوپور

۲۸ اکتوبر ۳۶ء

اچھی نیلو!

میرا گذشتہ خط کچھ بے تکلف ہوگیا تھا اور میں آپ سے تم پر اتر آیا تھا۔ جب ہی شاید مجھے سزا کا مستحق سمجھ کر تم نے لکھ مارا ہے "اچھا ہوتا کہ اب ہم کچھ دنوں کے لئے سلسلۂ نامہ و مکتوب موقوف کر دیتے اور اس درمیان میں ہم ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جاننے کی کوشش کرتے۔ میں پھر آپ سے کہہ رہی ہوں کہ خوب سوچ سمجھ کر آپ آگے قدم بڑھائے ایسا نہ ہو کہ آپ جسے مرغزار سمجھ رہے ہیں وہ سراب ہو، جس سرخی کو آپ طلوع سمجھ رہے ہیں وہ شاید غروب آفتاب کی ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میں ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی میرا خیال کرے۔ آخرش مجھ

میں کیا اچھائی ہے کہ مجھے اوروں پر ترجیح دی جائے ۔" اس حصہ کو پڑھ کر میرے دل میں متفرق خیالات کے بادل امنڈ آئے اور ان سے آنکھوں کی راہ جو بوندیں ٹپکی ہیں ان کو جمع کر کے حاضر خدمت کر رہا ہوں ۔

صبر و ضبط کی انتہا ہوتی ہے ۔ کچھ دنوں سے ان دونوں کو کھو کر بے سروسامان ہو گیا تھا اور اپنا یہ حال ہو گیا تھا کہ تمہارا خیال آیا نہیں اور بے قراری بڑھ گئی ۔ اٹھتے بیٹھتے تمہارا نام ورد زبان رہتا اور قلب کی دھڑکن سے بھی تمہارے نام کی آواز بلند ہو کر حلق میں آتی اور یہاں گرہ بن کر پھنس جاتی ۔ تمہارے ایک لفظ نے تھوڑی دیر کے لئے کچھ تسکین دے دی تھی مگر شاید تم کو یہ بھی پسند نہ آیا اس لئے تڑپانے کی پھر فکر کرنے لگیں ۔

جب اپنی یہ حالت دیکھتا ہوں اور تمہاری وہ ستاروں جیسی دوری محسوس کرتا ہوں تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے ، سر گھوم جاتا ہے اور عقل بے بس ہو کر مجھے ایسی تاریکی میں چھوڑ دیتی ہے جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ۔ میں بھی کیسا برگشتۂ قسمت ہوں کہ جس کے لئے میری جان حاضر ہے وہ مجھ سے ایسا دور دور رہے جیسے کوئی کسی غیر سے رہتا ہے ۔ میں شکوہ نہیں کرتا اور نہ غصہ ، شکوہ کس سے کروں اور غصہ کس پر ہوں ۔ بات میں بات نکل آتی ہے تو عرض کر دیتا ہوں کہ میری حالت کیسی ہے اور کس کے لئے ہے ۔

میں نے شاید دبے لفظوں میں تم سے کئی بار پوچھا تھا کہ تم کو کسی سے محبت ہے یا نہیں ، اور کیا تم اس کی منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کی ناخدا بننا منظور کرو گی مگر تم نے ایک مذبذب سی ہاں کے سوا اب تک مجھ سے کچھ نہیں کہا ۔ تم ہی کہو یہ سوال

کتنا ضروری، کس قدر اہم اور کیسا ناگزیر ہے؟ اس کو کسی حالت میں بھی نہیں ٹالا جا سکتا ہے اور اگر ٹالنے میں برابر عند قائم رہی تو پھر قصہ تمام ہو جائے گا، جو جہاں تھا وہیں رہ جائے گا اور حسرت سے کھڑا منہ تاکتا رہ جائے گا۔

جان جہاں، میں پھر کہتا ہوں کہ تم اپنے دل سے پوچھ کر جواب دو۔ اگر اس کے اندر محبت کی کمی محسوس کرتی ہو تو پھر چپ ہو رہو، مجھ پر جو گذرے گی وہ سہہ لوں گا اور کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے کی سزا بھگت لوں گا۔ میں تم سے کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ تم کو پا کر مجھے کیسی خوشی ہوگی؛ میں جب کبھی سوچتا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں تو تخیلات کا مصور چابک دست اپنی رنگ برنگی تولیوں سے چشم زدن میں ایک ایسی تصویر کھینچکر رکھ دیتا ہے جس کی آنکھیں مد بھری، ناک ستواں، رنگ انار دانوں کی طرح، گردن نازک، بال سیاہ اور گھنے اور قد ماشاء اللہ، فتنۂ قیامت سے ذرا سا کم ہے۔ تم نے دیکھا کہ خیال کی آنکھوں میں بھی تمہاری رنگینیاں چھائی ہیں اور یہ آنکھیں جدھر دیکھتی ہیں صرف تم کو پاتی ہیں۔

جان عالم، تم نے یہ خوب لکھا ہے کہ تم اچھی نہیں ہو، اس وقت اگر تم میرے سامنے ہوتیں تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھتا "کیا سچ کہہ رہی ہو؟" پھر تم دیکھتیں کہ تم کو کیسی جھینپ آتی اور تم کس طرح شرما کر مجھ سے منہ پھیر لیتیں اور کہتیں "جائیے، آپ بڑے وہ ہیں" تمہاری خوبیوں کو بیان کرنے کے لئے عمر خضر چاہئے۔ اس چند روزہ زندگی میں اس فرض کے بھاری بوجھ سے کاندھوں کو ہلکا نہیں کیا جا سکتا مختصراً یہ کہتا ہوں کہ میں جو کچھ ڈھونڈ رہا تھا وہ تم ہو، تم میرے ارمانوں کی جنت اور میرے پرواز خیال کی انتہا ہو، میرا توسن خیال تم سے باہر نہیں

جا سکتا اور اگر میری تمناؤں کو جامۂ تشکیل پہنایا جائے تو وہ تم سے کم درجہ کی چیز ہوگی۔

اس خط کو ڈاک میں ڈال کر میں کل گاڑی پر سوار ہو جاؤں گا۔ رانچی سے باہر رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا اور اب میرے خیالات کسی جلاوطن کی طرح غمناک اور اداس ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے اس ماحول سے اب وحشت ہونے لگی ہے۔ وہاں پہنچکر سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ تم کو دیکھوں۔ تم کو دیکھنے کے خیال سے ہاتھ پاؤں میں کپکپی سی ہونے لگی ہے اور اب خط لکھا نہیں جاتا۔ خدا حافظ۔

(مشتاق دید)

---

# شعلے

## (۲۵)

رانچی

۵ نومبر ۱۹۳۶ء

نیلو!

کل سے رانچی پہنچکر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے وہ کسی پردیسی کے دل سے پوچھو جو رامچندر جی کی طرح چودہ سال کے بنباس کے بعد گھر لوٹا ہو، جب اسٹیشن سے اتر کر آرہا تھا اور گاڑی تمہاری کوٹھی کے سامنے سے گذری تو خواہ مخواہ دل مچل گیا اور آنکھیں بے قراری سے احاطہ، پورٹیکو اور کھڑکیوں کے اندر جھانکنے لگیں۔ پتہ نہیں اس وقت دن کے دو بجے تم کیا کر رہی تھیں؟ ارے خوب یاد آیا قیلولہ فرما رہی ہوں گی! سچ کہنا اس وقت خواب میں تمہیں کچھ نظر آیا تھا یا نہیں؟

گھر پہنچکر گویا بیتابیوں کا دورہ پڑ گیا۔ دو بجے سے ۵ بجے تک کے تین گھنٹے کھنچکر تین صدیاں بن گئے۔ گھڑی کی سوئی، آفتاب کا سایہ، دھوپ کی کرنیں الغرض سب کے سب نے مل کر مجھے چھیڑنا شروع کیا اور روح کو کچھ ایسی الجھن ہونے لگی کہ بیان سے باہر ہے۔ عرصہ کے بعد تم سے ملنے کی امید، تم کو دیکھنے کی آرزو، اور تمہاری باتیں سننے کے ارماں، ایک طوفان تھا کہ امڈا چلا آرہا تھا اور مجھے ڈبو کر غوطے دے رہا تھا۔

آخر شں جب خوب تھک کر چور ہو گیا تو ۵ بجے اور میں تمہارے ہاں پہنچا، مچلتے ہوئے دل اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے زینے طے کئے۔ "کریم" حسب معمول بیٹھ کر اونگھ رہا تھا، مجھے دیکھ کر مسکرایا، جماہی لی، انگڑائی لی، جماہی لیتے وقت اپنے کھلے ہوئے منھ کے آگے چٹکیاں بجائیں پھر کھڑا ہوا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا "چھوٹی سرکار، آپ کا انتظار ہی کر رہی تھیں، چلئے اندر تشریف رکھئے"۔

یہ وہی کریم تھا جو چھ ماہ پہلے ایک شام کو گرگ باراں دیدہ کی طرح مجھے اپنے سفید دانت دکھا رہا تھا اور مجھے جھوٹ بول کر واپس کرنا چاہتا تھا مگر آج وہی مژدۂ جانفزا سنا رہا تھا، تمہارے کمرے میں بیٹھ کر ان مانوس چیزوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہا تھا جو بہت دن سے میری آنکھوں سے اوجھل تھیں۔ تم نے اپنا وہ سبز رنگ کا گلدان ہٹا دیا ہے، اب وہاں سرخ رنگ کا ہے اور تمہارے مینٹل سے ابنوسی ہاتھی غائب ہے، میز، صوفے، کرسیاں وغیرہ بھی نئے ڈھنگ سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں ان تبدیلیوں کا کھوج لگانے میں کھویا ہوا تھا کہ دروازہ پر قدموں کی آہٹ ہوئی دل دھڑکنے لگا، ہمت نہ ہوتی تھی کہ اوپر نظر اٹھاؤں مگر...... نہیں یہ تو تمہاری والدہ تھیں۔ ان سے مل کر جی بہت خوش ہوا، تمہارے آنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے بہت شفقت و محبت کی باتیں کیں، تمہارے بھائی صاحب کے متعلق دریافت کرتی رہیں کہ ایم، ایس، سی کے بعد ان کے لئے کیا لائن چنی جائے۔

اب دروازے پر پھر آہٹ ہوئی، میں اس وقت تمہاری والدہ سے باتیں کرنے میں ان کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا، انہوں نے شاید میرے چہرہ کے رنگ کو متغیر دیکھ کر اپنی نظریں جھکا لیں۔ جی، اس بار آپ تھیں، بالکل آپ، کلی کی طرح

مسکراتی ہوئی اور پھول کی طرح شاداب، سری آنکھیں جھپکنے لگیں، ماتھے پر پسینہ کے قطرے پھوٹ نکلے گویا آفتاب کمرہ کے اندر آگیا تھا۔ کہاں دل اتنا بیقرار تھا اور طبیعت اتنی بے چین تھی مگر تم کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ دل کی رفتار بند ہو گئی اور طبیعت کی بے چینی یک لخت جاتی رہی، تم مسکرائیں، تمہارے رخسار کا وہ خوبصورت تل مسکرایا، تمہاری دنبالہ دار آنکھیں مسکرائیں، ہوا مسکرائی، آسمان اور زمین مسکرائے الغرض سارا جہان مسکرانے لگا، ایسا محسوس ہوا کہ کائنات کے ہر خوابیدہ نغمے جاگ اٹھے اور ساز سنگیت کا جلترنگ بجنے لگا۔

میں تمہارے ہاں جب تک بیٹھا رہا نہ پوچھو کہ کس حال میں تھا۔ اگر میں اس وقت کے اپنے تمام جذبات کی کوئی تصویر بنا کر پیش کروں تو تم شاید اس تصویر سے ڈر جاؤ۔ اور مجھے کوسنے لگو۔ مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہے مگر کیا کروں کہ مجبور ہوں۔ تم سے جدا ہو کر جب میں اپنے کمرہ میں بیٹھتا ہوں اور اپنے تمام مچلتے ہوئے ارمانوں کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے اپنی حالت پر افسوس ہوتا ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ کبھی کبھی تمہاری جدائی سے تنگ آ کر دل ایسا بھی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ کر ایسی دنیا میں چلا جاؤں جہاں انسان کے بدلے صرف سبزہ اور گھانس ہوں، تمہاری ایک سادگی ہزار بناوٹوں سے زیادہ مستحکم ہے، اس کے آگے میں سر پھوڑ کر بیٹھ جاتا ہوں اور کچھ بنائے بن نہیں پڑتا۔

اکثر میں اس عزم کو دل میں لئے گھر سے نکلا ہوں کہ تم کو صرف دور سے دیکھ کر اپنے دل کی تسکین کر لوں گا۔ خود باتیں نہ کروں گا بلکہ تمہاری بھولی باتوں کو بیٹھا سنا کروں گا اور جب تم کسی معصوم سے فقرہ پر کھلکھلا کر ہنس پڑو گی تو میں اس ہنسی کو

سنوں گا جس سے بڑھ کر نرم و نازک موسیقی کہیں اور نہیں۔ جان من، تمہاری معصومیت میں شرارت کی باتیں تمہارا خود کچھ کہنا اور کہہ کر خود ہی جھینپ جانا۔ تمہاری یہ خواہش کہ مزیدار باتیں ہوں مگر جہاں مزہ پیدا ہوا وہیں سے گفتگو کا رخ بدل دینا؛ تمہارا نہایت معصوم طرح سے ہر نئی بات کی جستجو کرنا اور جب کوئی نئی بات معلوم ہو تو اس کو بڑی احتیاط سے یاد کر لینا، تمہارا کبھی نہایت ہوشیار لڑکی کی طرح کسی کے دل کی بات کا اثر لے لینا اور پھر کبھی بڑی احمق، بڑی ننھی نادان کی طرح کسی بات کو ہزار تفصیل کے بعد بھی کچھ نہ سمجھنا اور جب اس پر کوئی جھنجلائے تو روٹھ کر کہنا "لو جی ہیں ان پہیلیوں کو کیا جانوں؟" تمہاری یہ چیزیں جب تنہائی میں یاد آتی ہیں تو کیا بتاؤں کہ کس طرح کلیجہ پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔

میری مایۂ ناز، میں کیسا خوش نصیب ہوں کہ تم میں میرے رنگین خوابوں کی تعبیر مل گئی اور میری تمناؤں نے تمہارا روپ دھارن کیا ہے۔ پر دیکھوں کہ کتنا بدنصیب ہوں جو اب تک تم سے دور دور رہوں۔ یہاں دل کی یہ حالت ہے کہ ہر گھڑی تم کو تصویر کی طرح نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے، دماغ کا یہ حال ہے کہ ہر لمحہ تمہارے خیال سے معمور ہے۔ جسم و جان کی ہر رگ یہ چاہتی ہے کہ میں تم میں جذب ہو کر اپنی خودی کو مٹا دوں مگر گردش آسمان ان سب سے بالا بالا اپنا جال الگ بن رہی ہے وہ اس لئے کہ مجھے اس میں ڈال کر تم سے الگ رکھے۔ میری روح اس ظلم سے تنگ آ کر چیختی ہے اور اس کی چیخ آسمان کے گنبد کے اندر گونج کر خالی خولی لوٹ آتی ہے اور تم کو اپنے ساتھ لگا نہیں لاتی۔

میں تم کو کبھی دن کو آفتاب کی کرنوں میں ڈھونڈتا ہوں اور کبھی رات کو ماہتاب

کی کرنوں میں۔ انہوں نے تم سے اکتساب نور کیا ہے مگر پھر بھی تمہارا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کہاں ہو اور سیاہ بادل کا وہ کونسا ٹکڑا ہے جو تم کو میری نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہے اور میرے اس ارمان کو پورا ہونے نہیں دیتا کہ ہر گھڑی تم کو اپنی نظر کے سامنے بٹھائے رکھوں اور دل کو تمہاری موجودگی کی تپش میں پگھلاتا رہوں۔

میری جان حیات، میں آج بہت خوش ہوں۔ کل تم سے مل کر میری روح وجد کر رہی ہے اور کل کے نشہ کا خمار اب تک باقی ہے اس لئے آج تل کر بیٹھا ہوں کہ تم کو اپنی بہکی بہکی باتیں سناؤں گا۔ تم تنگ آکر کہوگی "بس کیجئے۔ اللہ، میرے تو کان پک گئے۔" میں نے آج یہ بھی ارادہ کر لیا ہے کہ اپنی اس محبت کو بیان کروں گا جو اندر رہی اندر مجھے گھن کی طرح کھائے جاتی ہے اور میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ ہر شے میں تمہاری جھلک نظر آنے لگی ہے۔ میرے کان ہر صدا میں تمہاری آواز سنتے ہیں۔ میری انگلیاں ہر نرم و نازک چیز میں تم کو محسوس کرتی ہیں اور میری آنکھیں، اف کچھ نہ پوچھو کہ یہ تم کو کہاں نہیں دیکھتی ہیں۔ الغرض میرے آسمان میں تم ستارے بن کر چھا گئی ہو اور تمہارے بغیر میری دنیا کوئی اور کہیں نہیں۔ میرے لئے ایک نئی مشکل ہو گئی ہے وہ یہ کہ تمہارا خیال آیا نہیں اور یہاں ہوش و حواس اور عقل و خرد رخصت ہوئے۔ چنانچہ ابھی دیکھو، میں کیسا عزم صادق لیکر بیٹھا تھا کہ تم کو اپنے دل کی ہر تڑپ دکھاؤں گا مگر وائے، کچھ بھی نہ دکھا سکا۔ تم سے جدا ہو کر مجھ پر جو اداسی اور مایوسی چھا جاتی ہے وہ تم کو تم کیا جانو؟ میں تمہارے سامنے خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور خوش ہو کر ایسا بے خود ہو جاتا ہوں جیسے کوئی شراب

کے نشہ میں ہو جائے ۔ اس وقت میری جان و روح کا ہر ذرہ تمہارے آفتاب حسن کی روشنی میں جگمگا اٹھتا ہے، میرا جمود روانی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور میرا غم غم ماضی ہو کر غائب ہو جاتا ہے اور تم جب تک میرے سامنے ہوتی ہو میں عندلیب خوش بیاں کی طرح "ذکر گل" میں کھو جاتا ہوں ۔

اور جب تم میری نظروں سے غائب ہو جاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کے مجھ کو خود مجھ ہی سے چھین لیا ہو ۔ میرا جسم روح سے خالی ہو کر ایک مجسمہ کی طرح بے حس و حرکت ہو جاتا ہے اور اس حالت جمود میں اکثر گھنٹے گذر جاتے ہیں اس دوران میں کسی کے آنے جانے کی مجھے خبر نہیں ہوتی ، ماحول میں آس پاس میں کیا ہو رہا ہے ، یہ مجھے محسوس نہیں ہوتا بالکل اسی طرح جیسے طوفان سطح سمندر سے گذر جائے مگر اس کے عمق میں ایک لہر بھی پیدا نہ ہو۔

جانتا ہوں ، یہ تمام کیفیتیں اس وقت تک ، دور نہ ہوں گی جب تک کہ تمہاری قربت مستقلاً حاصل ہو جائے مگر حالات کو دیکھتے ہوئے اور اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتے ہوئے بھی کس منہ سے بڑا بول نکالوں ؟ یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں ؟ اس کے لکھنے کا منشا کیا ہے ؟ کل تم سے ملاقات ہو چکی ہے ، کل انشاء اللہ پھر ملوں گا ! پھر یہ خط کیوں لکھ رہا ہوں اور اپنے غریب ملازم کو تکلیف دے رہا ہوں ؟ اگر اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو بس یہ ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر تمہاری خیالی تصویر سے زیادہ کھلکر باتیں کر سکتا ہوں اور وہ بے تکلف الفاظ جو میرے مچلتے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کو تمہارے سامنے دہرا نہیں سکتا ۔ تم کو خط لکھنے کا وقت گیا تم سے مزید اور باتیں کرنے میں گذرتا ہے اور یہ شغل لطیف عشق دیر تک ذکر حبیب کرتا

رہے وہ کم ہے۔

خط جانتا ہوں کہ طویل ہو کر افسانہ بن گیا ہے۔ انگلیاں قلم کو اٹھائے اٹھائے تھک کر کانپنے لگی ہیں، رات کے ۲ بج گئے ہیں مگر پھر بھی تم سے باتیں کرنے سے جی نہیں بھرا ہے۔ بادل نخواستہ شب بخیر کہتا ہوں۔ (تمہارے خیال میں مدہوش)

..........

---

# (۲۶)

رانچی

۷ نومبر ۱۹۳۶ء

جان حیات!

کل تم سے مل کر پیاس کا بجھنا کجا یہ ظالم اور بھڑک اٹھی ہے۔ کسی پہلو چین نہیں دل و دماغ عجیب قسم کی بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ تم نے میری غیر حاضری میں جن مشکلات کا سامنا کیا تھا ان کا قصہ سنکر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ محمود صاحب جیسا تعلیمیافتہ انسان ایسی ذلیل حرکتوں پر اتر آیا تھا اور اس کا بھی لحاظ نہ کیا کہ تم دور کی ہی مگر ان کی خالہ زاد بہن ہو۔ افسوس اس وقت میں نہ ہوا ورنہ دکھا دیتا کہ ایک بے گناہ کو اس قدر آسانی سے ستایا نہیں جا سکتا۔ مجھے تمہارے صبر و استقلال پر حیرت ہوتی ہے اور جس خاموشی سے تم نے ان کی شرارتوں کو برداشت کیا اور اس کا ذکر اپنی ماں کے سامنے بھی نہ کیا وہ قابل صد تحسین ہے۔ مگر میری نیلو مجھے تم سے شکایت ہے۔ تم نے ان واقعات کا اشارۃً کبھی اپنے

خطوں میں کبھی ذکر نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ میں مدھو پور سے بہت جلد لوٹ آتا اور شاید تمہاری کچھ مدد کر سکتا مگر ....... اس وقت تم مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو کر دل کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟ تم نے اس وقت تک مجھ سے وہ تاریخی "ہاں" نہیں کہا تھا۔ جس کے بعد سے علی بابا پر جواہرات کے سب گچھے کھل گئے ہیں۔

یہاں پر بیساختہ الف لیلے کے کچھ افسانہ کی مثال ہم پر چسپاں ہوتی ہے۔ ذرا تم بھی سن لو۔ علی بابا عرصہ تک افلاس میں ادھر ادھر مارا پھرا، پھر اس کی قسمت کی کایا پلٹ ہوئی، جادو کا بول اس کے ہاتھ آیا اور خزانہ کی کنجیاں ہاتھ لگیں۔ اس کی قسمت پر ڈاکوؤں کے سردار کو رشک آیا اور اس کے خزانہ پر ڈاکہ ڈالنا چاہا۔ مگر علی بابا کی ایک لونڈی تھی، بڑی تیز، بڑی ہوشیار، آفت کی پرکالہ، اس کا نام تھا زرینہ اس نے راتوں رات ڈاکوؤں کے سردار کی وہ چربی یعنی کھولتے تیل کا کرچھل بھر بھر کر ڈاکوؤں کے سر پر اس طرح دے مارا کہ ان کی کھوپڑی گنجی ہو گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ کیا ہماری زرینہ علی بابا کی زرینہ سے کسی بات میں کم ہے؟

خیر محمود صاحب نے جو کچھ کیا وہ اپنے لئے کیا، تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکے اور نہ انشاللہ بگاڑ سکیں گے مگر ان کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ مجھے ان کی چندھی آنکھوں میں اکثر شرارت جھلکتی دکھائی دیتی ہے اور ان کے لبوں کی مستقل مسکراہٹ ان کے ملنے والوں کی گردن پر ایک چمکتی تلوار ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت وار کریں گے۔ اور کس پر وار کریں گے۔ مجھے ان کے ملنے والے بھی کچھ اسی قسم کے نظر آتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر زیدی ہیں اور دوسرے پنڈت گجادھر پرشاد۔ ایک ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر دوسرے عدالت کے نقل نویس، دونوں ٹھنگنے، دونوں

چرم و استخواں ۔ ایک سفید دوسرا سیاہ ، ایک کی آنکھیں بڑی بڑی اور دوسرے کی ایک ندارد۔ جب محمود صاحب کے ہاں جاؤ ان میں سے ایک بیٹھا یا تو ہنس رہا ہوگا یا سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہوگا ۔ ڈاکٹر صاحب ، پنڈت جی ، وکیل صاحب ان تینوں نے مل کر ایک ترکون بنالی ہے جس کے تینوں کونوں پر یہ تینوں شکاری بیٹھے ہیں اور ان کے درمیان ، ترکون کے اندر ، ان کا کوئی شکار باندھ کر ڈال دیا جاتا ہے اور یہ باری باری اسی شکار پر گدھ کی طرح ٹھونگ مارتے ہیں ۔ اندر بغلیں بجا کر ہنستے ہیں ۔ ایک کہتا ہے " اب یار تم " دوسرا کہتا ہے " یار اب تمہاری باری ہے " اور آخر میں پنڈت جی اپنی تنہا آنکھ کو موند کر کہتے ہیں " جو کچھ بچا ہے لاؤ یار ہم چٹ کر جائیں " الغرض کوئی شکار ان تینوں کی گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتا ۔

اس موقع پر اگر یہ واقعہ سناؤں تو شاید کوئی حرج نہیں اس لئے کہ محمود صاحب سے مجھے کوئی شکایت نہیں مگر یہ واقعہ مجھے آج سے کوئی سال بھر پہلے معلوم ہوا تھا اور وہ بھی اس آدمی کی زبانی جو محمود صاحب اور ان کے ساتھیوں کے ترکون میں پھنس چکا تھا اور خوب لتھاڑا گیا تھا ۔ یہ بیچارہ کالی ڈیہ کا رہنے والا گھر کا اچھا کھاتا پیتا بھلا مانس ہے ۔ اس کی تھوڑی سی زمین ہے جس کی قلیل آمدنی سے اس کے پورے کنبے کی گذر بسر ہوتی ہے یہ شامت کا مارا کہیں رانچی چلا آیا اپنی آنکھوں کا علاج کرانے ۔ اس کی آنکھیں آ گئی تھیں جو اب اچھی ہو گئی تھیں ۔ مگر سرخی نہ گئی تھی ۔ یہ کہیں ٹہلتا ہوا کچہری کے ہجوم کا تماشہ دیکھنے چلا گیا جہاں پنڈت جی اپنی ایک آنکھ سے ہر شخص کو یکساں دیکھتے ہیں ۔ پنڈت جی نے تاڑ لیا کہ دیہاتی

ہے اور موٹا آسامی معلوم ہوتا ہے۔ فوراً اس سے مل کر ایسے بے تکلف ہوئے کہ اسے اپنے گھر پر ٹھہرایا اور کہا یہ چلو تمہاری آنکھوں کا ولایت کے ڈاکٹر سے علاج کراتا ہوں"۔ دوسرے دن پنڈت جی اسے ڈاکٹر زیدی کے مطب لے گئے جہاں اس بیچارہ کو طرح طرح کے مہمل بجلی کے اصلی نقلی آلہ جات دکھا کر ایسا مرعوب کیا گیا کہ صرف ایک نسخہ میں اس کی جیب خالی کرالی گئی۔ پنڈت جی اسے یہاں سے لے کر چلے اور جب اسے پیشاب کی حاجت ہوئی تو ٹھیک وہاں پر بیٹھ جانے کو کہا جہاں پنڈت جی کا ملاقاتی کانسٹبل پہرہ پر کھڑا تھا۔ یہ یہاں بیٹھا اور ادھر پنڈت جی نے اپنی ایک آنکھ سے کنکھی ماری۔ سپاہی نے بڑھ کر غریب کو گرفتار کر لیا اور تھانے لے جا کر چالان کر دیا۔

پنڈت جی نے بہت دلاسا دیا، تسلی کرائی اور کہا وہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ سرکاری شہر کے بیچ پیشاب کرنے سے کم از کم سات سال کی قید یقینی ہے مگر گھبراؤ نہیں، جب تک تمہارا یہ دوست پنڈت گجادھر پرشاد زندہ ہے تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ میں شہر کے سب سے بھاری وکیل کو تمہارے لئے مقرر کرتا ہوں وہ ایسی بحث کریں گے کہ حاکم کا منھ توڑ دیں گے اور جو کچھ چاہیں گے حاکم کا ٹینٹوا دبا کر لکھوا لیں گے"۔ یہ غریب ایک تو شہر میں یونہی بوکھلایا ہوا تھا اس پر سپاہی کیا لال پگڑی، تھانہ، حوالات، داروغہ، چالان وغیرہ دیکھ اور سنکر اس کے ہوش اڑ گئے۔ پنڈت گجادھر کی ایک آنکھ میں اس کو تمام دنیا کی مجموعی قوت کو شکست دینے کی چمک دکھائی دی بلبلا کر کہنے لگا "بھائی میری جان بچاؤ، میں تو لٹ گیا میرے بچے۔ میری بیوی میرے لئے رو رو کر مر جائیں گے۔ بھگوان کے لئے مجھے

وکیل صاحب کے ہاں جلد لے چلو" پنڈت جی نے کہا "لے چلنے کو میں تیار ہوں۔ اور وہ مجھے دیکھتے ہی تمہارا مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے مگر خرچ پورا ہوگا۔ وکیل صاحب کو اتنے مقدمے ملتے ہیں کہ ان کو سر کھجلانے کی فرصت نہیں، راجہ، نواب ان کی خوشامد کرتے ہیں مگر یہ ان کے مقدمے نہیں لیتے، ابھی ان کو وقت کہاں، کھانے کی تو چھٹی نہیں ملتی، بسکٹ کھاتے جاتے ہیں۔ اور کاغذات دیکھتے جاتے ہیں" پنڈت جی یہاں تک کہنے پائے تھے کہ ان کی ایک آنکھ سے پانی بہکر ان کے سوکھے ہوئے گال کی ابھری ہوئی ہڈی پر آگیا، اور انہوں نے اس پانی کو اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر سے پونچھا جو یہاں اسی غرض سے رکھی رہتی ہے۔ مگر اس دیہقانی کو ایسا محسوس ہوا کہ وکیل صاحب سے پنڈت جی کا بڑا پیار ہے جب ہی ان کو کھانے کا وقت نہ ملنے سے یہ محبت میں ان کے لئے رو رہے ہیں۔!

قصہ مختصر! چونکہ اس وقت اس کے پاس جو کچھ تھا وہ ڈاکٹر زیدی کے کیش بکس میں پہنچ چکا تھا اس لئے بات یوں طے پائی کہ وہ فوراً اپنے گھر جائے اور وہاں سے جو نقد رقم مل سکے اسے لے آئے۔ چنانچہ یہ گیا اور اپنی تمام عمر کی پونجی لے آیا جو تقریباً ڈھائی سو روپے کی تھی۔ پنڈت جی اس رقم کو دیکھ کر جھنجلائے۔ اپنی کانی آنکھ میں ہمدردی اور افسوس کی چمک پیدا کی۔ اپنی ایک ہفتہ آگے کی منڈی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بڑے گمبھیرتا سے بولے "اتنی سی رقم سے کیا بنے گا، وکیل صاحب کے صرف مقدمہ ہاتھ میں لینے کی فیس پانسو روپے ہے" یہ سنکر غریب کے اوسان خطا ہوگئے۔ رونی صورت بنا کر کہنے لگا "میرے پاس جو کچھ تھا وہ لے آیا اس سے

زیادہ نہیں ہو سکتا۔" پنڈت جی تاڑ گئے کہ جانگلوش سچ کہتا ہے اس لئے ذرا ہمدردانہ بن کر مدھم آواز میں کہا "اگر ایسا ہے تو بھائی کام نہ چلے گا، روپیہ کا بندوبست جہاں سے جانو کرو۔ ابھی تو خیر، میں وکیل صاحب کو کہہ سنکر اسی رقم پر مقدمہ لینے کو راضی کر لوں گا۔ مگر آگے کے متعلق سوچو، ایسا نہ ہو کہ دستانہ میں وہ میری بات سن لیں اور جب مقدمہ کی تاریخ مقرر ہونے لگے تو تم کہو روپیہ نہیں ہے۔ انسان کو ہر طرح جان بوجھ کر آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔" اس لئے کہا "اب بندوبست کرنا ہی پڑے گا نہیں تو سات سال جیل خانہ میں رہ کر اب بال بچوں کے جیب پر ہتیا کون کرے گا؟"

الغرض پنڈت جی موکل کو پھنسائے ہوئے اس وکیل کے ہاں گئے جس کی ملاقات کی فیس آدھ ہزار ہے، وہ کون محمود الحسن صاحب، بی، اے، بی ایل، بڑی مشکل سے وکیل صاحب نے ڈھائی سو روپیہ لینا منظور کیا اور مقدمہ دھواں دھار چلا۔ مہینوں پیشیاں ہوتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ جب غریب موکل کا گھر بیل، مکان، زمین، بیوی کے زیورات سب کچھ گاؤں کے ساہوکار کے ہاں رہن ہو گئے تو ایک دن محمود صاحب نے بڑی خوشی سے اپنے موکل کو یہ خوش خبری سنائی "یو دو لچھمن سنگھ، مبارک ہو، تم کو سڑک پر پیشاب کرنے کے سنگین جرم سے رہا کیا گیا۔" لچھمن سنگھ کے زرد چہرہ پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی، جیسے مرنے والے کے چہرہ پر موت سے تھوڑی دیر پہلے دوڑتی ہے!

لچھمن سنگھ کی آنکھ پر ڈاکٹر زیدی نے اپنا تمام کمال فن اچھی طرح صرف کیا اور اپنے مکتب کی ہر الٹی سیدھی دوا۔ لیپ۔ کھانے کی گولیاں، لگانے کی

گولیاں، سونگھنے کی گولیاں، آنکھ کا آلہ، کان کا آلہ بجلی کی روشنی، سرخ، سفید، سبز، موٹی عینک، پتلی عینک، توتیا، پارہ، سنکھیا الغرض تمام الم غلم اس کی آنکھوں میں جھونک کر اپنی جیب گرم کرتے رہے، اکثر شکار کے بہانے ہفتوں اس کے مکان پر جا کر کبوتر، بٹیر، گھی، دودھ، گنے کا رس وغیرہ کھاتے پیتے رہتے اور جب چلنے لگتے تو ان چیزوں کو باندھ کر ساتھ بھی لیتے آتے۔ ان تمام لوٹ مار کے بعد بھی ان کا جی نہ بھرا تو اس کے آنے جانے کے ٹٹو پر اپنے صاحبزادے کو سوار کر کے کہنے لگے "بھائی لچھمن سنگھ، منے کو ٹٹو بہت پسند آگیا ہے وہ دیکھو کیسا بھگائے پھرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تمہارے ٹٹو جیسا نیک جانور میں نے اس دفعہ چھتر کے میلے میں بھی نہیں دیکھا ورنہ اسے ضرور خرید لیتا۔" یہ کہہ کر اپنے منے کو ٹٹو سواری کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر جب لچھمن سنگھ نے جانے کو کہا تو منے کو بلا کر اترنے کا حکم دیا۔ منا ایک جہاندیدہ اور تعلیمیافتہ گھاگ تھا! رو پڑا، مچل گیا، گھوڑے کی ایال پکڑ کر لٹک گیا مگر اس کی پیٹھ سے نہ اترنا تھا نہ اترا۔ ڈاکٹر زیدی بہت بگڑے، سرخ ہو کر کانپنے لگے، مارنے کی دھمکیاں دینے لگے مگر ان کا ننھا ستمہ پیرے کی طرح ٹٹو کی زین پر چپکا رہا، آخر مجبور ہو کر لچھمن سنگھ سے ڈاکٹر زیدی نے کہا "بھائی منے کو ٹٹو بہت پسند آگیا ہے، وہ اس سے اترنے کا نام نہیں لیتا۔ اسے تم ہی کچھ اس ضدی لڑکے کے حال پر رحم کرو۔ کل تک یہ بہل جائے گا تو تمہارا ٹٹو واپس کر دوں گا۔ نہیں تو جو دام مانگو گے وہ دے دوں گا۔" قصہ مختصر وہ ٹٹو زیدی صاحب کے اصطبل میں رہا اور ان کا ننھا آج تک نہیں بہلا۔ اس لئے مجبور ہو کر ڈاکٹر زیدی نے ٹٹو کی قیمت اپنی فیس میں منہا کر دی۔

لچھمن سنگھ کی آنکھیں زیدی صاحب کی قابلیت کا تختۂ مشق بنتی رہیں حتیٰ کہ جب اس کی آنکھوں سے بینائی کے جانے کی باری آئی تو وہ گھبرا کر میرے پاس آیا۔ معمولی مرض نے خوفناک صورت اختیار کر لی تھی۔ بڑی مشکلوں سے بعد کوئی دو ہفتہ کے مسلسل علاج سے وہ اچھا ہو کر اپنے گھر لوٹا۔ وہ خود اپنی زبان سے آپ بیتی سناتا رہا۔ معاذ اللہ سفید لباس میں بھی بھیڑیئے ہوتے ہیں جو معصوم بھیڑ کو دن دہاڑے، راہ چلتے چٹ کر سکتے ہیں۔ میں نے یہ قصہ تم کو اس لئے سنایا تھا کہ خواہ مخواہ سنکر تم کو رنج ہوتا۔ اور اپنے ایک عزیز کی طرف سے تمہارے دل میں برے برے خیالات آتے۔

میں بیٹھا تھا کہ خط لکھ کر تم کو اپنا ماجرائے دل سناؤں مگر سخن گسترانہ بات کچھ ایسی آپڑی کہ کہنا پڑا۔ بہت کافی وقت ہو گیا، سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔ فقط (تمہارا)

---

(۲۷)

رانچی

۱۵ نومبر ۳۶ء

میری وجہ سکون و اضطراب!

اسی شہر میں رہ کر اور تم سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی کوئی ایک ہفتہ سے تمہاری صورت کو ترس ہو گیا ہوں۔ نہ جانے اس ہفتہ کا آغاز کیسی منحوس ساعت میں ہوا تھا کہ غم روزگار کے بکھیڑوں سے ایک گھڑی کے لئے بھی مہلت نہ ملی۔

مگر اس سے یہ سمجھنا کہ تمہارے خیال سے غافل رہا۔ جہاں گیا، جو کچھ کرتا رہا تمہاری تصویر مجھ سے آگے آگے رہی اور سوتے جاگتے، ہر حال میں میری ہمدم و دمساز رہی آج بارے سانس لینے کی اجازت ملی ہے اور یہ خط، نہیں، تم سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔

آج صبح سے جی بہت بے قرار ہے۔ کسی بات میں جی نہیں لگتا۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ خوب رو کر اس کی بھڑاس نکالوں۔ دل کو ہزاروں طرح سے سمجھا رہا ہوں اس کے لئے نئے نئے مشغلے نکال رہا ہوں مثلاً چائے پی، ٹہلا۔ سگریٹ پی، ریڈیو بجایا۔ کتابوں کی ورق گردانی کی مگر جو اضطراب تھا وہ اپنی جگہ پر اٹل ہے، مجبور ہو کر تمہاری وہ تصویر نکالی جو کبھی تمہارے البم سے کھو گئی تھی (یا نہ آیا؟ اس چوری کی معافی چاہتا ہوں) اور اس کے آگے سربسجود ہو کر خوب رویا، آخر یہ یا کہ نقاہت سی محسوس ہونے لگی۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ آنسوؤں کے امنڈتے ہوئے سیلاب بھی میرے دل کی جلن مٹانے سے مجبور رہے۔

اب آؤ، اس بے چینی اور اضطراب کو بہلانے کے لئے ایک نئی بحث چھیڑتا ہوں۔ کبھی تم نے یہ غور کیا ہے کہ محبت کیا چیز ہے اور اس میں ایسی دیوانگی کیوں طاری ہو جاتی ہے؟ کیا میری اس حالت کو دیوانگی نہ کہو گی کہ مجھے اس علم کے باوجود کہ میں تمہارا اور صرف تمہارا ہو چکا ہوں، تم کو بھی مجھ سے تھوڑی سی دلچسپی ہو گئی ہے اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو جلد ہی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جائیں گے مگر پھر بھی روتا ہوں، سر پھوڑتا ہوں اور ہر گھڑی بے قرار رہتا ہوں۔

محبت شاید ایک قسم کا شدید دماغی دورہ ہے یا خلل ہے جو ہر وقت مطلوب

کو اپنے دھیان میں رکھنے کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔ دماغ کے دو حصے ہیں۔ شعوری اور تحت الشعوری۔ پہلا حصہ ہمارے حواس خمسہ کے لائے ہوئے احساسات کو محسوس کرتا ہے اور اس حصہ میں جو احساسات ہوتے ہیں ان کو ہم محسوس کرتے دوسرا حصہ اس سے مختلف ہے، یہ پہلے حصہ کے قبضہ میں رہتا ہے اور اس کے اندر جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارے حواس خمسہ کی راہ جاتے ضرور ہیں مگر ان کے وجود یا عدم وجود کی ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ دماغ کے تحت الشعوری حصہ میں صرف وہی احساسات جا سکتے ہیں جو ہر وقت عالم ہوش و حواس میں ہم پر طاری رہتے ہیں۔

اگر کسی وجہ سے دماغ کا شعوری حصہ خاموش ہو جائے، مثلاً عالم خواب میں، یا کسی منشی شے کے زیر اثر تو دماغ کا دوسرا حصہ کام کرنے لگتا ہے اور اپنے اندر جو کچھ احساسات جمع رکھتا ہے اسے باہر کھینچنے لگتا ہے۔ چنانچہ ہسٹریا کے مرض میں عورتوں کے دماغ کا یہ دوسرا حصہ کام کرتا ہے جب ہی ہم ہسٹریا کے جاہل مریض کو کبھی مصری لہجہ میں قرآن خوانی کرتے سنتے ہیں اور کبھی انگریزی میں گٹ پٹ کرتے دیکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مریضہ اپنی زندگی میں کبھی کسی قاری کو مصری لہجہ میں قرآن خوانی کرتے سن کر کافی مرعوب ہوئی تھی یا اس کو یہ آسمانی لہجہ بہت پسند آیا تھا۔ جب ہی یہ آہستہ سے دماغ کے دوسرے حصہ میں چپکے سے داخل ہو گیا۔ جس کا احساس مریضہ کو سالہا سال تک نہ ہوا مگر مرض کی وجہ سے جب دماغ کے شعوری حصہ کی گرفت زیر شعوری حصہ پر ڈھیلی ہو گئی تو اس نے اپنی ٹوپی کے اندر کا چھپا ہوا کبوتر اڑا دیا۔ تماشائی حیرت میں آ گئے اور گھبرا کر کہنے لگے یہ جن ضرور مصر کا باشندہ معلوم

ہوتا ہے ۔"

محبت میں مطلوب پر دھیان لگا رہتا ہے اور یہ دھیان آہستہ آہستہ دماغ کے زیر شعوری حصہ میں جا گھستا ہے اور جب یہ دماغ کے اس حصہ میں داخل ہو گیا تو یوں سمجھئے کہ محبت پختہ ہو گئی یعنی سوتے جاگتے ہر حالت میں مطلوب اپنا اثر قائم رکھتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عشاق اکثر غیر حاضر دماغ کے ہوتے ہیں یعنی ان کے دماغ کا غیر شعوری حصہ ہر گھڑی ان کے خیالات پر اپنا اثر ڈالتا رہتا ہے ۔ محبت اس درجہ ... پر پہنچ جاتی ہے تو پھر محبوب پر دھیان جمانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ محبوب خود بخود ہر وقت دل میں سمایا رہتا ہے اور اس کو تڑپاتا رہتا ہے ۔

محبت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے یا با الفاظ دیگر دماغ میں محبوب کے تصویر کو منقوش کرنے کے لئے دماغ میں ایک خاص قسم کی کمزوری یا خلل ہونا ضروری ہے وہ یہ کہ شعوری اور زیر شعوری حصوں کے توازن کو معمولی سے اثر سے بگڑنا چاہیئے وہ انسان جس کے دماغ کا پہلا حصہ بہت مضبوط ہے اور دوسرے کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لئے ہے وہ ذرا مشکل سے عاشق ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو وقتی طور پر محض دل بہلانے کے لئے مگر جس کے دماغ کا دوسرا حصہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہے وہ عاشق ہوتا ہے اور بری طرح اور ایک بار عاشق ہو کر پھر اس سے جانبر نہیں ہو سکتا ۔ معاف کرنا اگر میں کہوں کہ قسم اول میں تم آتی ہو اور قسم دوم میں میں ۔

خیال کرو کہ جنوری گذشتہ کی ایک شام کو جب میں نے پہلے پہل تم کو دیکھا تھا ۔ اسی وقت میرے دماغ کا زیر شعوری حصہ ماؤف ہو گیا تھا اور اس دن سے لے کر آج تک اسی کے زیر اثر ہوں ۔ اگر اس کا اثر بڑھا اور دماغ کے شعوری حصہ

کی گرفت ذرا کچھ اور ڈھیلی ہوگئی تو بس سمجھ لو، زیادہ دور نہیں، یہیں آنکے کے چڑیا خانہ میں امغنت داخل کرلیا جاؤں گا۔ گیارہ مہینہ سے مسلسل دماغ ہچکولے کھا رہا ہے۔ آخرش کب تک اور کہاں تک یونہی بید مجنوں کی طرح جھولتا چلا جائے گا۔ اور ایک تم ہو، ماشا اللہ، اس مدت طویل میں تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ جب جہاں تھیں اب بھی وہیں ہو، قطب صاحب کی لاٹ کی طرح مستحکم اور اٹل۔

بہت ہوا، محبت کی نفسیاتی خاصیت پر کافی الفاظ برباد کئے گئے، آؤ دیکھیں ہمارے شعرا اس کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔

شیفتہ
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے میں ہر دم لگی ہوئی

حالی
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

شوق قدوائی
ہم کو چھینے لئے جاتا ہے ہمیں سے کوئی

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے

لامعلوم
بیٹھے بیٹھے کیا جانیے ہمیں کیا یاد آیا

شعرا اثر کو محسوس کرتے ہیں مگر وجہ نہیں جاتے۔ اے کاش کوئی ایسی تدبیر معلوم ہوتی کہ اس کے اثر سے تلخی کم ہو جاتی تو پھر محبت ایسی جانگسل نہ ہوتی جیسی کہ اب ہے۔ فقط

(مشتاق ملاقات)

---

(۲۸)

رانچی

۲۰ نومبر ۱۹۳۶ء

میری روح حیات!

تم سے ملے ابھی صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ایک جگہ بیت گیا اور ابھی سے دوسری ملاقات کی گھڑیاں گننے لگا ہوں۔ میری حالت اگر ایسی رہی اور تمہاری جدائی میری زندگی کو اس قدر بے کیف بناتی رہی تو پتہ نہیں آگے چل کر میرا کیا حال ہوگا؟ تمہارے پاس سے اٹھ کر چلا آیا ہوں مگر دماغ کے ہر گوشہ میں وہی نقشہ جما ہے۔ اب تک تم کو مسکراتے دیکھ رہا ہوں، میری گرتی ہوئی صحت کے متعلق تمہارے ہمدرد جملہ کو سن رہا ہوں اور تمہاری وہ ہنسی، وہ ہنسی، جس میں جھینپ بھی اور شوخی اب تک میرے کانوں میں مدھر سنگیت کی طرح گونج رہی ہے۔ سنو، پیارا بیارا جگر اسی کیفیت کو کیسے مزے میں بیان کرتا ہے ؎

وہ کب کے آئے اور گئے بھی، نظروں میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

اس دفعہ تمہارے پاس سے واپس آکر ایک بات کا یقین ہوتا جاتا ہے اجازت ہو تو کہہ دوں ...... وہ یہ کہ اب تم معشوق بنی جاتی ہو، تمہاری ادائیں اور تمہاری وہ چاشنی بھری ظرافت، تمہاری، اپنے کو لئے ہوئے بے تکلفی اور تمہارا وہ کبھی آپ ہی آپ گنگنا کر سننے والے کا منہ چڑانا، الغرض میری نیلو، میری جان نیلو، کیا کہوں کہ تم ایک چیز ہوئی جا رہی ہو۔ ایسی چیز جو دل کو گدگداتی ہے اور آنکھوں کو مخمور

کرتی ہے۔ مگر سچ کہنا، تم تو بڑی نیک اور بڑی بھولی تھیں۔ یہ یک بیک تم میں اتنی ساری شوخیاں کہاں سے آگئیں کہ چشم بد دور بوٹی بوٹی تھرکنے لگی ہے اور زبان ہے کہ ہر گھڑی ظرافت کی ندیاں بہانے لگی ہے۔

تمہاری شوخیاں بھری ظرافت، ارے توبہ، یہ بلائے جان بن گئی ہے۔ یہاں زبان سے کوئی بات نکلی نہیں کہ تم لے اڑتی ہو اور اسے نیلا پیلا غبارہ بنا کر ہوا میں ایسا اچھالتی ہو کر سارے کمرہ میں رنگین بارش ہونے لگتی ہے اور وہاں جو کوئی ہوتا ہے رنگ میں نہا کر آتا ہے۔ تمہارا وہ بات بات پر روٹھ جانا اور پھر خود ہی من جانا، کبھی آنسو بہانا اور کبھی آنکھوں سے مسکرا دینا، کبھی نہایت بھولی صورت بنا کر ایسی تلخ بات کہہ دینا کہ کلیجہ چھلنی ہو جائے اور پھر خود ہی ہنسکر اسی انداز معصومانہ سے پوچھنا "کیا آپ نے میری باتوں کا برا مان لیا ہے؟" اور جب تم کو اپنے اس سوال کا جواب نہ ملے تو کہنا "میری جان کی قسم، خفا نہ ہوجیے، میں تو یونہی کہہ گئی تھی"
الغرض اب تم سراپا معشوق ہو، تمہاری کس ادا کو بھول جاؤں اور کس کو یاد رکھوں؟ تمہاری ہر چیز مجھے عزیز ہے خواہ وہ میٹھی ہو یا کڑوی۔

ان باتوں کی طرف سے میرا خیال پھر کر اپنے ان معصوم ارمانوں کی طرف جاتا ہے جن کو میں تمہاری موجودگی کی خوشی میں بھول جاتا ہوں، اب یہ مچل رہے ہیں، میرے سینے کے اندر وہ اودھم مچائے ہوئے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی یہ مچل کر کہتے ہیں کہ میں ان کو لادوں مگر یہ نہیں جانتے کہ ان کا لانا جوئے شیر کا لانا ہے ان کو بس اپنی فکر ہے اور اپنے تقاضوں کی شدت سے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ ان سے ہزار کہتا ہوں کہ بھائی، ذرا نچلے بیٹھو، تھوڑا سا صبر اور کرو، جہاں اتنا گذرا ہے

وہاں تھوڑا سا اور گذر جانے دو، وہ خود آکر تمہاری تسلی کریں گے، مگر یہ کیوں کسی کی سننے لگے، اپنی رٹ لگائے اپنی ضد پر قائم ہیں۔ مگر نیلو، ذرا سنو، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اگر تم وہاں چلی آؤ جہاں ہر شخص تمہارے لئے اپنی آنکھیں بچھائے کھڑا ہے تو اس میں تمہارا نقصان کیا ہے؟ دیکھو محبت ہاتھ باندھے لونڈی کی طرح کھڑی ہے ارمانوں نے محل سجا رکھا ہے، انکی روح استقبال کے لئے حاضر ہے۔ ہر طرف مسکراہٹوں کی رنگین کیاریاں لگی ہوئی ہیں۔ رنگ برنگے پھول کے تختے کھلے ہیں۔ نسیم سحر ہے پپیہوں کا نغمہ ہے، فضا مرتعش ہے اور ساعت نیک ہے۔ تم خراماں خراماں کیوں نہیں چلی آتیں کہ دنیا شانت ہو اور اس عالمگیر بے صبری کو سکون دوامی مل جائے!

ان دنوں میری زندگی ایک یادگار دور سے گذر رہی ہے جس کی ہر ساعت آنے والے زمانے کے لئے سنگ میل کا کام دے گی، ابھی جو بے تابیاں ہیں اور جو کچھ دل پہ گذرتا ہے وہ آئندہ چل کر، اگر سب کچھ حسب خواہ ہوا، یعنی آسمان نے موافقت کی تو، میرے لئے ایک رنگین خواب بنے گا۔ ہم ان خوابوں کی چلتی پھرتی اور بولتی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر خوب ہنسیں گے اور کہیں گے یہ کیسا بربری زمانہ تھا کہ اس کی ہر جھلک نیم وحشیانہ ہے، اف کیا یہ ممکن ہے کہ ہم پر کبھی ایسا کٹھن زمانہ گذرا تھا جب بے تابیوں کی جابرانہ حکومت تھی جس کے بوجھ کے نیچے دل ہر گھڑی ماہی بے آب کی طرح تڑپا کرتا تھا؟ نہیں! نہیں! ہم ایسے کبھی نہ تھے، یہ تصویریں کسی اور کی ہیں"۔ اچھی نیلو، کیا تم کبھی میرے ساتھ مل کر ان تصویروں کو دیکھو گی یا صرف مجھے تنہا ان تماشوں کو دیکھنا پڑے گا؟ اگر ایسا ہے تو خدا سے بس ایک دعا ہے کہ وہ مجھے اس

وقت تک بقید آب وگل نہ رکھے کہ ان تصویروں کو دیکھوں اور گذرے ہوئے زمانے کی یادگار باتوں کو یاد کر کے اپنی روح کو اذیت پہنچاؤں

اب رات کے بارہ بج گئے، سردی ہر لمحہ تیز ہوتی جارہی ہے۔ رات کی سیاہ چادر نے دنیا کو چھپا کر نہ جانے کہاں غائب کر دیا۔ اب ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ اور کہیں بہت دور گیدڑ بول رہے ہیں، رات کی اس اداسی کو دیکھ کر دل بیٹھا جارہا ہے، چالیس گھنٹے اور ہیں ایک بار پھر اپنی مورتی کو اپنی آنکھوں کے سامنے لیے اس کی پوجا کروں گا۔ اچھا بس اتنی سی دیر کے لئے رخصت چاہتا ہوں۔ شب بخیر۔ (چشم عنایت کا امیدوار)

---

# (۲۹)

رانچی

۲۴ نومبر ۳۶ء

میری آرام جاں! خوش رہو

پرسوں جب تمہارے ہاں سے واپس آرہا تھا تو راستہ میں ڈاکٹر زیدی سے ملاقات ہو گئی، مجھے دیکھ کر ہنسنے لگے اور مزاج پرسی کے بعد خود ہی کہنے لگے بیچارے وکیل صاحب بڑے پھنسے ہیں ظالم مدعی نے عجیب عجیب بیڈھب گواہ ڈھونڈ نکالے ہیں مثلاً جیسا کہ وہ بیان کرتی ہیں، دو تانگے والے ہیں جو اکثر ان صاحبان کو سیر کرانے کے لئے، رات کے وقت شہر سے بالکل باہر لے جاتے تھے اور گھنٹوں ان کے انتظار میں ٹھہرے رہتے تھے۔ شہر کے امپیریل سینما کا منیجر بھی اس بات کا گواہ

ہے کہ محمود صاحب نے اکثر تنہا صرف زرینہ بیگم کے ساتھ دوسرا کھیل بکس میں بیٹھ کر دیکھا ہے۔ کلکتہ کی ایک دوکان سے محمود صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو آڈر مہیا کئے ہیں جن میں خاص رنگ اور کنارے کی ساریاں اور جمپر کا آڈر ہے۔ اور کلکتہ کے اس فرم نے ان ساریوں اور جمپروں کو زرینہ بیگم کے پتہ پر روانہ کیا تھا۔ زرینہ بیگم نے اپنی ایک نوکرانی چمیلی کا نام بھی گواہوں میں درج کرایا ہے۔ جس نے اپنے کانوں سے محمود صاحب کو شادی کا وعدہ کرتے سنا ہے خیر" یہ کہہ کر زیدی صاحب نے اپنی گھنی مونچھوں پر انگلیاں پھیر کر مجھ سے کہا "ڈاکٹر صاحب کچھ سگریٹ وگریٹ نہیں ہے، میں آج اپنی ڈبیہ لانا بھول گیا ہوں۔"

میں نے اپنے سگریٹوں کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھا کر کہا "ارے، کوئی حرج نہیں، یہ سگریٹ حاضر ہیں، شوق فرمائیے اور اگر منظور ہو تو یہ ڈبیہ آپ کی خدمت میں پیش ہے" زیدی نے سگریٹ کی ڈبیہ ہاتھ میں لے کر اپنی تھوک بھری ہوئی زبان سے اپنے موٹے لبوں کو بھگویا، پھر ایک سگریٹ نکال کر اسے سونگھا اور اس کے ایک سرے کو تھوک سے بھگو کر اپنے چوڑے دہانے کے بائیں کونے میں پھنسا لیا اور اپنے خالی ہاتھ کو ہوا میں ادھر ادھر اچھالا۔ پھر ان سے اپنی جیبوں کو ٹٹول کر نگاہ تجسس سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گھبرا کر جھٹ اپنی جیب سے دیا سلائی نکال کر ان کی طرف پیش کی اور معذرت خواہ ہو کر بولا "معاف کیجئے، یہ ہے دیا سلائی" انہوں نے دیا سلائی کے بکس پر اس کی ایک تیلی کو ترچھی طرف سے مار کر جلایا اور فوراً اُبھرتے ہوئے شعلہ کو اپنے دونوں ہاتھوں کے آدھ کھلے پنجوں سے ڈھانک لیا کہ ہوا کے جھونکوں سے یہ جلتی ہوئی تیلی بجھ نہ جائے

یہ تمام کارروائی انہوں نے بڑی ہوشیاری اور خوبصورتی سے کی جوان کے کہنہ سگریٹ پینے اور سلگانے کی عادت کا پتہ دیتی تھی۔

سگریٹ کا ایک ؟ باکس لے کر اطمینان کا سانس لیا، پھر فرمانے لگے ''گولڈ فلیک مجھے گھٹیا قسم سگریٹ معلوم ہوتا ہے، میں صرف ۵۵۵ پیتا ہوں'' یہ کہہ کر سگریٹ کی ڈبیہ اور دیا سلائی کے بکس کو نہایت آہستگی اور غیر محسوس طریقے سے اپنی جیب میں ڈال کر گویا ہوئے ''خیر زینت بیگم کے لائے ہوئے گولڈ فلیک کو تو پیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن .... لیکن !'' ڈاکٹر زیدی سگریٹ سے پورا لطف لینے کے لئے اس کے دھواں سے اپنے سوکھے ہوئے گالوں کو مینڈک کی طرح پھلا اور پچکا رہے تھے، سرور سے ان کی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں جن میں موٹے موٹے لال ڈورے ہر گھڑی جھلکتے رہتے ہیں، بند ہوئی جا رہی تھیں اور ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ ان کی پھولی ہوئی پلکیں بوجھل ہو گئی ہیں اور عنقریب اپنے وزن کو سنبھال نہ سکیں گی اور جھپک کر ان کی آنکھوں کو موند دیں گی۔ لطف و سرور کے عالم میں چونکہ گھبرا کر بات نہیں کی جا سکتی اس لئے ڈاکٹر زیدی نے خود بخود غیر ارادی طور پر مدبرانہ لہجہ گفتگو اختیار کر لیا تھا اور آہستہ آہستہ سگریٹ کے دھوئیں کو پائپ کے باریک سے شگاف سے خارج کر کے گمبھیرے میں کہنے لگے ''چلئے کیونکہ نہایت سنگین ... و سیاسی معاملات پر رائے زنی کر رہے ہیں، لیکن زینت بیگم کے پیش کئے ہوئے محمود صاحب کے خطوط کے بارے میں کیا رائے ہے وغیرہ ..... ان کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا اس کام کے لئے پنڈت جی الہ آباد.... مگر نہیں خیر کچھ نہیں !''

ڈاکٹر زیدی الہ آباد کو پوری طرح ادا نہ کرسکے تھے کہ ایک دم جیسے لطف و سرور کے خواب سے چونک پڑے۔ ان کی لال لال خونخوار آنکھیں بوجھل پلکوں کی اوٹ سے باہر نکل آئیں اور ان میں پھر جستجو اور کرید کی جھلک پیدا ہوگئی جیسے وہ اپنی کہی ہوئی باتوں کا اثر میرے چہرہ پر ڈھونڈ رہے ہوں، سگریٹ کے سرور میں وہ بہت کچھ کہہ گئے تھے مگر شاید فوراً ان کو یہ خیال آیا کہ سننے والا ان کے ترکون سے باہر کا آدمی ہے، اس لئے سنبھل گئے اور غیر ضروری باتوں پر آئے مثلاً "یہ کہاں جا رہے ہیں"، "یہ موسم اچھا ہے" وغیرہ وغیرہ پھر دفعتاً بغیر کسی سان گمان کے یہ کہتے ہوئے چل دئے "ارے میں بھول گیا، راجہ شیر دیال کے لڑکے کی حالت بہت خراب ہے اور مجھے دیکھنے کے لئے بلایا ہے، وہیں جا رہا ہوں" زیدی صاحب کو جھوٹ بولتے وقت شاید یہ یاد نہیں رہا کہ راجہ صاحب کے صاحبزادے ہمارے کلب کے ممبر ہیں اور آج شام کو میں نے ان کے ساتھ ٹینس کے دو سٹ کھیلے ہیں۔

میں نے ٹینس کے بعد جب کمار صاحب سے ہنستے ہوئے پوچھا "میں نے سنا تھا کہ آپ سخت بیمار ہیں اور آپ کی خدا نہ کرے، بڑی حالت خراب ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ آپ ماشاءاللہ بھلے چنگے خوب چست ہو رہے ہیں" کمار صاحب مرجھاں مرنج قسم کے رئیس ہیں، میری بات پر پہلے خوب اظہار حیرت کیا پھر پوچھنے لگے "وہ ابدولت کی شان میں یہ کون تھا جو ایسی گستاخی کر سکتا ہے؟" میں نے ذرا معصوم بن کر کہا "ڈاکٹر زیدی" وہ خوب ہنسے، خوب ہنسے اور اسی خوشی میں بیرے کو وسکی اور سوڈا لانے کو کہا مگر جب میں نے کہا میں اس نعمت سے محروم ہوں تو اور ہنسے اور حیرت سے میری طرف دیکھا جیسے میں کوئی گنوار ہوں جو شراب

نہیں پیتا۔ آخر بڑی حجتوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ایک میز پر بیٹھ کر وہ شراب پئیں اور میں وِمٹو!

کمار صاحب نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ شاید ڈاکٹر زیدی سے واقف نہیں جب ہی ان کی باتوں کا اعتبار کر لیتے ہیں۔ مجھ سے سنئے کہ وہ کون ہیں۔ میں ان کو کلکتہ سے جانتا ہوں۔ یہ کلکتہ کی ایک کمپنی کے دورہ کرنے والے ایجنٹ تھے اور مال دکھا کر آڈر لیتے تھے، چمڑہ کا سامان، مگر مچھ، کتا، بلی، الغرض ہر جانور کا چمڑہ لیتے اور فروخت کرتے تھے۔ ان کو اپنے دورہ میں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ کسی رقم کی پیشگی وصول کریں مگر یہ وصول کرتے تھے اور جمشید پور میں ایک فرضی نام کی کمپنی قائم کر کے اس کے نام ادھار مال منگوانے لگے۔" کمار صاحب نے یہ کہہ کر شراب کا ایک گھونٹ لیا۔ سلک کے رومال سے پہلے اپنا منہ پھر پھولے پھولے گالوں کو پونچھا اور اپنے قصہ کے آنے والے پرلطف واقعات کو سوچکر ہنسنے لگے جس سے ان کی موٹی تونددان کی ران پر دھری ہوئی ہلتی ہلنے لگی۔

جب جی بھر کر ہنس چکے اور شراب کا ایک اور گھونٹ لے چکے تو گویا ہوئے۔ "ڈاکٹر صاحب اس جعلی فرم نے مال منگوانا شروع کیا اور مہینہ مہینہ اپنا حساب صاف کرنے لگا۔ کلکتہ والوں کو اس فرم پر اعتبار آگیا اور ایک دفعہ اکٹھے پچاس ہزار کا مال بھیجدیا۔ بس اس دن سے لے کر آج تک وہ فرم لاپتہ ہے، مگر خفیہ پولیس والے کب چپ بیٹھتے، انہوں نے مکمل پتہ لگا لیا کہ یہ جناب زیدی صاحب کی کارستانیاں ہیں۔ ان کا چالان ہوا اور تین سال کی قید بھگت آئے۔"

راجہ صاحب نے اپنی چوڑی چکلی کرسی پر پہلو بدلا اور ان کی تونددان

کی رانوں پر دھری لگتی اب کرسی پہ آگئی، پتلون کمر اور پیٹ میں چبھ کر پیوست ہوگئی تھی، اس کو ڈھیلا کیا اور اس کے چند بٹن کھول ڈالے، اس سے قدرے سکون ہوا تو ایک لمبا سانس لے کر اظہار اطمینان کیا۔ شراب کا ایک گھونٹ لیکر اپنے ۵۵۵ کے ٹن سے ایک سگریٹ نکال کر خود لیا اور دوسرا میری طرف بڑھا کر بولے "جب زیدی صاحب کے لئے کلکتہ جیسا بڑا شہر منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تو وہاں کسی مہمل بازاری دوکان سے الٹا سیدھا ہومیوپیتھک کا سرٹیفکیٹ لے کر ایک رات کر انچی پہنچے اور یہاں اپنا مطب جما لیا" میرے تایا جی کو ان دنوں ہومیوپیتھک علاج پر اعتقاد تھا، ان کے مصاحبوں نے ڈاکٹر زیدی کی آمد کی خبر دی اور یہ ایک دن راجہ صاحب کے ہاں جانے لگے۔ خیر علاج تو یہ کیا کرتے، راجہ صاحب کی خوشامد میں رہنے لگے اور ان کی شکار پارٹیوں میں جانے لگے۔ آہستہ آہستہ راجہ صاحب کے تمام شکاری کاروبار کا ان کو افسر بنا دیا گیا" کمار صاحب پھر ہنسنے لگے اور مجھے چھیڑنے کے لئے سوال کیا "ڈاکٹر صاحب آپ سمجھے یہ شکاری کاروبار کیا بلا ہے؟" میں نے جواب دیا "یہی شکار کے متعلق جانوروں جنگلوں اور بندوقوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت وغیرہ" اب کمار صاحب کی ہنسی فلک شگاف ہوگئی، خوب ہنسے اور ان کی ہنسی کے ساتھ ان کے جسم پہ چھائی ہوئی چربی کے لوتھڑے جگہ جگہ سے ہلنے لگے۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اگر نہ ہنستا تو دل میں کہتے ڈاکٹر بڑا خشک انسان ہے کہ ہنسی میں بھی میرا ساتھ نہیں دیتا۔

جب ہنسی سے کچھ سکون ملا تو کمار صاحب نے شراب کا پھر ایک گھونٹ لیا۔ ہلکے سے دوسرے رومال سے اپنا منھ پونچھا اور مجھ پر معنی خیز نگاہ ڈال کر بولے

"ہم جیسے رئیسوں کے یہاں دو طرح کے شکار ہوتے ہیں۔ ایک دن کا اور دوسرا رات کا۔ ایک جانوروں کا اور دوسرا جوان عورتوں کا۔ زیدی صاحب ان دونوں قسموں کے شکار کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے تھے اور کچھ دنوں تک اپنے محکمہ کا کام بڑی جانفشانی سے کرتے رہے۔ نئے نئے جنگلوں کا پتہ لگانا، پھر ان میں دریافت کرانا کہ جانور ہیں یا نہیں اگر ہیں تو کس قسم کے اور کتنے۔ جنگلوں میں مچان بندھوانا، ہانکا کرانا اور راجہ صاحب سے کبھی شیر، کبھی تیندوا اور کبھی لگڑ بگڑ وغیرہ پٹوا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور رات کے شغل شکار کے لئے بھی یہ بہت کچھ مہیا کرتے تھے اور ہندوستان کے ہر بڑے شہر کے بالاخانوں پر ان کی رسائی تھی جہاں سے یہ چیدہ تحفے راجہ صاحب کے لئے لاتے اور راجکمار صاحب نے ہنس کر جملہ پورا کیا وہ کبھی کبھی میرے لئے بھی۔ یہ زمانہ زیدی صاحب کی بہار کا زمانہ تھا۔ جب راج نواس میں ان کی طوطی بولتی تھی مگر کب تک؟ رفتہ رفتہ ان کی طبیعت کی خباثت رنگ لانے لگی، گھر بیٹھے تنخواہ لینے لگے۔ کبھی آتے اور کبھی نہ آتے، "تحفے" لانے کے بہانے مہینوں ادھر ادھر کی سیر کرتے پھرتے اور اب تحائف میں بھی دھوکہ بازیاں کرنے لگے مثلاً کسی سوختہ لن کو ہیرو منڈی سے بلا لاتے اور کہا "یہ مدراس کے کالے انگور ہیں، بڑے خوش ذائقہ اور اتنے مہنگے بھی نہیں صرف پانسو روپیہ ہیں۔"

کمار صاحب کہتے گئے "راجہ صاحب کا دل ان کی طرف سے کھٹا ہو گیا اور ایک دن اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان کو پرانے جوتوں سے خوب پٹواؤ اور "راج نواس" کے پاخانہ میں رات بھر بند رکھو۔ صبح ان کو پاخانہ سے نکلوا کر ان کے منہ میں گھوڑے کی لید اور تھوڑا سا کھینس کا پیشاب ڈلوا کر راج نواس

کے چھوٹے پھاٹک سے باہر کرا دیا۔ ان کے نکالے جانے کے بعد اسلحہ خانہ کا جائزہ لیا گیا تو کتنے بارہ بندوق اور رائفلیں غائب تھیں، جرم نہایت سنگین تھا، نالش دائر کی گئی تو یہ حضرت بلبلاتے ہوئے بھاگ آئے، جو بندوق اور رائفلیں غائب کی تھیں ان کو واپس کیا اور معافی مانگنے لگے۔ پتا جی کو بڑا غصہ تھا۔ کہنے لگے "ہم یوں معاف نہ کریں گے جب تک کہ کان پکڑ کر میرے سامنے سات سو بار اٹھو بیٹھو گے نہیں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے کان پکڑ کر ایک پاؤں پر بھاگتے ہوئے میری نظر سے باہر نہیں چلے جاؤ گے۔" مرتا کیا نہ کرتا، کان پکڑ کر اٹھے بیٹھے اور کان پکڑے ہوئے ایک پاؤں پر اچکتے ہوئے بھاگ نکلے، اس دن سے کبھی "راج نواس" میں قدم نہیں رکھتے مگر جہاں راستہ میں مل جاتے ہیں تو سلام ضرور کر لیتے ہیں"

راجکمار صاحب نے اس قصہ کو کافی لطف لے کر سنایا اور اس دوران میں وہ شراب کے دو گلاس پی چکے تھے جس کا اثر ہونے لگا تھا اور ان کا سیاہی مائل بادامی رنگ شراب کی تمازت سے دمکنے لگا تھا، قصہ ختم کرنے کے بعد اپنے ہاتھ کے پنجہ سے میز پر ایک دھول رسید کی جس کی دھمک سے میز پر رکھے ہوئے شیشے کے ظروف چھنکنے لگے اور ان کی مخروطی انگلیوں میں میرے جواہرات کی متعدد انگوٹھیاں جھلمل کرنے لگیں یہ ایک لمبی آہ کے ساتھ اپنی چرچراتی کرسی پر سے اٹھے، پہلے کلب کی گھڑی کو دیکھا پھر اپنی سوجی ہوئی کلائی کی پلیٹنم گھڑی پر نگاہ اور ہنستے ہوئے اپنے رولس میں جا بیٹھے۔ ان کے دو ملازم جو ان کے ساتھ ساتھ کرانا کاتبین کی طرح تھے وہ اپنا سامان مثلاً سگریٹ کے ٹن، پانوں کی ڈبیہ ٹینس کا بلا، میوزک کے بڑے چھوٹے تولیے، آئینہ، کنگھا، برش، بوڈی کولون اور

لیونڈر کی شیشیاں، چاندی کے خلال، تھوک دان وغیرہ موٹر میں لاد کر خود خود خاموشی سے پیچھے بیٹھ گئے، میں اخلاقاً ان کو موٹر تک چھوڑنے گیا، انہوں نے موٹر اسٹارٹ کیا، رولس نے غرّا کر نہایت ہلکے اور مدھم سروں میں اپنا ستار بجانا شروع کیا، راجکمار صاحب نے اپنے ہلکے آسمانی رنگ کے گول فیلٹ ہیٹ کو ترچھا کر لیا جس کے بیچ ان کا گول مٹول چہرہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہالہ کے اندر زحل کا کرّہ، پھر میری طرف مسکرا کر گاڑی کو آگے بڑھایا اور رو زرا بن کر کہا "چھارو"۔

ارادہ کیا تھا کہ خط میں اپنا ماجرائے دل لکھوں گا۔ پرسوں کی ملاقات سے جو نئے جذبات ابھر آئے ہیں ان پر تبصرہ کروں گا مگر میں کچھ سوچتا ہوں اور یہاں ہوتا کچھ اور ہے۔ کہاں حدیث محبت اور کہاں ڈاکٹر زیدی کی کہانی؛ میں بھی کتنا فضول بکواس کا عادی ہو گیا ہوں مگر میری یہ کمزوری صرف تمہارے ساتھ ہے۔

میں نے اپنے طویل خط کے عذر میں کچھ وجوہات بیان کئے تھے۔ اگر تم بھول گئی ہو تو پھر سنو کہ خط لکھتے وقت میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تم سے گفتگو کر رہا ہوں اور یہ تسکین میرے لئے سب کچھ ہے، یہی میرے طویل خطوط کی محرک ہے۔ مگر میرے لمبے خط تم پر بار نہیں ہوتے تو پھر بلا وجہ میں اس خیال سے کیوں پریشان ہوں؟ اچھا خدا حافظ۔

(تمہارا اور صرف تمہارا)

..............

رانچی
۲۰ نومبر ۳۶ء

میری تعبیر خواب!

دنیا کے جھمیلے کسی دم چین نہیں لینے دیتے۔ سورج نکلتا ہے تو پریشانیوں کا سندیسہ لے کر، ڈوبتا ہے تو اسی قسم کا کوئی تحفہ کل کے لئے چھوڑتا جاتا ہے۔ الغرض یہ رات دن کے چکر میں پڑ کر پس جانے کا نام شاید زندگی ہے اور اگر یہی زندگی ہے تو بڑی ہی بی کو میرا دور سے سلام ہے۔ روز بلاناغہ، جب کبھی تھوڑی سی مہلت ملتی ہے تو ارادہ کرتا ہوں کہ تمہارے ہاں جاؤں مگر عین اسی وقت کوئی نہ کوئی آدھمکتا ہے اور اپنے دکھ درد، جاڑہ بخار کی بپتا سنا کر مجھے خود بیمار کر دیتا ہے۔ اس درمیان میں تمہارے دو خط آئے، دونوں کو میں نے اپنے دل کے قریب رکھ چھوڑا ہے کہ فرصت کے وقت جی بھر کر پڑھوں گا۔ اتنا پڑھوں گا کہ نظر کی خراشوں سے ان کے حروف دھندلے پڑ جائیں گے مگر وہ سبھ گھڑی اب تک نہیں آئی اور تمہارے وہ خطوط اب تک پڑے دل کے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔

ان خطوں میں میرے نہ آنے کی شکایت، اف کیا کہوں کہ تمہارے ان جملوں کو بارہا دل میں دہراتا ہوں اور قند مکرر کے مزے لیتا ہوں "وہ آپ نہ جانے کیوں نہیں آتے، روز انتظار دیکھتی ہوں، کریم سے رہ رہ کر دریافت کرتی ہوں مگر کوئی کچھ نہیں بتاتا کہ آپ کیوں نہیں آتے، آپ کو میرے سر کی قسم، کیا آپ مجھ سے غصہ ہیں" میری جان، میں اور تم سے غصہ، جسم اور روح سے بدگمانی

کرے کیا یہ کبھی ممکن ہے۔ بفرض محال اگر حماقت میں اس قسم کا کوئی غصہ کیا بھی جائے تو یہ کس کی جان پر پڑے گا؟ نہیں نہیں، تم تھوڑی دیر کے لئے بھی ایسا شک اپنے دل میں نہ ڈالو۔ پجاری اور مورتی کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ اس کو سنسار کی کوئی شکتی نہیں توڑ سکتی اس کا ٹوٹنا آکاش اور پرتھوی کی کشش کا ٹوٹنا ہے۔

تم نے اپنے ایک خط میں بڑی بے چین ہونے والی خبر سنائی کہ ۵ دسمبر کو تم مرشدآباد اپنے ماموں صاحب کے ہاں جا رہی ہو محض ملنے کے لئے ایسے ارادے اور پروگرام میں بولنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ جاؤ اور شوق سے جاؤ۔ مگر وہاں جا کر کسی کو بھول نہ جانا۔ تمہاری غیر حاضری میں یہاں کوئی بہت بے چین رہے گا اور تم کو دیکھنے کے لئے ماہی بے آب رہے گا۔ دیکھو وہاں زیادہ دیر نہ لگانا اور جلد پہنچکر اپنی خیریت کا خط لکھنا۔

میں انشاءاللہ کل ضرور شام کے ۵ بجے تم سے ملنے آؤں گا۔ کیا تمہارے بھائی صاحب کا کوئی خط آیا ہے، امید ہے کہ وہ آگرہ میں اپنا ریسرچ کا کام خوب جی لگا کر کر رہے ہونگے ان کو خط لکھو تو یہ یاد سے لکھ دینا کہ میں انشاءاللہ جلد از جلد ایک ضروری کام سے آگرہ جاؤں گا۔ خدا حافظ (تمہارا ہمیشہ سے)

---

(۳۱)

رانچی
۶ دسمبر ۳۶ء

میری جان نیلو!

کل جس وقت تمہاری گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ دل بیٹھ گیا اور سارے عالم میں اداسی ہی اداسی نظر آنے لگی میں پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے تیخ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور تمہاری گاڑی کے پیچھے چھوڑے ہوئے دھواں کو مسوستے ہوئے دل سے دیکھنے لگا جو آہستہ آہستہ ہواہیں مل کر میری حسرتوں کی طرح فنا ہو رہے تھے کچھ دیر بعد دھواں کا سیاہ دھبہ بھی مٹ گیا اور عظیم الشان آسمان کی نیلگوں چھت کے نیچے صرف میں رہ گیا اور ہوا میں اڑتی ہوئی چند ابابیلیں۔ اے کاش میں اڑ سکتا ان ابابیلوں کی طرح ..... کچھ دیر بعد تخیلات کی دنیا سے نیچے گرا، چونک کر دیکھا کہ آسمان بہت دور ہے اور پاؤں تلے کی زمین حد درجہ کرخت اور پتھریلی۔ کچھ بس نہ چلا اور چپ چاپ آ کر موٹر میں بیٹھ گیا، ڈرائیور نے مجھے گھر لا کر اتار دیا۔ وہی گھر، وہی کھڑکیاں اور دروازے، وہی زینہ اور برآمدہ، جی میں آیا ان سب کو نوچ ڈالوں، زمین بوس کردوں اور اینٹ سے اینٹ بجا دوں .... مگر پھر وہی مجبوری۔

اب شاید تم پہنچ گئی ہوں گی۔ خوب خوب ملاقاتیں ہو رہی ہوں گی، سیروں کا پروگرام بن رہا ہوگا، ایسا کیوں نہ ہو عرصہ کے بعد وہاں گئی ہو، تمہاری بہت سی پرانی سہیلیاں آ جائیں گی، ان کے ساتھ مل کر کھیل تماشے دیکھے جائیں گے تصویریں دیکھ کر ان کے ہیرو اور ہیروئن پر جملے چست کئے جائیں گے۔ قصہ مختصر دن عید کے اور راتیں شب برات کی ہوں گی۔ جہاں اتنی دلچسپیاں ہوں اتنے ہنسی خوشی کے سامان موجود ہوں وہاں ایک دور افتادہ، حرماں نصیب کی یاد کیوں آنے لگی ؟۔

مجھے دیکھو کہ جب سے گئی ہو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرصہ گذر گیا، کہیں اور کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ابھی تم اپنی منزل مقصود پہ پہنچی نہ ہوں گی کہ یہ خط جانے لگا۔ یہ خط مجھ سے اچھا ہے کہ پرسوں جا کر تم سے مل لے گا اور تم سے باتیں کرے گا مگر اس کا راقم اپنی کوٹھری میں پڑا اپنی دوری پر آنسو بہاتا ہوگا۔ خدا کے لئے جواب جلد دو اور ٹھیک ٹھیک لکھ کر بھیجو کہ کب آؤ گی؟۔

(تمہاری یاد میں بے چین)

---

(۳۲)

رانچی
۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء

میری جانِ جاں!

تمہارا خط تھا یا نوید بہار، آیا اور اپنے ساتھ پھولوں کی مہک اور کوئل کی کوک لیتا آیا۔ میں نے سمجھا گویا تم نے پھولوں کا تختہ اور نغموں کی جھنکار لفافہ میں بند کر کے مجھے بھیج دی ہے۔ تمہارے خط کے کاغذ کو کبھی سونگھتا ہوں۔ کبھی اسے اٹھا کر تکیہ کے نیچے رکھ چھوڑتا ہوں اور کبھی اسے پھول کی طرح گلدان میں لگا دیتا ہوں۔ یہ جہاں بھی رہتا ہے اپنی بھینی بھینی خوشبو سے میرے دماغ کو رشک ارم بنا دیتا ہے۔ رات میں نے اپنے کمرہ خواب کی پورب طرف والی کھڑکی پر اسے رکھ دیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ پورب کی طرف سے آنے والی ہوا کا ہر جھونکا عطر محبوب کی لپٹ لانے لگا اور میرے مشام جان کو معطر کرنے لگا۔

ہوا کے ان معطر جھونکوں نے مجھے تھپک کر سلادیا اور ایسے خوابوں کی دنیا میں
لے گیا جہاں میں نے دیکھا کہ ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلے ہیں اور ان کی بھینی
بھینی خوشبو سے فضا معطر ہے، اتنے میں دیکھا اک تیتری سبز رنگ کی آئی، کبھی اس
پھول پر بیٹھی اور کبھی اس پر اور ہر پھول سے اس کی تھوڑی تھوڑی خوشبو چرا کر
اڑی اور میرے سامنے ہوا میں آکر معلق ہوگئی، اس کی خوشبو سے میں مدہوش ہو کر
اس کے پیچھے بھاگا۔ یہ بھاگتی گئی اور اس کے پیچھے میں بھاگتا گیا، قریب تھا کہ میں
اسے پکڑلوں مگر دیکھا کہ تیتری غائب تھی اور اس کی جگہ تم دھانی جوڑے میں ملبوس
کھڑی تھیں۔ میں نے جھلا کر کہا۔ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ وہ تیتری کہاں گئی؟" تم نے
یہ سنکر ہنس دیا اس مترنم ہنسی کی لہروں میں پھول جھومنے لگے اور ان کی خوشبوؤں
کی لطیف ہوا میں تموج پیدا ہوگیا، تم نے کہا "آؤ پھولوں کی دنیا میں دوڑیں،
دیکھو ہر طرف پھول ہی پھول ہیں، کیسے اچھے اچھے خوشرنگ!" میں مست ہو کر بےخود
ہوا جا رہا تھا، پھولوں کی دنیا میں تم سب سے حسین پھول تھیں، معطر اور شاداب
میں تمہارے ساتھ مل کر دوڑنے لگا، ہمارے تلووں میں پھولوں کی پنکھڑیاں
گدگدیاں کر رہی تھیں، ان گدگدیوں سے ہمارے دل کپکپانے لگے تھے اور ہم چیخ
چیخ کر ہنسنے لگے تھے۔

پھر تم تھک کر پھولوں کے تختہ پر لیٹ گئیں۔ رنگ برنگے پھولوں نے اپنی گردنیں
اونچی کرلیں کہ تم کو دیکھیں، تم پھولوں کی پھٹی پھٹی سی حیرت و لطف آنکھوں میں
گھر کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ پھولوں نے تم کو اپنی گود میں لے کر
مجھ سے چھپا لیا تھا، میں رونے لگا، نرگس نے مجھے روتا دیکھ کر کہا "رو...

کیوں ہو۔ آؤ چلو، ہم مل کر ڈھونڈیں۔" ہم نے سارا باغ ڈھونڈ مارا، پھولوں کی پنکھڑیاں اٹھا کر دیکھیں، سبزہ کے نرم فرش کے نیچے دیکھا، شبنم کے موتی ہٹا کر دیکھے پکارا، آوازیں دیں مگر تم نہ ملیں، پھر تو میں دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ بیچاری نرگس کی آنکھیں بھی ہمدردی سے نم ہو گئیں!

مجھے روتے دیکھ کر بلبل کو رحم آیا، کہنے لگی "اجنبی، تو جس کے لئے روتا ہے اس کی تو مجھے خبر نہیں مگر ابھی ابھی میرے باغ میں دو نہایت شاداب پھول کھلے ہیں چل تجھے دکھاؤں، ان کو دیکھ کر میرا دل مچلا جاتا ہے اور کسی پھول میں دل نہیں لگتا۔" بلبل اڑ کر پھولوں کے تختہ پر جا بیٹھی اور کہا "دیکھو یہ ہیں۔" میں نے دیکھا، اف یہ تو تمہارے رخسار تھے، تازہ اور شاداب، سب پھولوں سے سندر اور رنگین میں نے تم کو جھنجوڑ ڈالا "تم کہاں تھیں۔ مجھ سے کیوں چھپ گئی تھیں؟" تم نے ہنس کر کہا "یہ لو اب میں مل گئی، میرے لئے پھول چن دو۔" پھولوں کی دنیا میں پھولوں کی کیا کمی تھی؟ میں نے تم پر اتنے پھولوں کی بارش کر دی کہ تم پھولوں سے ڈھک گئیں اور تمہارا سارا جسم پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا "چلو اب بادلوں پر بیٹھ کر دنیا میں لوٹ چلیں۔" تم بدستور پھولوں کے انبار کے نیچے دبی رہیں اور مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے کہا "شیلو، چلو اب دیر ہو گئی۔" پھر بھی تم نے جواب نہ دیا۔ اب میں بے چین ہو کر پھولوں کو ہٹانے لگا، اف تمہارا پتہ نہ تھا! میں بے قرار ہو کر پنکھڑیوں کو کریدنے لگا۔ دفعتاً دہی سبز رنگ کی تیتری پھولوں کے نیچے سے پھڑپھڑاتی ہوئی نکلی اور ہوا میں معلق ہو کر میرے چہرہ کے سامنے رقص کرنے لگی اس کے پروں سے پیدا کی ہوئی ہوا

کی جنبش میرے چہرہ پر محسوس ہو رہی تھی اور اس کی وہ تیز خوشبو میری ناک میں گھسی جا رہی تھی......

دفعتاً میری نیند کھل گئی، دیکھا کہ تمہارا خط کھڑکی سے اڑ کر میرے تکیہ پر آ پڑا تھا، اور اس کو جب ہوا چھیڑتی تھی تو وہ میرے لب اور منہ کو چھو رہا تھا! میری نیلو، مجھے معاف کر دو، میں نے یونہی چھیڑنے کے لئے اپنے گذشتہ خط میں تمہاری سیروں کا ذکر کر دیا تھا، مجھے تمہارے دل کا حال کیا معلوم کہ تم کو وہ جگہ قید خانہ معلوم ہو گی اور تم کو کسی پہلو چین نہ آئے گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میری بے قراری اس قدر رنگ لائے گی کہ تمہاری راتوں کی نیند اڑا لے گی۔ اور تم کو ستارے گننے پر مجبور کرے گی؟ مجھے اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہاں پہنچکر تم کو اپنی پرانی سہیلیاں بری لگنے لگیں گی اور ان کی باتیں زہر کا گھونٹ بن جائیں گی تو میں ایسی گستاخی ہرگز نہ کرتا اور ان کا حوالہ دے کر تم کو رنجیدہ کرتا۔

اگر دل کا ایسا حال ہو گیا ہے تو پھر ان سے واپس چلنے کو کہو۔ وہاں فضول وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ - یہاں رہ کر تم کم از کم بی اے کی تیاریوں کو مکمل کر لیتیں، وہاں جا کر سب کچھ بھول جاؤ گی جو اتنی محنت سے یاد کیا ہے۔ امتحان کا زمانہ بھی قریب ہوتا جا رہا ہے اور یہ قیمتی وقت ایسا نہیں کہ سیر و تفریح میں گنوایا جائے۔ میری سنو تو اپنی والدہ سے میرا سلام کہو اور کہو کہ اگر مرشد آباد چلنا تھا ہی ضروری ہے تو پھر تمہارے امتحان کے بعد چلی جائیں گی۔

تمہارے ان جملوں کا مطلب کچھ اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا "وہ یہاں جب سے آئی ہوں دل نہیں لگتا، رہ رہ کر ایک خیال آتا ہے کہ اب اس زندگی کو ختم کرنا چاہئے

مگر کس طرح ہستقبل تاریک ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ والدہ الگ جان کھائے جاتی ہیں کہ اپنی رائے سے ان کو جلد آگاہ کروں۔ میری کوئی رائے ہو تو دوں، اور اگر دیتی ہوں تو کسی کا کیا بھروسہ۔" میری نیلو، مجھے تمہارے مزاج کے تذبذب پر حیرت ہے۔ اگر تمہارا مطلب اس سے ہماری آئندہ زندگی کے متعلق ہے تو تمہاری رائے سب سے اہم ہے۔ بغیر تمہاری رائے کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنا فیصلہ آج نہیں عرصہ ہوا کہ تم کو سنا دیا ہے۔ میں نے اپنی ہر خوشی اور ہر تمنا کو تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے تم جس وقت مجھے حکم دو گی یا صرف اشارہ کرو گی بس سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔

تم جس دن جا رہی تھیں میں نے تمہاری والدہ سے دبے لفظوں میں اپنی تمناؤں کا ہلکا سا ذکر کر دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا "میری یہ انتہا خوش نصیبی ہو گی اور میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا مگر نسبتاً میری ایک عرض ہے کہ اس کے متعلق پہلے نیلو کی رائے لی جائے۔ میں ان کی مرضی کے بغیر ایک قدم آگے نہ بڑھاؤں گا۔" جانِ من سب کچھ غالباً ٹھیک ہے۔ تمہاری والدہ کے بشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ میری یہ عبارت ان کو ناگوار نہ گذری اور خودستائی اگر نہ ہو تو اتنا اور بڑھا دوں کہ وہ غالباً دل میں خوش ہوئیں۔ کیا تم مہربانی کر کے مجھے یہ بتا سکتی ہو کہ آخری خیال کہیں میرا صرف حسن ظن تو نہ تھا؟

جواب جلد دو اور اپنی خیریت لکھ بھیجو، اگر تکلیف نہ ہو تو اپنے کسی دن کا صبح سے شام تک کا روزنامچہ لکھ بھیجو۔ میں حسب وعدہ صبح کے آٹھ بجے اور رات کے نو بجے، پانچ منٹ کے لئے بالکل خاموش ہو کر تم پر دھیان جما لیتا ہوں۔

کیا تم نے اپنے اس وعدہ کو بھلا تو نہیں دیا؟ کل ٹھیک چار بجے میرا دل بہت بے چین تھا اور آنکھوں میں رہ رہ کر آنسو بھر آتے تھے۔ میری جان خیریت سے ہونا؟ (جواب کا منتظر)

---

(۳۴)

رانچی

۶ اوسمبر ۳۶ء

میری ویری!

کل ایک خط لکھ چکا ہوں، جو ابھی راستہ میں ہوگا، آج یہ دوسرا خط ہے، صرف اسلئے کہ بہت بے چین ہوں اور مطلق جی نہیں لگتا۔ کل کلب گیا مگر وہاں صرف برج ہے یا بلیرڈ، شراب کا دور ہے اور فضول بکواس کسی جگہ اور کسی کے ساتھ دل نہیں بہلتا اس لئے یہ تھوڑا سا وقت جو ملا ہے اسے تم سے باتیں کرنے میں گذار رہا ہوں۔ کل رات ۱۲ بجے سویا، صبح ۷ بجے اٹھا، چارپی کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا ہوں۔ جو کوئی آتا ہے اس کا حال پوچھتا ہوں، مرض کی تشخیص کرتا ہوں ادویہ لکھتا ہوں مگر خود کا یہ حال ہے کہ دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔ بات کرتا ہوں مگر خیال کہیں اور کا ہے، ہنستا ہوں پر دل کی آنکھیں روتی ہیں۔

میری ساحرہ! میں تمہارے جادو کے صدقے! تم کتنا پیارا جادو کرتی ہو کہ تمہارا سحر زدہ تم سے دور رہ کر بھی روتا ہے اور تڑپتا ہے۔ میں اس وقت تمہاری

تصویر سامنے رکھے تمہاری پوجا کر رہا ہوں اور یہ التجا کر رہا ہوں "میری دیوی، اے میری انتہائے آرزو، اپنے پجاری کا سجدہ محبت قبول کرو اور خدا کے لئے اپنے پجاری کو بس ایک نظر دیکھ لو، نہیں دیکھتیں تو وہ رو دے گا، لو وہ رو رہا ہے!"

جانِ جاں، تم سے کیا کہوں اور تم کو اپنا کونسا درد دکھاؤں ؟ تم ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو، مگر پھر بھی دل کو قرار نہیں اور یہ ایک ضدی بالک کی طرح ہر گھڑی مچھاڑیں کھاتا رہتا ہے، تمہاری تصویر تمہاری عدم موجودگی میں کبھی تھوڑی سی تسکین پیدا کرتی ہے اور کبھی بھڑکتے ہوئے شعلوں پر تیل کا کام کرتی ہے تمہاری تصویر سے دل بہلانے کے لئے یوں باتیں کرتا ہوں "میری نیلو، تم کب سے اُدھر دیکھ رہی ہو، کیا تمہاری آنکھیں ایک ہی سمت تاکتے تاکتے تھک نہیں جاتیں ؟ میں کب سے تم کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری غزال وحشی جیسی آنکھیں جن میں سرمہ کی ہلکی سی لکیر ہے، ایک بار صرف ایک بار میری طرف دیکھ لیں تو میری دنیا جگمگا اٹھے، میری روح حیات، تم کتنی حسین ہو کہ صرف تمہارے عکس سے کاغذ کا یہ ٹکڑا ابھی ایک حسین تصویر بن گیا ہے! اف تمہارے شفاف رخسار پر یہ سیاہ تل، کیسا حسین اجتماع دانہ و دام ہے، اور تمہاری یہ سیاہ ساری پر سفید کنارا جیسے اندھیری رات میں ماہتاب کے کرنوں کی پگڈنڈی ہو اور تمہارے کانوں سے لٹکتے ہوئے چمکدار بندے کیا حسن میں ٹوٹے ہوئے تاروں سے کم ہیں ؟ ۔ تمہاری ستواں ناک اور کمان جیسے تیکھے اور بل کھائے ہوئے لب، اف اور ان پر یہ کھیلتا ہوا ہلکا سا تبسم جیسے بند کلی پر شبنم کا قطرہ یا کلیوں کے سیج پر انگڑائی لیتی ہوئی نازنین!

رات سے طبیعت بہت بے چین ہے کسی پہلو قرار نہیں، بہت رات گئے تک جاگتا رہا اور تمام رات رہ رہ کر نیند کھل جاتی تھی اور تمہارے خیال کا سلسلہ جہاں سے چھوٹ جاتا تھا پھر وہیں سے شروع ہو جاتا تھا۔ دھوپ نے اپنا طلائی رنگ ہر کوہ وادی پر پھیر دیا تھا جب پلنگ پر سے اٹھا۔ چائے کے بعد دل بہلانے کے لئے ریڈیو کے پاس بیٹھا، اچھی سی غزل کوئی گا رہا تھا، دل خواہ مخواہ بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں،

اب تک دل پر غبار سا چھا رہا ہے، موسم سرما کی اداسی نہ صرف دنیا پر چھا گئی ہے بلکہ اس کا پورا قبضہ میرے دل پر بھی ہو گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں خاک راہ ہو گیا ہوں اور سرد ہوا مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے۔ کبھی مجھے یہ آتنا اچھالتی ہے کہ آسمان قریب ہوتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی ایسا گراتی ہے کہ زمین کے اندر دھنستا محسوس کرنے لگتا ہوں، کبھی دل ایسا محسوس کرتا ہے کہ حسرتوں اور ارمانوں کا ایک وسیع ناقابل عبور سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور اس میں میری کمزور سی ناؤ ہچکولے کھا کر ڈوبنا چاہتی ہے۔

میں تم سے کیا چاہتا ہوں؟ میں تمہارے لئے اتنا بے چین کیوں رہتا ہوں؟۔ تمہاری جدائی مجھے ایک بے جان مجسمہ میں کیوں تبدیل کر دیتی ہے؟ میں ان سوالوں کو بار بار پوچھتا ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ تم میری زندگی کی جز بن کر رہ گئی ہو، میرے دل کا اضطراب، میری آنکھوں کا خمار، میرے سانس کی قوت حرکت، میری زندگی کی رنگینی، میرے خیال کا مرکز، میری حیات کا مآل، میری وجود کی وجہ۔ الغرض کیا کہوں کہ یہ سب چیزیں تمہارے دم سے قائم ہیں۔ قصہ مختصر،

تم تم نہیں ہو بلکہ میری حیات کی جز ہو، میرے جسم کی روح ہو اور میری زندگی کی جان ہو۔

اے کاش ..... اور اے کاش! کیا کہوں، ان کاشوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے ہر گھڑی سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔ شامت ہوتے ہوئے ارمانوں کو اکسا کر ورغلاتے ہیں۔ مجھے چھیڑ کر رلاتے ہیں۔ میں تھک کر سونا چاہتا ہوں اور یہ مجھے جھنجوڑ کر جگاتے ہیں۔ الغرض کیا کہوں، اے کاش، ان کو مجھ سے کوئی لے لیتا اور ان کی جگہ مجھے بے حس دماغ اور پتھر کا دل دے دیتا!

سوچتا ہوں آج کا دن بھی تم سے علیحدہ رہ کر اسی پرانے بے رنگ مدھونتی آسمان کے نیچے کاٹنا پڑے گا، اف یہ خیال کیسا جانگسل ہے کہ آتے ہی دل کی دھڑکن کو روک دیتا ہے اور آنکھوں تلے اندھیرا سا آتا ہے، تنہائی اور شدید تنہائی محسوس ہونے لگتی ہے کیا کروں، کہاں جاؤں، کس سے کہوں اور کیا کہوں؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟؟؟

(تمہارا بے قرار)

---

(۴۴)

رانچی

۲۵ دسمبر ۳۶ء

تمہارے خط نے تھوڑی دیر کے لئے خوش کر دیا ہے، دیکھا تم نے، میں نہ کہتا تھا کہ میری قیمت تم کو مجھ سے الگ رہ کر معلوم ہو گی؟ میرے دل کا دھڑکنا دور سے سنائی دے گا اور اس سے جتنا دور ہوتی جاؤ گی یہ اور پریشان کرے گا۔ آج ایک سال کے بعد تم نے محسوس کیا کہ کسی کا دل تمہارے لئے بے قرار رہتا ہے اور اس کی بے قراری سے تمہارے دل کی بے قراریوں کا تعلق ہے۔ دیکھو، ابھی یہ آغاز ہے، دیر نہ کرو اور جلد میرے بتلائے ہوئے نسخہ کی دوا پی لو۔ اپنی والدہ سے اپنے دل کا حال کہہ دو۔ پھر باقی میں ٹھیک کر لوں گا۔ دیر کرنے سے فضول اختلاج قلب بڑھتا جائے گا اور یہ جی خواہ مخواہ ہر دم بیٹھتا رہے گا۔

پرسوں شام کو جب میں باہر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا، دیکھا ایک دم اسلم صاحب دندناتے چلے آرہے ہیں۔ میں ان کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گیا۔ وہ ہنس کر کہنے لگے "سمجھے نہیں ڈاکٹر صاحب، میں ہوں اسلم"۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "جی اس میں سمجھنے کی کیا بات تھی؟ آپ کوئی اقلیدس کے حل طلب معمہ تو ہیں نہیں کہ آپ کو سمجھا جائے، آپ اسلم ہیں اسلم اور صرف اسلم، کہو ادھر کیسے آنا ہوا؟" بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئے، ماشاءاللہ کپڑے خوب عمدہ اور نہایت سجل پہنے ہوئے تھے۔ ملگجا سا سانولا رنگ بھی کسی قدر صاف ہو گیا تھا، جیب سے چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور اس میں سے سنہرے کنارے والا سگریٹ نکال کر ایک خود لیا اور دوسرا مجھے دے کر کہنے لگے "یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ یہاں کیوں آیا، پہلے میری آپ بیتی سن لیجئے"۔ میں اسلم صاحب کی آپ بیتیوں کو کافی سے زیادہ سن چکا تھا اور اس کے خیال سے گھبرا کر اپنی گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

انہوں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر دھواں کو زور سے منہ اوپر کر کے چھت کی طرف پھینکا اور بولے "میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ صرف آدھ گھنٹہ۔ مگر آپ کو شاید معلوم نہ ہو گا کہ چچا صاحب یعنی خان بہادر صاحب کا گذشتہ ماہ کے آخر ہفتہ میں بیٹھے بیٹھے دم نکل گیا۔ دن کے دس بجے تھے، حقہ پی رہے تھے اور کھانس رہے تھے اتنے میں چلم کا تمباکو جل گیا اور وہ عبدالرحمان کو آواز دینے لگے۔ عبدالرحمان بازار چلا گیا تھا۔ وہ خوب چیخے چلائے، چچی صاحبہ اندر بیٹھی سنتی رہیں مگر خود نہ آئیں اور نہ کسی دوسرے ملازم کو بھیجا۔ بہت دیر کے بعد کوئی ساڑھے گیارہ بجے عبدالرحمان آیا۔ اس وقت تک خان بہادر صاحب پکار پکار کر تھک گئے تھے اور چپ ہو چکے تھے۔" میں نے ذرا حیرت سے پوچھا "آپ کا کمرہ ان کے برابر تھا، کیا آپ بھی اس وقت وہاں نہیں تھے؟" اسلم صاحب ہنسنے لگے اور سگریٹ کی راکھ فرش پر جھاڑ کر بولے "جی نہیں، میں اپنے کمرہ میں تھا اور اس وقت بیٹھا اپنے چچا اور چچی کے خراب سلوک کو یاد کر کے غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ ان کی بیگم صاحبہ کا فرض ہے کہ وہ آ کر ان سے پوچھیں کہ کیا چاہئے؟ میں کون ہوتا تھا کہ بیچ میں دخل در معقولات کرتا پھرتا؟ مجھے گھر سے نکلنے کا حکم مل چکا تھا اور اسی فکر میں تھا کہ کہیں چلا جاؤں ان کی بیگم جو بڑے میاں کی تمام دولت پر ہاتھ مارنا چاہتی تھیں بہ ان کو آ کر دیکھنا چاہئے تھا۔" مجھے اسلم صاحب کی یہ سخت قلبی پسند نہ آئی۔ مجھے جہاں تک علم تھا کہ اگر خان بہادر مرحوم اپنے چھوٹے بھتیجے کو اپنی پناہ میں نہ لیتے تو آج میاں اسلم یا تو کسی کے گھر ملازم ہوتے یا کسی کارخانہ میں مزدوری کرتے ہوتے۔

بہرحال دنیا میں بہت سی انوکھی باتیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی۔ میں خاموش بیٹھا اسلم صاحب کی داستان سنتا رہا، وہ کہتے گئے "جب عبدالرحمان بازار سے لوٹا تو میں نے اشارہ سے کہا کہ خان بہادر صاحب بلا رہے ہیں اور بہت غصہ کر رہے ہیں۔ میں عبدالرحمان کے بہرے ہونے کے سبب سے اکثر اس سے اشارہ میں بات کرتا ہوں اب اس سے کون چیخ کر باتیں کرتا اور خواہ مخواہ چچا ابا سے ڈانٹ سنتا کہ تم بڑے بدتمیز ہو اس قدر چیخ کر شور کیوں مچاتے ہو؟ عبدالرحمان دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور آہستہ سے چلم اٹھا کر باہر چلا کہ تازہ تمباکو بھر دے مگر خان بہادر صاحب جیسے شیر بنے لیٹے ہوئے تھے، اس کی آہٹ سنتے ہی چلا اٹھے "مردود نمک حرام، کہاں مر گیا تھا، بولتا کیوں نہیں، ابے بول حرامزا ......"

اسلم کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور مدہوش جیسے ہو کر سنانے لگے "خان بہادر صاحب حرامزادہ پوری طرح سے کہنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کے حلق سے عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے بکری کی آواز میں کتے کی بھونک ملا دی جائے" اپنی اس نادر تشبیہہ پر اسلم صاحب کی بھینگی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور جب انہوں نے خان بہادر صاحب کی اس عجیب آواز کی نقل اتار کر مجھے سنانا چاہا تو میرا جی چاہا کہ اٹھ کر ان کی چونچ جیسی ناک کو مروڑ دوں اور کان پکڑ کر کہوں کہ "اے احسان فراموش نمک حرام انسان تجھ کو کچھ خدا کا خوف بھی ہے یا نہیں؟"

اسلم صاحب میرے اندرونی خیالات کی کش مکش سے بے خبر اپنی دھن میں مست اپنے مزیدار قصہ کو سناتے جا رہے تھے "جب اس قسم کی مکروہ آواز میرے کانوں میں آئی تو میں نے حیرت سے کان کھڑے کئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اتنے میں دیکھا

عبدالرحمان اپنے ایک ہاتھ میں چلم اور دوسرے سے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پکڑے ہوئے بھاگتا چلا آرہا ہے اور وہ میرے پاس آکر اتنا گھبرا چکا تھا کہ اس کے ہاتھ سے چلم زمین پر گر کر چکنا چور ہوگئی۔ میں نے اشارہ سے پوچھا، کیا ہے، کہنے لگا میاں۔ گئے سرکار یوں ہو گئے اور یہ کہہ کر عبدالرحمان نے اپنا منہ کھول دیا جس کے اندر اس کے ایک آدھ دانت، پیلا اور ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پھر اشارہ سے پوچھا کہ بتاؤ، یہ کیا ہوا، عبدالرحمان نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میاں جلدی چلئے، سرکار شاید چل بسے!" میں نے ننگے پاؤں جاکر دیکھا۔ واقعی خان بہادر صاحب کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور جسم کا آدھا حصہ بل کھایا ہوا۔ پلنگ کے کنارے تک آپہنچا تھا اور چہرہ پر کچھ غصہ اور کچھ جانکنی کے کرب سے نہایت خوفناک نقوش ابھر آئے تھے۔"

اسلم نے دوسرا سگریٹ جلایا۔ اس کا پہلا کش بڑے لطف سے لے کر زبان کو اپنے لب پر پھیرا جیسے وہ کوئی بڑی مزیدار چیز کا ذائقہ لے رہے ہوں۔ مجھے اپنی طرف مخاطب پاکر آگے بڑھے۔ "خان بہادر صاحب کو اس حالت میں پاکر ایک اندھا آدمی بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کی موت واقع ہو چکی ہے۔ عبدالرحمان کے آنسو امنڈتے ہوئے اس کی آنکھوں سے بہہ کر داڑھی کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے، اس کا ضعیف و ناتوان کلیجہ شدت گریہ سے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ رو رو کر خود ہی کہہ رہا تھا "میرے سرکار، میرے اچھے سرکار، مجھے اکیلا کس پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ہائے میں جانتا تو ہرگز بازار نہ جاتا۔ مجھے یہ کیا ہو گیا تھا کہ تمباکو لانے ٹھیک اسی وقت چوک چلا گیا"۔ عبدالرحمان یوں آہستہ

آہستہ اپنے سے باتیں کرتا رہا تھا اور خان بہادر صاحب کے بے جان جسم کو پلنگ پر ٹھیک طرح سے لٹا رہا تھا، خادم کی محبت آقا سے اب تک قائم تھی اور مرنے کے بعد بھی وہ خان بہادر صاحب کی لاش کو بڑی محبت اور عزت سے پلنگ پر ادھر ادھر سرکا رہا تھا۔ جب اسے ان کاموں سے فراغت ہوئی تو ایک سفید چادر سے ان کی لاش کو ڈھنک کر میری طرف دیکھنے لگا۔"

اسلم صاحب، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب اس حادثہ سے کسی قدر متاثر ہو رہے ہیں۔ آواز میں ذرا سا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، کھنکار کر بولے "وہ عبدالرحمان بہت پہلے جب میرے والد صاحب حیات تھے تو ان کا یہ ملازم تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب میرے بڑے بھائی نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا تو یہ خان بہادر صاحب کے ہاں چلا آیا اور جب سے انہیں کے ہاں ملازم ہے۔ اس نے جب مجھے غمگین دیکھا تو کہنے لگا "میاں غم نہ کرو، جلدی کرو، ورنہ بیگم صاحب کو خبر ہو گئی تو کچھ نہ ہو گا، یہ لو میاں کی تجوری کی چابی اور اس میں جو کچھ ہے فوراً نکال لو۔" خان بہادر اپنی تجوری کی چابی ہمیشہ اپنے سرہانے تکیہ کے نیچے رکھ کر سوتے تھے، عبدالرحمان نے ان چابیوں کے گچھے کو تکیہ کے نیچے سے نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور تجوری کی طرف ڈھکیل دیا۔ میں نے تجوری کھولی۔ اس میں نوٹوں کے سینکڑوں بنڈل پڑے تھے جن کی مجموعی قیمت ۵۴ ہزار تھی، میں نے ان کو نکال کر تجوری بند کر دی اور چابی پھر تکیہ کے نیچے رکھ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔"

اسلم صاحب پھر مسکرانے لگے اور داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "ڈاکٹر صاحب، کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں نے ان نوٹوں کو

کہاں چھپایا؟ اجی ایسی جگہ چھپایا کہ اگر فرشتے بھی ڈھونڈتے تو ان کو نہیں ملتا۔ میں نوٹوں کو لیکر سیدھا گراج میں گیا اور وہاں اطمینان سے موٹر کے فاضل چکہ کو کھول کر اس کی ہوا باہر نکالی اور ٹائر کے اندر ان نوٹوں کو بھر کر پھر ہوا بھر دی۔ اور اس فاضل چکہ کو موٹر کے اگلے حصہ کے چکے سے بدل رہا تھا کہ کوٹھی میں نالہ و شیون کی آواز بلند ہوئی، میں سنکر گھبراتا ہوا اندر بھاگا تو دیکھا چچی جان خان بہادر کے کمرے میں بیٹھی زور زور سے رو رہی ہیں " ارے میرے سرتاج، اجی میرے میاں تم کہاں گئے؟ اپنی بانو کو کس کے سہارے چھوڑ کر چلے گئے؟ میں تو لٹ گئی، میں مر گئی، ارے کوئی میرے خان بہادر کو واپس لادے، میرے خدا، میرے اللہ یہ کیا ہوا، دیکھتے دیکھتے گھر کا تختہ الٹ گیا" مگر ڈاکٹر صاحب، میں سچ اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ وہ اتنا بین صرف دکھانے کو کر رہی تھیں، ان کی آنکھوں میں آنسو کی بوند نہ تھی "!

اسلم صاحب اب اتنا مسکرائے اور چچی کے بین کی نقل اس طرح کی کہ خواہ مخواہ سننے والا بھی مسکرانے لگے۔ ان کا قصہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا کہ میں نے دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی، وہ معذرت خواہ ہو کر بولے "بس پانچ منٹ اور، میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہ کروں گا، چچی کو بین کرتے اور روتے دیکھ کر میں نے بھی آنسوؤں کے دو چار قطرے ٹپکا دیئے، میرے آنسو کا ٹپکنا تھا کہ وہ اپنا رونا بھول کر مجھ سے لپٹ پڑیں "ارے منحوس، ارے مونڈی کاٹے، ارے نکھٹو تو کیوں نہ مر گیا تھا۔ میرے سرتاج کے بدلے تیری چرچراتی ہوئی کھٹیا کیوں نہ نکلی موئے، حرام خور، ٹکڑ گدا، جیتے جی کچھ نہیں اور اب مرنے پر ٹسوے بہانے آیا

ہے ، چل دور ہو، نکل ، نکل میرے آگے سے اپنا منھ کالا کر " میں نے احتجاجاً ان سے کچھ کہنا چاہا تھا کہ وہ شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی اٹھیں اور مجھے دو ہتڑوں سے پیٹ ڈالا۔ نکل ، نکل ، موئے حرام خور میرے گھر سے فوراً نکل نہیں تو تجھے جوتی لگا کر نکال دونگی

میں نے اسلم صاحب کی چچی کے ایسے ظالمانہ رویہ کو اظہار حیرت سے سنا تو وہ بات صاف کرنے کے لئے کہنے لگے " ڈاکٹر صاحب شاید یہ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ میری سگی چچی نہیں " میں اسلم صاحب کی سگی چچی پر ہنس پڑا اور پوچھنے لگا " اسلم صاحب چچا کی بیوی ، خواہ وہ کوئی بھی ہو چچی ہوتی ہے ، چچیوں میں سگائی اور سوتیلا پن کا سوال نہیں اٹھتا " میری اس بات کو سنکر وہ کچھ سٹپٹائے اور کہنے لگے " جی سگی سے میری مراد یہ تھی کہ میری پہلی چچی ، اللہ ان کی مغفرت کرے ، میں جب کوئی پانچ سال کا تھا کہ انتقال کر گئیں ، وہ مجھے بہت چاہتی تھیں اور یہ انہیں کی محبت سے خان بہادر صاحب نے مجھے بیٹے کی طرح پالا تھا اور چونکہ میری پہلی چچی کے کوئی اولاد نہ تھی ، اس لئے وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتی تھیں ، ان کے انتقال کے دس سال بعد چچا نے یہ دوسرا نکاح کیا۔ ان سے چچا کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوئے ، جب سے ان چچی کا یہ بیٹا ہوا ہے مجھے پھوٹی نظر نہیں دیکھ سکتیں "

اتنا کہہ کر اسلم صاحب اپنے اصلی قصے پر آ گئے اور پھر کہنے لگے " الغرض یہ چچی نے مجھے مار مار کر باہر کر دیا اور فوراً اٹھ کر میری کوٹھری میں تالا لگا دیا اور کہا کہ اپنی عورت تو نے اگر پھر اس گھر میں دکھائی تو تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ اور رات کے بارہ بجے تک شہر میں ادھر ادھر مارا پھرا ، جب رات کافی ہو گئی تو چپکے سے عبدالرحمان سے آ کر ملا۔ اس نے کہا ، میاں ابھی شہر سے نہ جاؤ ، ادھر ادھر

مارے پھرو اور تم پر جو ظلم ہوا اس کے سارے شہر میں کہتے پھرو۔ بیگم صاحبہ نے تجوری دیکھ لی ہے اور سخت برہم ہوکر پولیس میں اطلاع دے دی ہے۔ بیگم صاحبہ کے بھائی، ماں اور ان کی دونوں بہنیں کل صبح تک یہاں پہنچ جائیں گی۔ تم میری طرف سے اطمینان رکھو، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا تو میاں تمہارا جہاں جی چاہے چلے جانا۔ اب اس گھر پر شیطانوں کا قبضہ ہوگیا۔ میں بھی اس بڑھاپے میں کسی اور کے در پر جا پڑوں گا۔ مگر یہاں ایک منٹ کو نہ رہوں گا۔"

"میں اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد تک شہر میں ادھر ادھر مارا پھرا، اور دوستوں کی مہربانیوں پر زندہ رہا، کھانا کہیں کھایا تو سویا کہیں اور جسم پر جو کپڑے تھے وہ میلے ہوکر کثیف ہوگئے، پولیس والوں نے میری کوٹھی کا چپہ چپہ چھان مارا، بنگلہ کی ہر چیز کو جھاڑ پٹک کر ڈھونڈا، مجھے بلاکر میرے بیانات لئے، دھمکی دی، دعوے کئے مگر ان کو کچھ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ جب روپیوں کی طرف سے ناامیدی ہوگئی تو محلہ ٹولے کی غیرت دلانے سے چچی نے دس روپے میرے پاس بھجوائے اور میرا بستر اور ٹین کا ٹرنک دے کر مجھے کہلا بھیجا "وہ اس نکھٹو نالائق سے کہہ دو اپنا کالا منہ کرے اور اگر بنگلہ کا رخ کیا تو جوتیوں سے پٹیوں گی"۔" اسلم صاحب اب ہنسنے لگے اور کہا "وہ مجھے کیا غرض تھی کہ میں چچی جان کی کالی کلوٹی بھنگنوں جیسی شکل دوبارہ دیکھتا، اپنا سامان لے چپکے سے رات کو عبدالرحمان کی مدد سے گیراج میں گیا اور وہاں سے نوٹوں کا بنڈل لے عبدالرحمان سے گلے مل کر خوب رویا اور رات ہی کی گاڑی سے لکھنؤ چلا آیا"۔

اسلم صاحب اب چپ ہوگئے مگر مجھے اس طرح کہ یہ پتہ نہ چلا کہ قصہ ختم

ہو گیا یا کوئی بات بھول گئے۔ میں نے پوچھا "آپ لکھنؤ کیوں چلے آئے؟"
میرے اس سوال پر کچھ جھینپ گئے اور ہنس کر نظریں نیچی کرتے ہوئے بولے
"جی ممانی جان سے ملنے۔" میں نے ذرا حیرت سے پوچھا کون ممانی جان؟"
وہ پھر ہنسے اور ذرا اور جھینپتے ہوئے بولے "جی وہی ممانی جان، زرینہ بیگم کی
والدہ" اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ اسلم صاحب کے دل سے زرینہ بیگم کا
گہرا نقش اب تک مٹا نہیں تھا۔ میں نے بھی تھوڑی سی دلچسپی کا اظہار کیا اور
پوچھا "اچھا تو یوں کہئے، مگر اسلم صاحب وہاں آپ کیوں چلے گئے؟" اسلم صاحب
اپنی بھیگی آنکھوں سے شرم ظاہر کر کے بولے "وہ میرا ان کے سوا دنیا میں اور کون
ہے؟ میں پھٹی حالت میں جب ان سے ملنے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر بہت جھنجلائیں
مگر میں نے فوراً تنہائی پا کر ان کی گود میں ۵ ہزار کے نوٹ ڈال دیئے تو ان
کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔"

اس کے بعد کے واقعہ کو اسلم صاحب نے بڑا لطف لیکر بیان کیا "جب
ان کے حواس جمع ہوئے تو چٹ پٹ میری بلائیں لینے لگیں۔ میری پیشانی کو چوما
اور بڑے پیار سے اپنے تخت پر بٹھا لیا۔ میں نے ان سے پورا حال سچ سچ بیان کر کے
کہا "یہ روپئے آپ رکھئے، میں ان کو کہاں لیتا پھروں؟" نوٹوں کو لیکر وہ اٹھیں
اور اپنے بکس میں بند کر کے لوٹ آئیں اور کہا "بیٹا جگ جگ جیو، تم نے آڑے
وقت میں ہمارا ساتھ دیا، ہم تو جیسے لٹ گئے ہیں۔ زارو بیچاری تم کو بہت یاد
کرتی تھی کہ اس وقت اسلم بھائی نہ ہوئے ورنہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیتی"
یہ کہہ کر ممانی جان کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ڈھلک پڑے

میں یہ دیکھ کر بے قرار ہو گیا، پوچھا "کیا بات ہے ممانی جان، یہ آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اسلم صاحب کو گویا اب تک ممانی جان کے رونے کا غم تھا، آواز بھرا گئی تھی، مگر قصہ کہتے رہے "اس کے بعد ممانی نے زرینہ بیگم کی نالش کا حال سنا کر کہا "مجھے کہیں چین نہیں، آج رانچی، کل لکھنؤ، پرسوں کلکتہ ماری پھر رہی ہوں کہ کوئی میری زارو کو جتا دے، روپیہ پانی کی طرح بہا رہی ہوں، گھر میں جو کچھ تھا اس کا ستیاناس ہو گیا، اب اپنی بپتا کس سے جا کر کہوں؛ بیٹے خدا تم کو سلامت رکھے، برے وقت میں سہارا دینے آئے ہو، میں پرسوں رانچی جا رہی ہوں میرے ساتھ چلو اور گھر کا نقشہ دیکھو، تمہارے ماموں جان کا منھ اتا سا نکل آیا ہے، اکیلے کیا کیا کریں؛ تم سے ان کو مقدمہ کی پیروی میں بڑی مدد ملے گی اور زارو آہ زارو" ممانی جان پھر رونے لگیں "بٹیا کا منھ سوکھ کر ذرا سا نکل آیا ہے، منھ میں مہینوں سے ایک کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے، رات دن مقدمہ کا دھن ہے وہ بیچاری آفت کی ماری کا دل تم کو دیکھ کر باغ باغ ہو جائے گا اور ہنس کر کہیگی کہ لو دیکھو، میرا بھی کوئی ہے جو میری مدد کو آیا ہے۔"

اسلم صاحب نے اپنی داستان یوں ختم کی "میں ممانی جان کے ساتھ یہاں آ گیا ہوں اور مقدمے کی پیروی کر رہا ہوں۔ یہ محمود میاں ہوتے کس باغ کے مولی ہیں؟ انہوں نے یہ کیا سمجھ رکھا ہے؛ مقدمہ میں شکست فاش نہ دوں تو میرا نام اسلم نہیں، زارو کو کیا انہوں نے کچھ ایسا ویسا سمجھ رکھا ہے کہ دھوکہ بازیوں پر اتر آئے تھے؟ ان کے جیسے کرتوت تھے اب اس کا پھل بھگتیں، پیر تلے کی زمین کیوں نکلی جاتی ہے؟ ڈاکٹر صاحب، کیا آپ

آپ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں ؟"

اب یہ سوال میرے لئے ٹیڑھی کھیر تھا، میں اس معاملہ میں مطلق کسی قسم کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا، میں نے پوچھا "وہ کس طرح ؟" اسلم صاحب نے ایک نیا سگریٹ جلا کر کہا "بس یہی کچھ گواہوں کا مہیا کر دینا اور گواہ اگر نہ ہو سکیں تو خود کسی بات کی گواہی دے دینا" میں نے ذرا غصہ سے کہا "معاف کیجئے اسلم صاحب، اولاً میں اس قسم کے مقدموں میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا دوم یہ کہ میں نے سنا ہے کہ زرینہ بیگم کے کافی گواہ موجود ہیں" اسلم صاحب نے کہا "وہ ہیں تو ضرور مگر آپ کی بات کچھ اور تھی، صرف آپ اگر اتنا کہہ دیں کہ میں نے زرینہ بیگم کو اکثر محمود صاحب کے گھر سے رات کو نکلتے دیکھا ہے اور محمود صاحب نے مجھ سے بھی زرینہ بیگم سے شادی کرنے کے متعلق کہا تھا تو بس ہمارا کام بن جائے گا سمجھے، میں نے غصہ سے کہا "اسلم صاحب ہوش کے ناخن لیجئے، میں جھوٹ کیوں بولنے لگا اور آپ نے مجھ سے ایسی امید کیوں وابستہ کی ؟"

مجھے غصہ میں دیکھ کر اسلم صاحب نے نظریں نیچی کر لیں اور کچھ سٹپٹا کر کہنے لگے "آپ کے اور زرینہ بیگم کے کافی بے تکلفانہ تعلقات کو دیکھ کر میں نے سمجھا کہ شاید آپ بھی زرینہ بیگم کے آڑے وقت میں ان کا ساتھ دیں گے بلکہ وہ خود اسی غرض سے آپ کے پاس آنا چاہتی تھیں" میں نے جل کر کہا. اسلم صاحب، زرینہ بیگم سے میرا بہت بہت سلام عرض کر دیجئے اور کہہ دیجئے کہ وہ کچھ اور زمانہ تھا جب میں ان کو ایسا نہ سمجھتا تھا. میرا خیال افسوس

ہے کہ اب ان کی طرف سے بہت بدل گیا ہے اور اگر وہ غریب خانہ تک اس غرض کے لئے آنا چاہتی ہیں کہ میں سراجلاس کھڑا ہو کر ان کے لئے جھوٹ بولوں تو میں شاید ان سے ملوں گا بھی نہیں، بات کرنا تو در کنار رہے۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا، اسلم صاحب نے دیکھا کہ اب بیٹھنا بے سود ہے تو آداب کر کے چلے گئے اور یوں خدا خدا کر کے ان سے گلو خلاصی ہوئی۔

میری نیلو، بات بہت لمبی ہو گئی، اسلم صاحب کی گفتگو چونکہ ایک حد تک دل چسپ تھی، اور اس میں زرینہ بیگم کا ذکر خیر تھا اس لئے میں نے بلا تصرف من و عن بیان کر دیا ہے۔ شاید اس قصہ میں تم کو بھی کچھ لطف آجائے اور تمہاری وہ گھڑیاں جو بقول تمہارے "کاٹے نہیں کٹتیں" اس داستان رنگین سے تھوڑی دیر کے لئے مزیدار ہو جائیں۔ شہر میں ہر طرف زرینہ بیگم اور محمود صاحب کا چرچا ہے۔ مقامی اخبار جو ہندی میں نکلتا ہے اور اس کا نام "چھوٹا ناگ پور ہتر" ہے مقدمہ کی ہر پیشی کا حال جلی قلم میں چھاپتا ہے۔ رات اب ختم ہونے کو ہے۔ آسمان پر تارے اب ماہتاب کے آجانے سے اونگھنے لگے ہیں۔ میری آنکھیں بھی ان تاروں کی طرح جھپکنے لگی ہیں، اچھا رخصت، فی امان اللہ۔

(تمہارا)

---

(۳۵)

رانچی

پہلی جنوری ۱۹۳۷ء

میری جان کائنات!

بیچئے صاحب ۱۹۳۶ء چلا گیا اور نیا سال شروع ہوا۔ کیا عجیب بات ہے کہ

سال نو کا پہلا دن تمہاری سال گرہ کا بھی دن ہے۔ گویا تمہارا آنا سال نو کا آنا ہے! ایں سال، نو کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور تمہاری بیسویں سال گرہ کے موقع پر ایک حقیر سا تحفہ بذریعہ پارسل بھیج رہا ہوں۔ خدا کے لئے اسے قبول کر کے مجھے مشکور کرو۔ آج کی صبح سے تمہاری زندگی کا اکیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ خدا کرے یہ سال اور اس کے بعد کے آنے والے سال تمہاری زندگی میں صحت، اطمینان، خوشی اور فراغت کے ہزار دن اور لاکھوں لمحے لائیں آمین، انسانی زندگی کے مختلف دور ہیں، پیدائش سے لیکر بیس سال تک کی مدت، لڑکپن کا زمانہ کہلاتی ہے۔ آج سے تمہارے بچپن کے ایام گذر گئے۔ اب ان کی یاد اور صرف یاد تمہاری آنے والی زندگی میں معصوم ہنسی کی لہر دوڑائے گی!۔

آج سے تم جوان ہوتی ہو اور اپنی زندگی کے سب سے اچھے دور میں قدم رکھتی ہو، اب بچپن کی لاپروائیاں عقل و ہوش میں بدل جائیں گی اور لڑکپن کی سادگی شباب کی رنگینی میں تبدیل ہو جائے گی۔ میری یہ دعا ہے کہ یہ انقلاب پر لطف ہو اور تمہاری مسرتوں کی نازک کلی کھل کر شاداب پھول ہو جائے۔

گذشتہ شب، جب بارہ بج رہے تھے اور تمہاری زندگی کے یہ دو دور مل کر جدا ہو رہے تھے تو میں نے سر بسجود ہو کر تمہارے لڑکپن کا شکریہ ادا کیا اور تمہارے شباب کو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی خالق کون و مکان کے آگے دعا مانگی کہ تمہاری زندگی کا یہ دور کامیاب ترین دور ہو اور اس دور کا ہر دن گذشتہ دنوں سے زیادہ اچھا، زیادہ خوش نصیب اور زیادہ نشاط افزا ہو، آمین۔

تمہارے ۳۶ء کے آخری خط نے میرے دل کا بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔

تمہارا یہ لکھنا کہ میں نے والدہ صاحبہ کے تقاضوں سے عاجز ہو کر ان کو اپنی رائے بتا دی۔ گھبرائیے نہیں یہ آپ کے حسب خواہ نہیں تو آپ کے خلاف بھی نہیں، میری جان تم نے ایک سال کی جانگسل مشکلوں کے بعد اپنی زبان ہلائی ہے۔ خدا کرے تمہارا کچھ کہنا میرے لئے فال نیک ہو، میں جانتا ہوں ایسے موقعوں پر تم ......... اپنے ایک ادنے مخلص اور بیچارے کو بھول نہیں سکتیں۔

تمہارے خدا نے جہاں یہ خوشخبری سنائی وہاں چپکے سے میرے کانوں میں یہ بھی ڈال دیا گیا کہ تم ذرا ذرا سی بات پر رو دیتی ہو، دبلی ہو کر زرد پڑ گئی ہو اور تم کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے " اندر ہی اندر کوئی گھن کی طرح کھائے جاتا ہے "۔ میری وجہہ سکون، اتنی سی عمر میں جب ہنسنا اور کھیلنا زندگی کا شغل ہوتا ہے تم ایک جہاندیدہ معشوق کی طرح حرکتیں کرنے لگی ہو، آخر کیوں؟ کیا تم کو اس پر اعتبار نہیں جس سے محبت کرتی ہو، کیا تم کو اس کے خلوص پر شک ہوتا ہے جس پر تم بھروسہ کرنا چاہتی ہو؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ باتیں فضول ہیں۔ رہیں جدائی کی جانگسل گھڑیاں تو یہ بھی اپنے وقت پر جاتی رہیں گی، ان کے لئے اپنی جان کو ہلکان کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

اگر تم نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی تمام زندگی ایک شخص کے لئے وقف کر دوگی اور دنیا کی کوئی طاقت تم کو اس سے چھڑا نہ سکے گی تو پھر یہ جان کھونا کیسا ایسی حرکتیں صرف اس حال میں جائز ہیں کہ تم نے اپنے دل میں کوئی پختہ ارادہ نہ کر لیا

ہو۔ مجھے کبھی یہ شک ہوتا ہے کہ تمہاری پریشانیاں ممکن ہے میری کمزوریوں کے سبب سے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو کیا کہوں کہ میری یہ کمزوری نہیں بلکہ حد درجہ مروت ہے کہ تمہاری مرضی یا اشارہ کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتا۔

سنہ ۳۶ء گذر گیا۔ آؤ۔ اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے گذشتہ جنوری کی ایک شام یاد کریں جب کوئی نیند کا ماتا منھ دھو کر سیر کے لئے جانے کو تیار ہو گیا تھا لعیز رنگ کا دوپٹہ، شکنوں سے چور چور۔ کاندھے پر دھرا تھا اور جب ہم پہاڑی پر سیر کے لئے پہنچے تو ہر طرف سبز مخمل کا فرش بچھا تھا جس پر کسی احمق نے چاندی کے تار کو توڑ مروڑ کر پھینک دیا تھا اور پھر گذشتہ گرمیوں کی ایک شام تھی جب میں کسی شوخ اور چنچل شریر نگاہ کا تختہ مشق بن رہا تھا اور مجھ پر کسی کی نگاہ قاہرہ پڑی تھی، مگر ان نگاہوں نے تم سے چھپ کر مجھ سے ایک بات اور کہہ دی تھی کہ غصہ وہیں آتا ہے جہاں امیدیں ہوتی ہیں اور پھر بدھو پور کی ایک صبح تھی، گلابی موسم تھا اور خنک ہوا کہ کسی نے مجھے ہاں لکھ بھیجا تھا۔

نئے سال کے آنے والے دن جواب تک مستقبل کے پیٹ میں پڑے کروٹیں بدل رہے ہیں نہ جانے کیسے ہوں گے اس لئے گذشتہ سال کی خوشی غم اور پھر خوشی کے تین ورق دفتر پارینہ سے ڈھونڈ نکالے ہیں اور تم کو دکھا رہا ہوں اس سال کی خوشی کی امیدوں سے شروع کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

(جواب کا منتظر)

---

## (۳۶)

للت پور

۶ جنوری سنہ ۳۷ء

میری نیلو!

میں کل موٹر سے یہاں چلا آیا ہوں اور چلتے وقت تک تمہارا کوئی خط نہیں ملا تھا۔ خدا کرے آج آ گیا ہو تو میں رانچی پہنچکر اسے پا لوں گا۔ یہاں سرکاری ضرورت سے آیا ہوں اور یہ جگہ رانچی سے پچاس میل دور ہے۔ ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا ہوں اور یہیں سے بیٹھ کر خط لکھ رہا ہوں۔ اس وقت رات کے ۹ بجے ہیں۔ ہر طرف جھینگر اور دیگر اقسام کے کیڑے چر چوں کر رہے ہیں۔ قریب ہی سونا ندی کا مست رو دھارا چٹان سے ٹکرا کر ایک ہلکا سا شور کر رہا ہے۔ ملازمین اپنے کمروں میں پڑے سو رہے ہیں۔ دیہات میں اور وہ بھی قصبے سے باہر آفتاب غروب ہوتے ہی فضا میں خاموشی اور ایک خاص قسم کا سناٹا پھیل جاتا ہے۔ کان جو شہر میں رہ کر شورِ قیامت سننے کے عادی ہو جاتے ہیں اس مکمل اور پر سکون خاموشی سے متاثر ہو جاتے ہیں اور خود بخود بجنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرے کان کچھ عجیب طرح سے اپنے اندر کچھ کمی محسوس کر رہے ہیں اور یہی کمی یا خلا خود ہی بجکر کانوں میں جھرّاہٹ پیدا کر رہا ہے۔

جب ساری فضا میں ایسا سناٹا ہو تو میرے دل کی اداسی کا عالم کیا پوچھتی ہو؟ رانچی میں تم نہیں ہو مگر دل کو اطمینان سا تھا کہ تم یہاں رہ چکی ہو اور پھر آؤ گی مگر یہاں مکمل اجنبیت محسوس کر رہا ہوں جیسے میں تم سے بہت دور ایک نئے دیس میں چلا آیا ہوں جہاں کی ہر چیز نئی ہے اور غیر مانوس، اس نئے اور بالکل نئے ماحول میں پہنچکر تمہاری

جدائی کا احساس اور بھی بڑھ گیا ہے اور رانچی سے یہ پچاس میل کی مسافت گویا پانچ ہزار میل کی معلوم ہو رہی ہے۔ تمام راستہ مجھے یہ محسوس ہوتا رہا کہ ہماری جدائی کی مسافت ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے، اور موٹر کے پہیے اپنی ہر گردش میں مجھ کو تم سے دور کئے جا رہے ہیں۔

جس وقت سے یہاں پہنچا ہوں تمہاری جدائی کی یاد نئے سرے سے تازہ ہو گئی ہے اور میرا خیال صرف تم ہی تم سے معمور ہو رہا ہے۔ آنکھیں تم کو ڈھونڈھ رہی ہیں، دل تمہارے لئے تڑپ رہا ہے اور سانس تمہاری یادیں چل رہے ہیں۔ میرا تخیل صرف تمہارے پیکر جمیل کو دیکھ رہا ہے اور تم سے قریب تر ہو جانے کے لئے کہہ رہا ہے۔ نیلو، میری جان اے کاش تم اس وقت میرے پاس ہوتیں یا کم از کم سامنے والی کھڑکی سے چھپ کر ہی مجھے دیکھ لیتیں!

ڈاک بنگلہ کی سنسان فضا، چاندنی رات، ہر طرف خاموشی، آبادی سے الگ تھلگ، حد نظر تک سبزہ اور سبز پہاڑیاں، نئی زمین، نیا آسمان، نیا ماحول، نئی فضا، آہ، تم کہاں ہو؟ مجھ سے کیوں دور ہو؟ یہاں کہیں نہیں نا چلی آئیں کہ میں بتاؤں پرانی شراب نئے جام میں کس قدر اڑتی ہے اور کتنی تیزی سے سر پر چڑھ جاتی ہے۔ میری بے قراری ہر گھڑی بڑھتی جاتی ہے۔ ابھی کچھ دیر آگے احاطہ کی صاف ستھری سڑک پر ٹہل کر چاند کو دیکھ رہا تھا۔ کیسا پیارا چاند ہے یہ اس وقت تمہارے مکان کے اندر بھی چمک رہا ہوگا اور اس کی تیز کرنیں کھڑکی پر پھیلی ہوئی عشق پیچاں کی بیل سے چھن کر اندر جا رہی ہوں گی۔ جہاں شاید تم اس وقت خواب ناز ہوں گی۔ اس کی روشنی تمہارے بنگلہ سے قریب مسجد کے سفید گنبد پر قلعی کر رہی ہوگی اور یہ آہستہ آہستہ دبے

پاؤں تمہارے برآمدہ میں جا کر تم کو دیکھ رہی ہوگی۔

کاش مجھے کوئی ان چاند کی کرنوں میں پیوست کر دیتا تو میں ابھی تم کو سوتے ہوئے دیکھتا کہ تم نیند میں کھو کر کتنی خوبصورت ہو جاتی ہو؟ تمہارے آبنوس جیسے سیاہ بال الجھ کر تمہاری مرمریں گردن کے گرد کتنے حسین معلوم ہوتے ہیں اور تمہارے عارض درجہ حسین اور سرخ لب عالم خواب میں اپنے اندر ہلکی سی مسکراہٹ لئے ہوئے کتنے کیف آور جام شراب بن جاتے ہیں؟ یہ چاند کتنا خوش نصیب ہے کہ یہ ابھی تم کو سوتا ہوا دیکھ رہا ہوگا۔ اس وقت تمہاری مد بھری بڑی بڑی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر پلکوں میں ڈھنک گئی ہوں گی تمہاری لانبی اور مدور گردن کسی کی بل کھائی ہوئی ناز کمر کی طرح ایک طرف کو مڑ گئی ہوگی، تمہارے گھنے اور لانبے بالوں کی چوٹی لہراتی ہوئی تکیہ پر دور تک چلی گئی ہوگی۔ اور تمہارا وہ نازک سینہ ہتھیلیوں کے بوجھ سے دب کر دھڑک رہا ہوگا۔ پتہ نہیں اس وقت نیند میں تمہارے نازک کمان جیسے لب مسکرا رہے ہیں یا ان پر ہلکی سی نیند کی کپکپاہٹ رقص کر رہی ہے؟ اے کاش تمہارا یہ خواب ناز میری نظروں کے سامنے ہوتا اور میں ایک مبہوت نقاش کی طرح تمہارے حسین خواب کی تصویر اپنے پردۂ دل پر کھینچتا ہوتا۔

میری کائنات حیات، تمہاری محبت مجھ سے عجیب عجیب فرمائشیں کرتی ہے مثلاً یہ کہ میں تم کو ہر گھڑی اپنے ساتھ لئے پھروں اور جہاں کہیں جاؤں تم کو اپنے قریب رکھوں، یہ کیسی حماقت اور نادانی ہے۔ دنیا میں رہ کر اور یہاں کی پریشانیوں میں کھو کر فاختہ کی طرح زندگی گذارنے کا خیال کیا مہمل اور لچر ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اب رات کے گیارہ بج گئے، چاند اور بھی چمک اٹھا، سناٹا اور شدید ہو گیا اور

فضا کی خاموشی بالکل مکمل ہو گئی۔ یہی وقت ہے کہ بارگاہ ایزدی میں خلوص دل سے دعا مانگی جائے کہ اے پاک اور محبت کرنے والے معبود، آپ کے حضور میں ہم دو محبت کرنے والے حاضر ہوئے ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کہ آپ نے دو بندگان ناچیز کے دلوں کو محبت کی پاک روشنی سے جگمگا دیا ہے، اے مہربان خدا، جہاں آپ کی ہم پر اتنی مہربانیاں ہیں وہاں ایک اور بھی ہو جائے کہ یہ دو دھڑکتے ہوئے مضطرب دل ایک ہو جائیں اور یہ ایسا ملیں کہ موت کے آہنی پنجے بھی ان کو جدا نہ کر سکیں، آپ کی نوازشوں پر دو ناز کرنے والے غلام حاضر ہیں۔ ان کی دعا قبول کیجئے۔

اس وقت بہت تھک گیا ہوں، سردی بھی بہت تیز ہو گئی ہے۔ سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ شب بخیر۔ (دور افتادہ مضطرب)

---

(۳۷)

رانچی

۱۲ جنوری ۳۷ء

ڈارلنگ!

سات کو رانچی پہنچا اور امیدوں سے بھرے دل کو لئے ہوئے کہ تمہارا خط اگر میرا انتظار کر رہا ہو گا مگر توبہ کیجئے، کبھی میری امید آسانی سے پوری ہوتی ہے جو جب ہوتی۔ مسلسل چار دن اور چار راتیں اس انتظار میں گذر گئے کہ اب تمہارا خط آیا اور اب آیا۔ مگر یہ کسی وعدہ خلاف کے وعدہ کی طرح کبھی نہ آیا۔ کل کچھ بہت زیادہ ناامید

ہو کر تار دینے جا رہا تھا کہ ڈاکیہ نے وہ مانوس تحریر کا لفافہ دیا جس کو دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ آنکھیں پرکیف وسرور ہو جاتی ہیں، ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور بے قراری سارے جسم سے پسینہ کی طرح پھوٹ کر باہر نکلنے لگتی ہے۔ دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کو لیکر حسب دستور اسے غور سے پڑھا ڈاک خانہ کی مہر دیکھی اور اس پر لگی ہوئی تاریخ، خط ٹھیک وقت پر آیا۔ تم نے شاید کوئی خط لکھا ہی نہیں۔ اس لئے مجھے نہیں ملا۔

خط کھول کر پڑھا مگر اس میں کوئی بات نہ تھی، مضمون پھیکا اور پر تکلف تھا۔ اس میں نہ پہلے جیسے جذبات کی فراوانی تھی اور نہ صفحات رنگے ہوئے تھے۔ بس کاغذ کا ایک مختصر سا ٹکڑا تھا، ہلکے عنابی رنگ کا اور اس میں تحفہ ملنے کی خبر تھی اور شکریہ کچھ اپنی طبیعت کی گرانی کا حال تھا اور کچھ والدہ کی بے وجہ خفگی کا، پہلے جلد آنے کی امیدیں ہوتی تھیں اور اس دفعہ وہ بھی نہیں۔ میری نینو تم کو یہ کیا ہو گیا ہے؟

تمہارے خط کے آنے سے دو دن پیشتر محمود صاحب آئے اور اپنا پرانا بے تکلف رویہ برتنا چاہا یعنی ریڈیو کھول دیا۔ کتابوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرنے لگے، ملازم سے پانوں کی فرمائش کی، چار بنانے کو کہا اور آرام سے صوفہ پر گویا لیٹ گئے پھر اٹھے اور چھوٹی میز کے خانہ سے شطرنج کے مہرے نکالے اور بساط پر مہروں کو آمنے سامنے رکھ کر مجھ سے کہا "وہ آئیے ڈاکٹر صاحب، آج عرصہ کے بعد آپ سے زور آزمائی کرنے آیا ہوں" میں نے ہنسکر کہا "میں زور آزمائی کا قائل نہیں، طبع آزمائی کا ہوں" کہنے لگے "یونہی سہی" محمود صاحب حالانکہ بے تکلف ہونے اور دکھانے کے لئے بے حد ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے مگر نگاہوں کو ان کی یہ حرکتیں صاف مصنوعی

دکھائی دے رہی تھیں۔

مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں کسی کا پردہ کھولتا، چپ رہا اور دیکھتا رہا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟ شطرنج کی بازی شروع ہوئی "میں نے پوچھا کیں صاحب ہم اتنے عرصہ کے بعد ملے ہیں کہ بہت سی باتیں اس درمیان میں توضیح طلب ہو گئی ہیں، کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ ہم شطرنج ابھی نہ کھیلتے، ریڈیو کو بند کر دیتے، چار پیتے اور پان کھا کر مزے مزے کی باتیں کرتے" مگر وہ میری اس تجویز پر راضی نہ ہوئے۔ اور بدستور بساط کی طرف دیکھتے رہے۔ میں ادھر ان سے باتوں میں مشغول تھا اور غفلت میں اپنے گھوڑے کو اٹھا کر ان کے پیدل کے منھ میں رکھ دیا۔ محمود صاحب نے تڑ سے اسے وہیں پیٹ لیا اور کہا "دھیان سے کھیلئے ورنہ پیدل کی بات دونگا" مجھے ان کی اس ڈینگ سے غصہ آگیا کہ عجیب آدمی ہیں، یہاں میں ان سے باتیں کر رہا تھا اور انہوں نے میرے گھوڑے کو پیٹ کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا مگر پھر خیال آیا کہ ان کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ غفلت میں وار کرتے ہیں اور دوست بن کر نقصان پہنچاتے ہیں۔

میری بازی سنبھل گئی اور متواتر ان کے دو مہرے اور تین پیدل مار لئے اب محمود صاحب سے نہ رہا گیا۔ بلبلانے لگے کہ یہ غلط تھا، اس کی سی نہیں، میں نے دیکھا نہ تھا وغیرہ، ان کے لبوں کی وہ مسکراہٹ جو ہر وقت کسی تیز ہتھیار کی طرح چمکتی رہتی ہے اب بھی بدستور تھی مگر اب اس میں کچھ زہر خند کا جز شامل ہو گیا تھا ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا اور ان کے جذبات کی فراوانی اور اس کی مختلف قسمیں ان کے چہرہ کو پردہ سیمیں بنائے ہوئے تھیں اور شاید اسی

وجہ سے وہ ٹک ٹک نظریں نیچی کئے بساط کو گھور رہے تھے اور اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر مجھ سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ ایک جگہ میرا رخ پھنس گیا۔ خوش ہو کر کہنے لگے "بچائیے اسے تو جانوں؟" رخ بچ نہیں سکتا تھا اسلئے پٹ گیا۔ بڑے خوش ہو کر بولے "اجی جناب یہ شطرنج ہے شطرنج، معشوق کی طرح رنگ بدلنے والا ابھی کچھ اور ابھی کچھ۔

محمود صاحب کی یہ تشبیہ اور نہایت بھونڈی سی مجھے بہت ناگوار گذری، میں اپنے خیال میں منہمک تھا کہ انہوں نے میرے ایک پیدل کو مار لیا، پھر بغلیں بجانے لگے اور کہا "ڈاکٹر صاحب، اب ہتھیار ڈال دیجیے، بازی نہیں بچے گی" ان کے اشتعال سے مجھے غصہ سا آنے لگا، دھیان جو ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا پھر جم گیا اور اس دفعہ میں نے ان کو شہ پر شہ دے کر گھبرا دیا۔ اب میری باری تھی کہ میں بھی ان پر جملے چست کروں مگر طرح دے گیا۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا "وکیل صاحب معشوق کی زد سے بچایا جا سکتا ہے مگر یہ شطرنج ہے شطرنج، اس کی شہ بری ہوتی ہے" میں نے دیکھا کہ وکیل صاحب میرے اس جملہ پر تلملا اٹھے مگر کر کیا سکتے تھے، شاہ چکر میں پڑ گیا تھا، اس کو نہ رہتے بنتی تھی اور نہ بھاگتے، میں نے کہا "وکیل صاحب، یہ سمجھیے اب اس کی کوئی اپیل نہیں" محمود صاحب کی بازی مات ہو کر ختم ہو گئی تھی اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر سگریٹ پینے لگے تھے۔

پتہ نہیں شاید اس دن وکیل صاحب تل گر آئے تھے کہ مجھے مات دیں گے۔ بازی ختم ہوئی نہیں کہ فوراً دوسری بچھانے لگے۔ میں نے کہا "چار پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے اسے پہلے پی لیں۔ پھر کھیلیں گے اور کھیلنے کی ایسی بے تابی کیوں ہے جبکہ نتیجہ ظاہر ہے؟"

اس دفعہ بڑی دیر کے بعد محمود صاحب نے مجھ سے آنکھیں ملائیں۔ ان کی چندھی آنکھیں اور چھوٹی ہو گئی تھیں اور ان کے چاروں طرف باریک جھریاں سی پڑی ہوئی تھیں جو حالت انفعال یا اندرونی تنفس کے سبب لامعلوم طور پر پڑ جاتی ہیں اور چہرہ کے نقوش کچھ واضح طور سے ابھرے ہوئے نہ تھے بلکہ متفرق قسم کے اندرونی احساسات کے سبب سے کہیں مسلٹ گئے تھے اور کہیں ابھر آئے تھے۔ ان کا چہرہ مجموعی طور پر بدصورت نہیں کہا جا سکتا مگر اس وقت ان کی تنگ پیشانی، گندمی رنگت، باریک ٹھوڑی اور چوڑے دہانہ پر جگہ جگہ نہایت ہلکی ہلکی کپکپی ہو رہی تھی جیسے شدید جذباتی خواہشوں کو روکنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے چائے بنا کر ان کی طرف پیش کی وہ اس کا ایک گھونٹ پی کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے جہاں افق میں آفتاب تیزی سے غروب ہونے جا رہا تھا اور ابابیل کے جھنڈ ہوا میں اڑ رہے تھے۔

میں نے کہا "محمود صاحب، زرینہ بیگم کی نامناسب حرکت پر مجھے بہت افسوس ہے۔ ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ اگر مان بھی لیا... " میری بات کاٹ کر محمود صاحب نے چائے کی پیالی تشتری میں رکھتے ہوئے کہا "آجی ڈاکٹر صاحب، آپ فکر نہ کیجئے، ایسا ہی ہو جاتا ہے اور ہم وکیل کس دن کے لئے ہوتے تھے؟" میں نے ہمدردی سے کہا "آپ وکیل ہیں اسلئے کوئی پرواہ نہیں کرتے اگر کوئی بے گناہ بے چارہ جو وکیل نہ ہوتا تو اس کی کیا گت بنتی؟ اور اس سے زرینہ بیگم کے نام میں کونسے چار چاند لگ جائیں گے؟" محمود صاحب نے ہنس کر کہا "یہ شہرت نہیں تو اور کیا ہے، سارا شہر چرچا کر رہا ہے، اخبار میں الگ نام نکل رہا ہے" میں نے کہا "اسے شہرت نہ کہئے بدنامی کہئے اور آپ مقدمہ کا کیا رنگ دیکھتے ہیں؟" محمود صاحب نے گمبھیر

لہجہ میں کہا "رنگ لاجواب ہے، شکست فاش نہ دوں تو میرا نام بھی نہیں، وہ بھی کیا یاد کریں گی کہ بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالا تھا۔ آپ دیکھتے رہیئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خالہ جان مرشد آباد سے کب آرہی ہیں؟"

میں نے ان کے یک بیک بات بدلنے سے یہ سمجھا کہ یہ اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ میں نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں" انہوں نے فوراً ذرا بن کر حیرت سے کہا "کیوں نیلو آپ کو خط نہیں لکھتیں؟" میں نے آزمانے کے لئے کہ دیکھوں کہاں تک جاتے ہیں جھوٹ کہہ دیا "بالکل نہیں"۔ محمود صاحب اب چائے کی ایک پیالی ختم کر کے حسب عادت اپنے ہاتھوں سے آدھی پیالی اور بنانے لگے اور اسی دوران میں نظریں نیچی کئے ہوئے کہا "مگر پہلے تو لکھتی تھیں"۔ میں نے کہا "وہ تو کبھی کبھار جب کوئی پروگرام مرتب ہوتا تھا تو یہ پوچھنے کے لئے کہ میں چلوں گا یا نہیں کوئی کھلا پرزہ بھیج دیتی تھیں"۔ محمود صاحب چائے میں شکر ڈال رہے تھے، میرے اس جواب پر ان کا شکر دانی سے بڑھتا ہوا ہاتھ ذرا دیر کے لئے غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ٹھٹک گیا اور پھر بڑھ کر چائے کی پیالی میں شکر ڈالنے لگا۔ وہ نظریں نیچی کئے ہوئے ذرا طنز سے بولے "اگر لکھتی بھی تھیں تو شاید اب نہ لکھیں گی"۔ کہاں میں اب تک آدھی دلچسپی سے ان کی باتوں میں حصہ لے رہا تھا اور کہاں اب ایک دم سے دل و دماغ میں جیسے کسی نے بجلی کا بٹن دبا دیا، میں سراپا گوش و ہوش ہو کر چونک پڑا اور پوچھا "یہ ایسی بے رخی کیوں ہو جائے گی؟" چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولے "اجی اب ان کی نسبت بڑے گھر میں ہو رہی ہے، اب وہ آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی بننے والی ہیں"۔ کاٹو تو لہو نہ تھا، جی چاہتا تھا کہیں کپڑے پھاڑ کر بھاگ جاؤں کہ ظالم یہ کیسی تکلیف دہ باتیں کرنے لگا ہے۔

میری طرف سے کوئی جواب نہ پاکر شاید محمود صاحب دل ہی دل میں خوش ہوئے اور ان کی مستقل مسکراہٹ دمکنے لگی۔ شاید وہ میرے دل کی اندرونی کش مکش کو محسوس کر کے لطف لے رہے تھے اور اپنے لطف میں اضافہ کرنے کے لئے ذرا طنز سے بولے۔

"سنتا ہوں کہ خالہ جان نے بات منظور کر لی ہے اور منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے وہ جلد رانچی آ رہی ہیں۔ اجی جناب یہ دنیا ہے، زیادہ فکر کس کام کا، یہاں لڑکیاں اس کے پلے باندھ دی جاتی ہیں جو نیلام کی چوکی پر سب سے بڑا بول بولے!" معاملہ اب نازک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میرا خون آنکھوں سے منجمد ہوتا ہوا دل کی طرف چلا آ رہا تھا! اس کے خوفناک اثرات کی ہوشیار کرنے والی گھنٹی کانوں میں بجنے لگی تھی، مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، در کھڑا ہو کر ریڈیو بند کر دیا اس کی مسلسل چیخ و پکار سے دماغ میں جیسے پن چکی چل رہی تھی!

میری گھبراہٹ اور اس گھبراہٹ میں مجھے بے تابی سے اٹھ کر ریڈیو بند کرتے دیکھ کر محمود صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ ذرا جھک کر اس طرح بولے جیسے بس ایک ہی حملہ میں فریق ثانی کا کام تمام کرنا چاہتے ہیں۔ "اب صبر کیجئے، تیر کمان سے نکل چکا ہے اور چڑیاں کھیت چگ گئیں ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور دلی ہمدردی خالہ جان آئیں تو ان سے شکایت کروں گا۔" مجھے اپنے اظہار بے تابی پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے دل کو قابو میں کیوں نہ رکھا اور ناحق اپنی کمزوریاں اس کو دکھا دیں جس کو مجھ سے متعلق ہمدردی نہ تھی بلکہ الٹی خوشی ہو رہی تھی، میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ "کیا آپ کو ان کے سامنے جانے کی اجازت ہے؟ جو خود ڈوب رہا ہو وہ دوسرے ڈوبتے ہوئے کی کیا مدد کرے گا؟" محمود صاحب میری سفارش

سے پہلے آپ اپنی سفارش کرائیے۔ زرینہ بیگم کے آگے۔" اب محمود صاحب کی باری تھی کہ ان کے تن بدن میں شعلے بھڑکیں۔ جنوری کی سردی ملاحظہ ہو اور ان کی تنگ پیشانی پر پسینہ کے قطرے جگنو کی طرح چمکنے لگے تھے۔

اب میرا کمرہ ان کے لئے کافی گرم ہو گیا تھا، بڑی بے تعلقی سے اٹھے۔ اپنی بادامی رنگ کی چھڑی کونے سے اٹھائی اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے "آپ شاید اس خبرِ وحشت اثر سے اپنے ہوش میں نہیں ہیں، ابھی زخم ہرا ہے، جب کچھ تکلیف کم ہو گی تو حاضرِ خدمت ہوں گا، آداب عرض۔" محمود صاحب شاید مجھ سے یہی کہنے آئے تھے،

نیلو، تم نے سن لیا، محمود صاحب مجھ سے کیا کہہ رہے تھے، تمہارا خط بھی کچھ عجیب قسم کا ہے۔ تم کو میری جان کی قسم مجھے واپسی ڈاک سے لکھ بھیجو کہ بات کیا ہے اور دیکھو تم کو خدا کی قسم، بات سچ سچ کہنا۔ بلا سے میرے خلاف پانسہ پڑے مگر جو بات ہو وہ سچ کہو۔ اس خبر کو سنکر چاہئے تھا کہ میرا دم نکل جاتا مگر چونکہ تم پر بھروسہ ہے اور جب تک اس اعتبار کو ہٹانے کے لئے کوئی معقول وجہ نہ ہو میں تم پر آس لگائے بیٹھا رہوں گا۔ اگر یہ واقعہ سچ ہے تب بھی مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی خاصکر تمہاری والدہ سے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کی بھلائی چاہتی ہے اور انہوں نے اگر کوئی اچھی چیز پالی ہو تو اس کو چن کر اٹھا لینا ان کا فرض ہے۔

خط کا جواب جلد دو۔ تمہارے جواب پر میری جان لگی ہے۔

(بے چین و بے قرار)

---

(۳۸)

آگرہ

۲۰ جنوری ۳۷ء

ڈارلنگ۔ نیلو!

رانچی سے تم کو خط لکھ چکا ہوں جو مل گیا ہوگا مگر اس کے جواب تک وہاں نہ ٹھہر سکا۔ ملازمت میں اپنی خوشی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ حکم بالا سب کچھ ہے۔ یہاں مجھے غالباً ایک ماہ تک رہنا ہوگا۔ تمہارے بھائی صاحب کے ہاں ٹھہرا ہوں جو سینٹ جان کالج کے قریب رہتے ہیں۔ اسی کالج میں گذشتہ دو ماہ سے ان کو پارٹ ٹائم لکچرار بنا دیا گیا ہے مگر تم نے یا کسی اور نے مجھے اب تک یہ نہ بتایا۔ میں ان کے پرانے پتہ پر آیا مگر وہاں کہیں پتہ نہیں چلا، آخر دوسرے دن کالج میں جا کر دریافت کر رہا تھا کہ ان سے خود ملاقات ہو گئی۔ ان کی بڑی مہربانی تھی کہ مجھے فوراً اپنے ہاں اٹھا لائے اور اپنے بنگلہ کا پورا ایک بازو میرے رہنے کے لئے دے دیا ہے جہاں بہت آرام سے ہوں۔ مجھے میرے خط کا جواب اپنے بھائی صاحب کے پتہ پر جلد دو۔ خدا گواہ ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں ایک منٹ کے لئے جی نہیں لگتا۔ ہر گھڑی تمہاری طرف خیال لگا رہتا ہے کہ نہ جانے مرشد آباد میں کیا ہو رہا ہے کہ تم مجھے کوئی خط تک نہیں لکھتیں؟

سب مجھے از حد سست اور غمگین دیکھ کر مہدی صاحب اکثر پوچھتے ہیں کہ خیریت تو ہے؟ ........... ان سے کیا کہوں اور ان کو اپنے دکھ میں کیوں کر شریک کروں۔ کبھی جب بہت گھبراتا ہوں تو غالب کی طرح یوں اپنے دل کو بہلانا چاہتا

ہوں ۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

مگر غالب جیسا صبر کرنے والا دل کہاں سے لاؤں۔ الجھتا ہوں اور کشمکش کرتا ہوں کہ کسی طرح خیالات اور سخت غمگین خیالات کا جال لوٹ کے گر جائے بنائے نہیں پڑتا ہے۔ کل شام کو مہدی صاحب میرے کمرے میں آئے، میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ انہوں نے سمجھا میں نیند میں ہوں اسلئے دبے پاؤں لوٹ گئے۔ مجھے نیند کہاں۔ یونہی پڑا گھڑی کی گھڑیاں گن رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس وقت تم کیا کر رہی ہو گی؟

میں اپنے خیال میں گم گویا بے چینی کی بنسری بجا رہا تھا کہ ڈرائنگ روم میں ایک نہایت مترنم مگر کچھ کچھ مانوس آواز سنائی دی۔ میں چونک کر غور کرنے لگا کہ یہ آواز کہیں سن چکا ہوں مگر کہاں؟ مگر کہاں؟ کچھ یاد نہ آیا کہ مہدی صاحب کی بھاری سی آواز سنائی دی "ہیلو دُردانہ اچھی رہیں" ارے یہ تو دُردانہ بیگم تھیں مگر یہاں کہاں: مہدی صاحب نے دُردانہ بیگم کو بیٹھنے کو کہا اور شاید خود بھی بیٹھ گئے۔ آواز کچھ مدھم ہو گئی مگر صاف سنائی دے رہی تھی۔ مہدی صاحب نے میرا نام لے کر کہا کہ وہ آئے ہیں اور یہیں ٹھہرے ہیں "ارے! یہ کب! بڑی خوشی ہوئی" دُردانہ بیگم نے میری آمد کی خبر سنکر جو اظہار حیرت و خوشی کیا تو ان کی نہایت مترنم آواز یوں گونج اٹھی جیسے ایک ساتھ گرجے کی گھنٹیاں گونجنے لگیں اور ان کی آواز کے ارتعاش سے ساری فضا معمور ہو جائے۔

دُردانہ بیگم نے پوچھا "کیوں، ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو گئی کیا؟

وہ کہاں ہیں؟" مہدی صاحب نے جواب دیا "بغل کے کمرہ میں ہیں گیا تھا ابھی گیا تھا تو دیکھا کہ آنکھ لگ گئی ہے۔ بیچارے دن بھر مینٹل ہاسپٹل میں کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں"۔ دردانہ کو دیکھے ایک عرصہ ہو گیا تھا، ان کی غلافی آنکھیں، سنہری وضع کا جوڑا اور مسکراتے ہوئے رسیلے ہونٹ آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے اور ........ اور...... ان کا وہ مصنوعی اختلاط جو مجھ پر مشق کیا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ ان کا گداز چہرہ جس پر مچلتے ہوئے دل کے جذبات بڑی ہوشیاری سے نمایاں کئے گئے تھے۔ مجھے یاد آ رہا تھا اور بے ساختہ جی چاہا کہ زور سے ہنس دوں اور آواز دے کر کہوں "مس دردانہ۔ میں یہیں ہوں اور جاگ رہا ہوں۔ معاً یا نہیں کیا آ جائے آپ مجھ پر پھر ڈورے ڈالیں گی کیا؟"

عورتیں، معاف کرنا تیلو کسی ناقص العقل اور کمزور طبیعت کی ہوتی ہیں۔ یہی دردانہ کو لیجئے، علیگڈھ سے بی اے (آنرز) کیا، سنتا ہوں اپنے درجہ کی بہت قابل طالبہ ہیں اور اب بی۔ ٹی کر رہی ہیں مگر عقل کی تنگ نظری ملاحظہ ہو۔ ایک ہوشیار لڑکی نے دوست بن کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا اور ان کو اپنی غرض پر بھینٹ چڑھانے کیلئے ایک نہایت بے سر و پا بات کرنے پر تیار کر لیا۔ ان کی ساری تعلیم، تربیت اور عقل سلیم گھانس چرنے چلی گئی اور ان کو یہ ہوش نہ رہا کہ کیا کر رہی ہیں اور ان کی اس حرکت کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اگر ایک بات اور عرض کروں تو اس کو بھی معاف کرنا۔ آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں جہاں بہت سی باتوں میں بہت اچھی ہیں وہاں ان میں موجودہ تعلیم کے بعد ناقص پہلو کے سبب سے کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کمزوریوں میں سب سے زیادہ بڑی کمزوری ان کی طبیعت کی نشہ جیسی رومانیت ہے جو ہر گھڑی بے

پیئے، ان پر مسلط رہتی ہے یعنی اس شراب کو چکھتی نہیں مگر اس کے نشہ میں چور رہتی ہیں۔ جب دیکھو ان کی آنکھوں میں بہار آئی ہوتی ہے اور دل گدگدی کرتا ہوتا ہے۔ اس رات دن کی رومانیت کی سب سے بڑی وجہ پردہ سیمیں کی تصویریں ہیں جو ان لڑکیوں کے نازک بارہ دماغ کو رنگ جاب دکھاتی ہیں۔

انہوں نے رات کو پردہ پر دیکھا کہ ایک کالج کی لڑکی اپنی سائیکل پر سوار ایک نوجوان سے ٹکرا جاتی ہے اور اس ٹکر سے دونوں کا، چار آنکھوں کا اور دیگر جوارح کا تصادم ہوجاتا ہے۔ پہلے کڑوے کسیلے الفاظ کا تبادلہ ہوتا ہے پھر یہی الفاظ دیے پڑکر پریم دیوتا کے باتوں کا روپ دھارن کرلیتے ہیں اور آنکھوں کی راہ چل کر دل میں اتر جاتے ہیں۔ جب دل زخمی ہوجاتے ہیں تو اکانت کی سوجھتی ہے اور کسی جھرنے کے کنارے ایسے سندر بن کی تلاش ہوتی ہے جہاں ڈال ڈال پنچھی میٹھی گیت گاتی ہو ان چڑیوں کو چہچہاتے دیکھ کر یہ بھی پریم سنگیت کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور تصویر ان نوجوان دماغوں میں تخیلات کی آگ سلگا کر ختم ہوجاتی ہے۔ رات کو یہ تصویر دیکھی جاتی ہے اور صبح کو شہر کے ہر گوشہ میں دس بیس سائیکلیں لڑ جاتی ہیں۔ اس تصادم سے تصویر کا پہلا حصہ تو ہو بہو پردہ سیمیں جیسا ہوتا ہے یعنی کڑوے کسیلے کیا بلکہ لال مرچوں جیسے تیز تیز الفاظ کا تبادلہ ہوتا ہے مگر ان کا نتیجہ کسی سندر بن میں جا کر نہیں نکلتا بلکہ شہر کی کوتوالی میں یا کسی اسپتال کے امرجنسی وارڈ میں۔ یہ حال ہے ہمارے ہاں ان کالج کی لڑکیوں کا۔ نیلو معاف کرنا، میں تمہاری طبیعت کے اختلاف کو اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں پیش کرتا ہوں اس لئے تم کو میرے اس خیال سے چڑ کر یہ نہ کہنا چاہئیے "نیلو، آپ تو بکتے ہیں"

بات کہاں کی کہاں جا پڑی، دردانہ بیگم کو لئے بیٹھا تھا کہ کالج کی تمام لڑکیاں آگئیں - دردانہ کی ہنسی اور بات کا لہجہ اس قدر صوتی کیفیات سے بھرا ہوتا ہے کہ جب وہ ہنستی ہیں یا اوہ یا ہوں کہتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جلترنگ کے چھوٹے بڑے پیالے بج رہے ہیں - چنانچہ میں اس وقت ان کی اور مہدی صاحب کی مردانہ آوازوں کے مختلف اثرات پر غور کر رہا تھا مثلاً مہدی صاحب کی ہنسی سے دروازہ پر پڑا ہوا ململ کا پردہ کپکپانے لگتا تھا مگر مس دردانہ کی ہنسی سے اس پردہ کا صرف ایک باریک سا تار ہلتا تھا جو اس پردے کے کنارے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ میں کچھ اور سوچنا چاہتا تھا کہ جلترنگ بجا یعنی مس دردانہ ہنسیں اور پوچھا "مہدی تم آج بھی سینما چلو گے یا نہیں، کل کی شام تم نے یوں ہی اس بین خراب کی اور آج پھر ......" مہدی صاحب نے شاید مسکرا کر کہا "ڈارلنگ، تم تو مجھ سے ناحق خفا ہوتی ہو، مجھے سینما میں خاک لطف نہیں آتا، مجھے تو تمہارے پاس ......" پھر جلترنگ باریک سروں میں گونج اٹھا "اوہ، بس کیجئے، بس، جناب فرہاد صاحب ......" اور جلترنگ بجتا ہوا دور چلا گیا مگر اس کی پیدا کی ہوئی آواز بوئے گل کی طرح دیر تک ہوا میں کانپتی رہی۔

"اچھا" میں نے لیٹے لیٹے حیرت سے اپنے دل میں کہا "یہ آپ کے بھائی صاحب آگرہ میں فرہاد کے لقب سے پکارے جاتے ہیں اور یہ خوب ان کی ایک شیریں بھی ہیں جو ہنس کر جلترنگ بجاتی ہیں اور اپنی غلافی آنکھوں سے مسکراتی ہیں" میں نے چاہا اٹھ کر آواز دوں "مہدی صاحب، میں جاگ رہا ہوں، مہربانی کر کے ذرا آہستہ بات کیجئے یا پھر یہاں سے دور ہٹ جائیے" مجھے اب ان کی بے تکلفی باتوں کے سننے میں شرم سی آرہی تھی اور در پردہ ضمیر لعن طعن کر رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ پکاروں

اور میرا منہ اس غرض سے کچھ کھل بھی گیا کہ جلترنگ پھر بجا اور مدھم سروں میں آواز آئی "تم تو ناحق ہلکان ہوتے ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ پریشان کرتے ہو۔ ایک بار کہہ تو دیا ہاں، ہاں، ہم جب گھر چلیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا"۔ مہدی صاحب کی جذبات سے بھرائی ہوئی آواز آئی "ڈارلنگ مائین، تم ہمیشہ اس معاملہ میں زیادہ گفتگو کرنے سے انکار کرتی ہو، تمہاری اس ہاں سے میری پیاس نہیں بجھ سکتی۔ میں تمہارے لئے اپنی زندگی کے آئندہ پروگرام کو بدلنے کے لئے تیار ہوں مگر تم کو جیسے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں"۔ مہدی صاحب کی اس بات کا جواب نہ ملا تو میں اپنے خیال میں کھو گیا۔ نیلو ایک دن تم نے اپنے والد مرحوم کا کچھ حال سنایا تھا اور ان کی زندگی کا ایک واقعہ سنایا تھا جس میں شاید وہ اپنے کسی دوست سے اتنا خفا ہو گئے تھے کہ ان سے پھر کبھی نہ ملے۔ اور دوست کا قصور صرف یہ تھا کہ ان کے صاحبزادے نے اپنی مرضی سے کسی شریف گھرانے میں شادی کر لی تھی اور ان کی رائے نہ لی تھی۔ میں مرحوم کی زندگی کی اس بات کو سوچ رہا تھا اور اپنے کانوں سے ان کے صاحبزادے کو اپنی مرضی سے اپنی دلہن چنتے سن رہا تھا۔ اف یہ ۵۰ سال میں دنیا کس قدر بدل گئی اور آج شاید وہ بھی اپنے خیالات کو بدلنے پر مجبور ہوتے آج سے ۵۰ سال پیشتر کا زمانہ ایسا تھا جس میں والدین اپنی اولاد کی شادیاں اپنی مرضی سے کر کے وہی خوشیاں مناتے تھے جو شاید وہ اپنی شادی کے موقع پر کرتے تھے اس لئے کہ بیچاروں کی اپنی شادیاں تو بہت کمسنی میں ہو گئی تھیں جب ان کو کوئی ہوش نہ تھا یا پھر ان کی مرضی کے بغیر ہوئی تھیں اور ان کو صرف تعمیل حکم کرنا پڑا تھا۔

کیسا مہمل دستور اور کیسا دقیانوسی طریقہ تھا شادیوں کے رچانے کا، روتی ہوئی

ہچکیاں لیتی ہوئی نادان لڑکیاں نئے گھر اور نئے لوگوں میں اپنی زندگیاں گذارنے کو زبردستی بھیجدی جاتی تھیں اور چونکہ والدین خود اپنی بیٹیوں کی آئندہ زندگی کی طرف مطمئن نہ ہوتے تھے اس لئے دلہن کے ساتھ خود روتے تھے۔ ان زبردستی کی شادیوں کے نتیجے ظاہر ہیں۔ شاید سو میں دو چار گھر خوش ہوں تو ہوں ورنہ سب کے سب اپنی قسمت کو پیٹتے ہیں اور چپ چاپ غلام ہندوستان کی آبادی بڑھائے چلے جاتے ہیں یہاں تک خیال ہے کہ ہندوستانی گھروں میں خوشی اور چہل پہل کا نقدان محض اسی وجہ سے ہے کہ میاں بیوی کے مزاج مختلف ہیں ایک عرصہ سے ساتھ رہتے رہتے اس اختلاف کا احساس کم ہو گیا ہے مگر یہ اختلاف ہے ضرور اور کسی نہ کسی صورت میں دماغ کے لاشعوری حصہ کو متاثر کرتا رہتا ہے اور آئے دن طرفین کو ناخوش رکھتا ہے۔

جہاں ہم اپنے اسلاف کی کورانہ تقلید کو عین سعادت دارین سمجھتے ہیں وہاں ان کی اچھی باتوں کو بھی پلٹ کر دیکھتے نہیں اور اپنے ملک کے غلط رسم و رواج کو مذہب کا ایک جز سمجھے بیٹھے ہیں۔ ہمارے دور اولیں میں جب ہر طرف ہمارا بول بالا تھا ہمیں اس بات کی پوری اجازت تھی کہ اپنی ہونے والی دلہن کو خوب اچھی طرح دیکھیں، اس سے مل کر اس کے مزاج کا اندازہ کریں پھر شادی کریں۔ یہ بات معیوب نہ تھی اور نہ ایسا کرنے والا ذلیل سمجھا جاتا تھا، ہمارا ستارہ جب گردش میں آیا تو ہماری اخلاقی پستی بھی بڑھی اور کچھ دن کے بعد یہ حال ہو گیا کہ بقول اقبال ہر گھڑی ہمارے اعصاب پر عورت سوار رہنے لگی۔ جب ایسا مہلک طاعون ہر طرف پھیل رہا ہو تو ہر جو ہے سے خواہ وہ کھیت کا ہو یا موریوں کا بچنا ضروری ہو گیا، مرد اور عورت، آگ اور پھس، کی طرح الگ الگ رکھے جانے لگے جب ان دو صنفوں میں ایسی چھوت چھات ہونے لگی تو پھر

نہ پوچھئے کہ کیا ہوا منبت و منفی کا اجتماع ہوا نہیں کہ چنگاریاں چھٹنے لگیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم میں شاید دیگر قوموں سے جاہیاں زیادہ ہیں۔ ہمارے مرد عورتوں کا بس ایک مصرف جانتے ہیں اور ہماری عورتیں مردوں کو اسی طرح سمجھتی ہیں۔ ان کی نگاہ میں جوان مرد عورت کا ملنا صرف ایک غرض سے ہوتا ہے اور ان کے خیال میں ایسا کرنے والا سخت گناہگار ہوتا ہے۔

ہندوستان کی دیگر اقوام اس معاملہ میں بہت اچھی ہیں کہ ان کے سماج کے سدھار کرنے والے کثرت سے ہیں، یہ اپنا تن من دھن اپنی قوم کے لئے دے چکے ہیں۔ اور اپنے سماج کی ہر کمزوری کو دور کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے ہیں، ان کے گھروں کو دیکھئے کیسے صاف ستھرے، ان کی عورتوں اور بچوں کو دیکھئے، کیسے تندرست اور صاف ہوا کے عادی، ان کی پوشاک اور غذا کو دیکھئے کیسی مفید اور زود ہضم، ان کی سوسائٹی کو دیکھئے کیسی مہذب اور کیسی پراگندگی نہ اچھالنے والی، الغرض ان کے جس پہلو پر نظر ڈالئے روشن اور جاذب نظر، برخلاف اس کے اپنا حال کیا بتائیں، عورتیں، جاہل، گنوار، بزدل اور بھاگ کر چھپ جانے والی، ان کے گھر تاریک بند، کھڑکیاں دریچے ندارد، زنانہ مردانہ، باہر اندر، محرم غیر محرم، لال مرچ اور گرم مصالحہ، ان کے لازمی نتیجے سل، دق، ضعف معدہ، ضعف باہ وغیرہ، بچے تعویذ گنڈوں سے لدے پھندے سوکھے ہوئے چرم و استخواں اور حکیم صاحب کے گاؤزبان اور اطریفل کے مارے ہوئے زار و نزار، چاہو تو پسلیاں گن لو۔ نیلو میں حیرت میں ہوں اور سہما ہوا کہ یہ ہم کہ صرف باز ہیں اور ہمارا کیا حال ہوگا؟ تم نا امید کیوں ہوں؟ کیا یہاں آنا ترک کے بدلے کوئی اتنا ہندی پیدا نہ ہوگا؟

قصہ ناتمام رہا اور رات گزر گئی، دن بھر سودائیوں کو دیکھ کر اپنا دماغ خود سٹری جیسا ہوا جاتا ہے اور اگر تم نے خط کا جواب نہ دیا تو پاگلوں کا ڈاکٹر خود پاگل ہو جائے گا اور بیماران اصلاح جس کو وہ خود سیکھنے آیا ہے وہ خود اسی پر ہونے لگے گا!

(تمہارا بے بہین)

---

(۳۹)

آگرہ

۳۰ جنوری ۳۰ء

ڈارلنگ!

تمہارے خط کو پا کر اپنے تمام کرب و بےچینی کو بھول گیا ہوں اگر تم اپنے خط میں اپنی علالت کا حال نہ لکھ بھیجتیں تو میں شاید آج غصہ ہو کر باتیں کرتا کہ تم نے عرصہ سے مجھے بہت رلایا اور تڑپایا ہے، اس کا جرمانہ بھرنا پڑے گا وہ اس طرح کہ میں بھی تم کو ایک عرصہ تک خط نہ لکھوں گا لیکن تم مجھے برابر خط پر خط لکھتی جاؤ گی مگر میری تمام قیاس آرائیوں اور روٹھنے کے خیال کو تمہارے اس ورم جگر نے میرے لئے ورم دماغ بنا دیا ہے یہ اطبار یونانی کی تشخیص پر نہ جاؤ، ان کے لئے پیٹ کی ہر بیماری یا تو ورم جگر ہے یا ورم معدہ اور کس کا ورم تجویز کریں؟ ان کے پیٹ میں سوائے معدہ اور جگر کے اور کچھ نہیں ہوتا تم مہربانی کر کے وہاں کے سول سرجن کو دکھاؤ اور وہ جو کچھ تجویز کرے اس پر عمل کرو اور طبیعت جونہی سنبھلنے لگے فوراً رانچی یا آگرہ چلی آؤ، بنگالہ کی آب و ہوا مرطوب ہے اور تم کو راس نہ آئے گی۔ مجھے اپنی طبیعت کا حال مفصل (اگر طبیعت دربہ صحت ہو تب

لکھ بھیجو۔ میں گھبرا گیا ہوں اور جلد تمہاری طبیعت اچھی نہ ہوئی تو میں آ جاؤں گا اور دخل در معقولات کی طرح معافی مانگ لوں گا۔ میرے اگلے خطوں کا جواب دینے کی تم میں صلاحیت نہیں ہے ورنہ دیتیں۔ جان عالم، ایسا تکلف نہ برتو۔ جب طبیعت اچھی ہو تو جواب دینا۔ مجھے جلدی نہیں۔

تم نے فرمائش کی ہے کہ اپنے ناتمام قصہ کو میں پورا کروں اور تفصیل سے تاکہ تم لیٹی لیٹی اسے پڑھو اور لطف اٹھاؤ بالکل اس طرح جیسے کوئی ناول پڑھ کر اٹھاتا ہے۔ تمہارے لئے میں آسمان کے تارے توڑ لاؤں یہ کونسی مشکل بات ہے، یہ جو لکھتا ہوں آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ کانوں سنی لیکن حرف بہ حرف صحیح۔ جب مہدی صاحب کو کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے سمجھا دردانہ بیگم اس معاملہ میں جلدی کرنا نہیں چاہتیں اور خوب دیکھ بھال کر آگے قدم بڑھانا چاہتی ہیں۔ مجھے ان کے مزاج کے ضبط پر حیرت ہو رہی تھی کہ مہدی صاحب نے اس دفعہ پھر زور دے کر کہا: "ڈارلنگ، اگر تم میری باتوں کا جواب نہیں دیتیں تو دیکھو میں روٹھ کر باہر چلا جاؤں گا۔" جلترنگ بجا، مگر پھیکے سروں میں "یہ تم بے عقلی کی باتیں کرتے ہو، یہاں جس دن سے ملاقات ہوئی ہے بس ایک ضد پہ اترآئے ہو، ابھی اتنی جلدی کیا ہے، مجھے بی، ٹی کرکے کہیں اچھی سی جگہ پر ہو جانے دو، اس وقت تمہارا ڈاکٹری کا پرچہ بھی مکمل ہو جائے گا۔ پھر ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہوگا کریں گے۔" مگر مہدی صاحب ماننے والے لوگوں میں نہ تھے۔ ذرا ٹھنک کر کہنے لگے: "اوف، اس میں ابھی بڑی دیر ہے، اس وقت نہ جانے دنیا کا کیا حال ہو؟ میں تو فارس کے فلسفیوں کا قائل ہوں کہ جو کچھ ہے وہ آج مل جائے۔ کل نہ جانے کیا ہو۔" مہدی صاحب کی ضد سے شاید مس دردانہ چیں بجبیں ہو گئیں

اور جلبز نگ رک رک کر بجنے لگا "تم کو بس ایک ضد ہے، اس وقت ہمارا یہ خیال کتنا بے موقع اور مہمل ہے۔ وہاں بڑے بھائی کنوارے بیٹھے ہیں۔ ان پر ایک نامعقول لڑکی نے نالش دائر کر دی ہے، مقدمہ چل رہا ہے، سارا گھر گھبرایا ہوا ہے اور وہاں میں ایک نیا شگوفہ چھوڑوں، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔"

اب کمرہ میں خاموشی تھی اور مکمل، دیوار پر آویزاں کلاک کی ٹک ٹک ہو رہی تھی اور دور کہیں ریل کے جانے کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ خاموشی اور سناٹا کچھ اور بڑھ گیا، اب دور بہت دور انسانوں، جانوروں اور کوؤں کی ملی جلی آوازوں کا سمندر شور کرتا سنائی دے رہا تھا اور دنیا سے بہت اوپر اڑتی ہوئی چیلوں کی باریک سی پکار سنائی دے رہی تھی۔ انسانی فطرت بھی بعض وقت کتنی مجبور ہو جاتی ہے۔ مجھے ان دو پریمیوں کے معاملہ سے ایک غیر محسوس سی دلچسپی ہو گئی تھی اور میں لیٹا ہوا نہ صرف ان کی باتوں سے لطف لے رہا تھا بلکہ غیر ارادی طور پر اپنی جانبیا اور کیفیتوں سے مقابلہ کرتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں سراپا گوش ہو کر ہوا کی اڑتی ہوئی چیلوں کی پکار بھی سننے لگا تھا۔ مہدی صاحب کیمسٹری میں ڈاکٹری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز کے کیمیاوی مرکب سے کیا پیدا ہو گا مگر شاید ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ تریا ہٹ میں اگر بالک ہٹ ملا دیا جائے تو نتیجہ صفر ہوتا ہے چنانچہ دردانہ بیگم کے احساسات کا خیال نہ کر کے جونہی مہدی صاحب نے اپنی ضد کی "ڈارلنگ، یہ کوئی معقول وجہ نہیں، تم کو جلد کچھ کرنا ہی پڑے گا، میں ایسی بنیا بیوں کو دل میں لئے ہوئے کچھ کام نہیں کر سکتا۔" دردانہ بیگم جیسے برس پڑیں، جلبز نگ ایک دم جھنجھنا اٹھا "بے تابیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو گھر بیٹھ رہو۔ تم کو تیاب

ہونے کے لئے کون کہتا ہے ہنڈ یر تم تو ہر گھڑی لابورٹیری میں بیٹھے بیٹھے اپنی عقل و ہوش کو کہیں بانٹ آئے ہو۔ میں نے کہہ دیا کہ جب تک بھائی جان کی شادی نہ ہو لیگی میں اس قسم کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں آنے دوں گی"

مہدی صاحب کا عشق بڑے زوروں قسم کا تھا اور دردانہ بیگم کی ضد بھی ان سے کچھ کم نہ تھی۔ اس وقت وہ ضدی بالک اپنی اپنی ہٹ پر اڑے ہوئے زور آزمائی کر رہے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں نے کبھی اس قسم کا کوئی فرمان نادری جاری نہیں کیا۔ شاید میری اس کمزوری سے میرا پیکر خیال مرغ قبلہ نما ہو رہا ہے ہوا جدھر سے اٹھتی ہے اسی طرف منھ پھیر لیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی دل میں آیا کہ شاید مہدی صاحب کی خود اعتمادی مجھ سے زیادہ ہے اور دردانہ پر ان کو کافی بھروسہ ہے۔ یہاں نہ تو کبھی خود اعتمادی آئی اور نہ کبھی کسی نے کوئی ایسی حرکت کی کہ بھروسہ کرنے لگوں۔ میں اس رسہ کشی کا نتیجہ سننے کو بے قرار تھا کہ مہدی صاحب کے کرسی پر سے اٹھنے اور کمرے میں ٹہلنے کی آواز آئی۔ جلترنگ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا "سینما چلتے ہو یا نہیں" ذرا برگشتہ سی آواز آئی "معاف کرو" جلترنگ میں شوخی بھری لچکیی ہوئی "ڈارلنگ، تم تو ناحق بگڑ بیٹھے ہو اچھا بھیا کے مقدمہ کا فیصلہ سن لینے دو" مہدی صاحب نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ "محمود صاحب کے مقدمے سے ہماری زندگی کا کوئی تعلق نہیں" دردانہ نے جواب دیا "مگر میرا تو ہے، آپ کو نہیں معلوم، جب سے خالہ جان نے ان کے پیغام کو ٹال دیا ہے وہ بہت اداس رہنے لگے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ نصیب دشمناں اپنی جان ہلکان نہ کر لیں"

میں نے کروٹ لی، گفتگو کا موضوع اب میرے لئے بھی دلچسپ ہونے لگا

تھا۔ دردانہ نے پھر پرانی بات نکالی تھی۔ مہدی صاحب اب کچھ نرم ہو کر بولے "خالہ جان پر الزام دھرنا بے سود ہے۔ ماں اپنی بیٹی کے لئے جو کچھ کرتی ہے وہ بہتر کرتی ہے۔ ان کی سمجھ میں جو مناسب آیا وہ کیا۔" دردانہ نے اپنی آواز میں درد پیدا کر کے کہا "ہاں یہ ٹھیک ہے، میں اس میں کوئی اعتراض نہیں کرتی مگر میرا دل تو بہن کا ہے جو بھائی کے لئے دکھتا ہے۔ میں کب چاہوں گی کہ میرے بھائی کے رہتے ہوئے نیلو بہن غیر کے گھر چلی جائیں۔ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور خدا نہ کرے دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔" دردانہ بیگم ماشااللہ اب آہستہ آہستہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی تھیں اور شاید رفتہ رفتہ مطلب پر آ رہی تھیں۔ مہدی صاحب نے کہا "دردانہ تم پڑھ لکھ کر پرانے خیال کی رہ گئیں، شادی اپنی پسند کی چیز ہے اور اس کا انتخاب بہت وسیع دائرہ میں ہونا چاہئے۔ یہاں میں اپنوں اور غیر میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ یہ تو اپنی پسند کی بات ہے۔" دردانہ بیگم شاید اپنی آواز کے موسیقی کے اثر سے واقف تھیں بڑے پیار سے کہنے لگیں "ڈارلنگ تم تو بہت ماڈرن ہو گئے ہو، ہمیں کچھ سوسائٹی کا بھی خیال کرنا چاہئے" مہدی صاحب نے گویا کڑھ کر جواب دیا "آج تو تم بڑی بوڑھیوں کی طرح باتیں کرنے لگیں۔ اگر اپنی سوسائٹی کا خیال کرتی ہو تو پھر پردہ میں جا بیٹھو یا گھونگٹ نکال کر کسی سے ملا کرو۔" شاید مہدی صاحب نے گھونگٹ نکالنے کے طریقے بتائے تھے جب ہی دردانہ بیگم کی رقص کرتی ہوئی ہنسی کی آواز آئی اور کمرہ ایک بار پھر جلترنگ کی جھنجھناہٹ سے گونج اٹھا۔

گفتگو کی اہمیت اس بے موقع ہنسی سے جاتی رہی تھی مگر پھر دردانہ بیگم نے کوشش کی کہ وہی کیفیت پیدا ہو جائے۔ کہنے لگیں "مذاق کی بات نہیں، تم خود غور کرو کہ جیسے

میں ہوں۔" درِدانہ نے ہلکی ہنسی ہنسکر پھر کہنا شروع کیا "اگر مجھے کسی غیر کو دیدیا جائے اور ایسی حالت میں کہ تم مجھے چاہتے ہو۔" یہاں کچھ شرم اور کچھ شرم کو مٹانے کی ہنسی ہنسکر درِدانہ آگے بڑھیں "تو تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ تمہارا کیا حال ہو گا؟" مہدی صاحب بھی غالباً اس تشبیہ پر ہنس پڑے۔ کہنے لگے "میں ہرگز اس کو نہ چاہوں جو مجھے نہ چاہے اور ہرگز اس کے جانے کا غم نہ کروں جو خود سے جانا چاہتا ہو" درِدانہ بیگم نے گھبرا کر کہا "کیا مطلب میں نے کچھ اچھی طرح اس پہیلی کو سنا نہیں" مہدی صاحب کی آواز میں خشک شوخی کی جھلک آ رہی تھی، بولے "اب نہ سمجھیں تو نہ سمجھو، کون تم کو سمجھانے میں اپنا دماغ خرچ کرے۔" درِدانہ بیگم کی آواز میں خوشامد اور ناز کی لپک پیدا ہو گئی، پیار سے بولیں "اے تمہیں میری جان کی قسم بتا دو کیا کہا تھا۔" مہدی صاحب نے ہنس کر جواب دیا "تم تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی ہو، لو سنو، یہ محمود صاحب کی زیادتی تھی کہ اس لڑکی کے لئے اپنا پیغام بھیجا تھا جو ان کو پسند نہیں کرتی تھی، اماں نے جب پوچھا تو نیلو نے صاف جواب دے دیا تھا، تم ہی کہو ایسی حالت میں کیا یہ نیلو پر ظلم نہ ہوتا کہ محمود صاحب کے پلے باندھ دی جاتی۔"

میرا دل خوشی اور ناز سے ایسا دھڑکا کہ محسوس ہوا باہر نکل آئے گا۔ جی میں آیا چیخ چیخ کر گانے لگوں ؎

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ، خانۂ تست

اگر یہ خیال نہ ہوتا تو کہ میرے گانے سے یا اس قسم کی دیگر بے ساختہ حرکتوں سے مہدی صاحب اور درِدانہ بیگم کی باتیں ختم ہو جائیں گی تو میں ضرور گاتا یا نہیں تو کم از کم

کمرہ میں چک پھیریاں لیتا اور کبھی بھاگ کر کمرہ کی اس چیز کو اٹھا کر وہاں رکھ دیتا اور وہاں کی چیز کو لا کر یہاں رکھ دیتا، خوشی کا سیلاب امنڈتا چلا آرہا تھا، رگ رگ میں شراب جیسی مستی بھرتی جارہی تھی اور آنکھیں فرط ناز سے مخمور ہوئی جاتی تھیں میلو تم بڑی وہ ہو، تم نے کبھی آج تک نہ تو مجھ کو لکھا اور نہ کہا کہ یہ تمہارے صاف انکار سے محمود میاں کو ٹکا سا جواب مل گیا تھا۔ تم نے کس خوبصورتی سے شاید مجھے یاد آتا ہے کہ لکھا تھا" والدہ نے بات ٹال دی ہے اور ان کو آنے سے روک دیا ہے " تمہاری ان حرکتوں سے کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ تم مجھ سے بے تکلف نہیں ہو اور بہت سی خوشی مجھ سے چھپاتی ہو، دیکھو میں پھر کہتا ہوں کہ اتنی دوری کسی کو مار ڈالتی ہے اور وہ بے چارہ اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔

مہدی صاحب کو اللہ خوش رکھے ان کی صاف گوئی سے دردانہ بیگم کچھ لاجواب سی ہو کر رہ گئیں۔ مہدی صاحب دردانہ بیگم کی پسپائی دیکھ کر شاید کچھ رحم کھانے لگے، خوشامدانہ لہجہ میں بولے " ڈارلنگ، تم تو فضول غم کرنے لگتی ہو، دل کا آنا ایسا نہیں کہ زبردستی کوئی کسی سے محبت کرنے لگے۔ یہ چیز انسانی اختیار سے باہر ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا یہ کسی کے بس کی بات تھی کہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت پیدا کر دیتا، کیا محمود صاحب اگر چاہیں تو تمہارے دل میں کوئی چیز ڈال سکتے ہیں؟ تم خود اپنے دل سے پوچھو پھر کسی اور کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا " مہدی صاحب کی خوبصورت مردانہ آواز خاموش ہو گئی۔ دردانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی اور دیوار پر ٹنگے ہوئے کلاک کی آواز حرکت قلب کی سنائی دینے والی آواز کے ساتھ ملکر آنے لگی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا اور جاڑے کا مختصر سا دن چھپ گیا تھا اور سردی

کی زلف معشوق جیسی دراز رات دنیا پر اپنا قبضہ جمانے لگی تھی، کوے، طوطے اور چیلوں کی ملی جلی آوازیں اداس فضا میں شدت گرسنگی اور کش مکش حیات کے تاریک پہلو کو اور اجاگر کر رہی تھیں۔ ریلوے انجن کی سیٹی اور اس کے چلنے کی دھمک سے یہ احساس اور ابھر رہا تھا کہ دنیا محض بھاگ دوڑ اور کش مکش کی جگہ ہے۔ جہاں مضبوط کمزور کو کھانے کی فکر میں ہے۔ سردی خوب چمک اٹھی تھی اور دن بھر کی ٹھنڈی اور تیز چلنے والی ہوا تھک کر آہستہ چلنے لگی تھی۔

دردانہ بیگم کا کوئی جواب نہ پا کر مہدی صاحب شاید اپنے جملوں کے اثر پچھتانے لگے۔ ان کے لہجہ کی خوشامد اور بڑھ گئی کہنے لگے "ڈارلنگ چپ رہنے کی شرط نہیں، کچھ بولو نہیں تو میں بہت مغموم ہو جاؤں گا۔ پیا یا جھگڑا مول لے کر غم کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ بولو کچھ تو بولو؟" دردانہ بیگم نے بڑی دیر کے بعد زبان کھولی اور مغموم لہجہ میں بولیں "تمہارا کہنا صحیح ہے مگر کیا کروں کہ بہن کا دل نہیں مانتا، مجھے اپنے بھائی سے بہت پیار ہے، میں ان کے لئے دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتی ہوں، مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ میں خوش رہوں اور وہ کڑھتے رہیں اور ان کی نظر کے سامنے ان کی مرغوب چیز کو کوئی اڑا لے جائے۔" مہدی صاحب نے حیرت سے پوچھا "وہ کون ہے؟" دردانہ بیگم نے بن کر طنز سے جواب دیا "جیسے یہ کچھ نہیں جانتے۔ یہی آپ کے ڈاکٹر صاحب اور کون؟" میرا دل دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ مختلف قسم کے جذبات نے حلق میں گرہ بن کر سانس لینا دشوار کر دیا۔ جی میں آیا پکار کر کہوں "دردانہ بیگم، اب اور زیادہ نہ کہو ورنہ میرا کلیجہ، ہاں میرا کلیجہ مارے خوشی کے پھٹ جائے گا اور یہ ناحق خون تمہاری گردن پر ہو جائے گا۔"

٭

مہدی صاحب نے ہنسکر کہا "بیچارے، ڈاکٹر صاحب، تم نے یہ کیسے جانا کہ نیلو ان کو پسند کرتی ہے؟" دردانہ نے جواب دیا "اب اتنا تو نہیں جانتی مگر یہ سبھوں کا خیال ہے کہ وہ نیلو کو بہت چاہتے ہیں خواہ نیلو ان کو چاہے یا نہ چاہے" مہدی صاحب نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "یوں کہو، یہ زیادہ ٹھیک ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟۔ والدہ کا خط آیا تھا کہ بردوان کے کوئی آفتاب احمد، آئی، سی، ایس ہیں۔ ان کی عورتوں نے نیلو کو دیکھ کر بہت پسند کیا ہے اور ان کی طرف سے پیغام بھیجا ہے۔ اماں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ نیلو کی مرضی معلوم نہیں اور اسی درمیان میں وہ بخار میں مبتلا ہو گئی ہے اس لئے بات ملتوی ہے۔"

مہدی صاحب کا یہ جملہ صاف ستھرے آسمان کی بجلی تھی جو دفعتاً مجھ پر گری اور مجھے مفلوج کر کے چلی گئی۔ سارے جسم پر ملیریا جیسا لرزہ آیا اور میں نے محسوس کیا کہ سینہ کے اندر کوئی دھچکا لگا اور اب میں ایسا بے ہوش جاؤں گا کہ پھر کبھی ہوش نہ آئے گا۔ مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ دردانہ کی مدھم سی آواز کانوں میں آئی "اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں کہ نیلو کی شادی ڈاکٹر صاحب سے ہو یا آفتاب صاحب سے ان میں سے کسی ایک سے ہو سکتی ہے مگر بھائی جان سے نہیں ہو سکتی؟ اچھا تو میرا بھی عہد سن لو، جب تک بھائی جان کی شادی نہیں ہوتی میں اپنے متعلق اس قسم کی کوئی بات سننے سے انکار کرتی ہوں" مہدی صاحب اب کافی متاثر ہو گئے تھے۔ کہنے لگے "یہ کیا مہمل بچوں جیسی بکواس ہے۔ یہ کیا ضدیوں جیسی شرط لگانے بیٹھی ہو، تم کو اپنے بھائی سے اتنی محبت ہے کہ تم اپنی خوشی پر ان کی خوشی کو ترجیح دیتی ہو۔ شاید تم بھول گئی ہو کہ نیلو میری اکلوتی بہن ہے اور میں کبھی اس کو کسی سے کم پیار نہیں کرتا

تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں مجبور کر کے اسے تمہارے بھائی کے حوالہ کر دوں اور اس کے عوض میں تم مجھے اپنے آپ کو دیدو۔ میں ایسی کمینہ حرکت اور ایسا خودغرض طریقہ کسی حالت میں گوارا نہیں کر سکتا۔ میں بھی عہد کرتا ہوں کہ آج سے تمہارے سامنے اپنی مرضی کبھی نہ پیش کروں گا چاہے ایسا کرنے میں مجھے خون کے آنسو کیوں نہ رونا پڑیں"۔

میں آپ اپنی مصیبت میں گرفتار تھا مگر ان کے یوں دفعتاً جھگڑ کر الگ ہو جانے سے مجھے بڑا افسوس ہوا اور دل پر چوٹ سی لگی۔ ماشاءاللہ دونوں نے اپنے خون کے جوش کی آواز سنی اور اس کی آواز میں اپنی خوشیوں کو بھول گئے اور یوں قربانی پر اتر آئے۔ میرا دل بہت کمزور رفتار سے چل رہا تھا اور محمود صاحب کی سنائی ہوئی خبر کی یوں تصدیق ہوتے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اگر مجھ میں ذرا بھی سکت ہوتی تو باہر نکل کر ان کے دل کے میل کو دھونے کی تدبیر کرتا مگر شدت اضمحلال سے میرا حال خود خراب ہو رہا تھا اور بے خبری غفلت بن کر طاری ہو رہی تھی۔ اس نیم بے ہوشی کی کیفیت میں مجھے دونوں بہت ممتاز کیریکٹر کے انسان نظر آئے      دل چاہا کہ باہر نکل کر دونوں کی پیٹھ ٹھونک دوں .....۔

جان حیات، سن لی تم نے اپنے بھائی صاحب اور دردانہ بیگم کی آپس کی گفتگو مہدی صاحب نے بے خبری میں مجھ پر وہ آسمان توڑ ڈالا ہے کہ اس کے بوجھ کے نیچے پس رہا ہوں مگر مجھے نہ تو ان سے یا تم سے یا کسی اور سے شکایت ہے۔ یہ جو کچھ سن رہا ہوں وہ محض میری بدقسمتی بھیس بدل کر بول رہی ہے۔ مجھ پر جو عالم گذر رہا ہے اس کے بیان سے تمہاری طبیعت کو مکدر کیوں کروں۔ اور اس لئے میں نے اس کے

متعلق تم کو اتنا تک نہیں لکھا حالانکہ یہ خبر مجھے آج سے کئی دن پہلے مل گئی ہے۔ میں صرف اس انتظار میں جی رہا ہوں کہ تم مجھے اپنی زبان سے کچھ کہہ دو یا لکھ دو پھر میں خود ہی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں شاید تمہارے خیال کی بھی رسائی نہ ہوگی۔ میں غم سہنے کو تیار ہوں اور زخم کھانے کو بھی مگر اظہار درد دنیا والوں کے سامنے کرنے سے قاصر ہوں میں نے اپنی بے رنگ زندگی کے لئے الگ ایک پروگرام مرتب کر لیا ہے اور اس پر عمل کرنے کے لئے پابرکاب ہوں۔

اگر طبیعت اچھی ہوگئی ہو (اور خدا کرے کہ ہوگئی ہو) تو مجھے پوری بات بلا کم و کاست لکھ بھیجو اور میرے غم کی پرواہ نہ کرو۔ جواب جلد دو کہ اب مزاج کیسے ہیں۔ خدا حافظ و نگہبان۔

حکم کا منتظر

تمہارا

---

(۴۰)

آگرہ

۸ فروری ۱۹۴۳ء

اچھی نیلو!

تمہارے خط نے تشویش بڑھا دی ہے۔ سول سرجن کے علاج سے یقینی کوئی فائدہ ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ملیریا کہنہ ہوگیا ہے اگر اس خط کے پہنچنے تک طبیعت رو بہ صحت نہ ہو تو فوراً یہاں چلی آؤ۔ تاکید جانو۔ میں تمہاری طبیعت کی موجودہ حالت میں تمہارے مفصل جواب نہ دینے پر تم سے

ہرگز رنجیدہ نہیں ہوں۔ مجھے اب تمام دن اور رات ایک فکر مارے ڈالتی ہے کہ خدا کرے، کسی طرح تم جلد تندرست ہو جاؤ۔ دنیا کی باتیں اپنی جگہ پر ہیں، یہ ہوتی رہیں گی۔ اب ان کے لئے کہاں تک ہلکان ہوتا پھروں۔ سب چیزیں اپنے وقت پر یا تو ٹھیک ہو جائیں گی یا بگڑ جائیں گی۔ تم میرے لئے فکر نہ کرو، میں اچھا ہوں اور کسی قدر خوش بھی۔ غالبؔ نے خوب کہہ دیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

مجھے اپنے گذشتہ خط کے لکھتے وقت اس کا ذرا خیال نہ رہا کہ تم کو مہدی صاحب کے رنج سے اتنا رنج نہ ہوگا۔ مگر غور کرو تو اس میں اتنا رنج کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مہدی صاحب، ماشاءاللہ بڑے سوجھ بوجھ کے انسان ہیں اور اپنے ہر کام کے نتیجہ پر پہلے غور کر لیتے ہیں۔ میں اتنا کہے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتا کہ میں نے ان جیسے نوجوان بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کی صاف ستھری اور تندرست زندگی، نہایت قابل اور علمی ماحول، اپنے کام اور اس کی مصروفیتوں سے حد درجہ دلچسپی، کم سخن اور مزاج داں الغرض میں ان کو جتنا دیکھتا ہوں اتنا ہی ان کی عزت اور قدر میرے دل میں بڑھتی جاتی ہے۔ ان کی روز کی زندگی ایک نمونہ ہے ان کے ہم قوم نوجوانوں کے لئے۔ ستائیس اٹھائیس سال کی عمر، ریسرچ کے مشہور اسکالر، ٹینس کے بہت اچھے کھلاڑی، نک سک سے درست۔ دیدہ زیب اور جامہ زیب، ان تمام باتوں اور اوصاف حمیدہ کے باوجود جب دیکھو منکسر المزاج، با اخلاق اور خدمت کے لئے کمربستہ گفتگو میں کبھی اشارۃً بھی ایسی بات نہیں کرتے جس سے خودی کی بو آئے بلکہ ہمیشہ اپنی کمزوریوں

کو سامنے رکھ کر بات کرتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کے خیال کی مخالفت کی تو چپ ہو جاتے ہیں چاہے مخالفت کرنے والا غلط ہی کیوں نہ کہتا ہو۔ نیلو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کی بہت سی باتیں تم سے ملتی جلتی ہیں اور ان کی صورت کے بہت سے دیدہ زیب نقوش میں تمہاری جھلک اس قدر نمایاں ہے کہ میں اکثر ان سے لطف لینے لگتا ہوں

تم اپنے بھائی کے لئے دردانہ بیگم کی طرح اپنا جی نہ کڑھاؤ۔ تمہارے بھائی دردانہ بیگم کے بھائی صاحب سے بہت بلند اور ارفع چیز ہیں۔ شاہین اور چیل میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ دردانہ بیگم نے مچھلی کے دھوکے میں شاید سانپ کو پکڑ لیا ہے! مہدی صاحب نے دردانہ بیگم کو معقول جواب دے کر بالکل ایک مناسب حرکت کی ہے جو ایسی حالت میں ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان کرے گا۔ محبت کرنے کا معاوضہ، معاذ اللہ، میں اس خیال سے جھینپ جاتا ہوں۔ تمہارے بھائی صاحب کو دردانہ کی اس بے مروتی سے افسوس ضرور ہے اور شاید اندر سے وہ مغموم بھی ہوں مگر ایسے نہیں کہ میری طرح پلنگ پر لیٹ کر ہائے وائے کرنے لگیں، روزانہ علی الصباح حسب معمول اٹھتے ہیں، کام کرتے ہیں، کالج جاتے ہیں، لکھتے ہیں اور تھوڑی دیر ٹینس بھی کھیل آتے ہیں۔ اس درمیان میں جب کبھی مجھ سے ملاقات ہو جاتی ہے تو ہنس کر بات بھی کرتے ہیں اور اپنے کسی پروفیسر یا ساتھی کی حماقتوں کے مزیدار قصے بھی سناتے ہیں۔ الغرض اگر میں اپنے کانوں سے ان کی اور دردانہ بیگم کی کھٹ پٹ نہ سن لئے ہوتا تو شاید مجھے یہ ہرگز محسوس بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے اپنی ڈارلنگ سے منہ تھوتھا کر لیا ہے۔

اس واقعہ کے دوسرے دن، شام کو جب ہم دونوں اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر باہر برآمدہ میں بیٹھے تو برسبیل تذکرہ میں نے پوچھا "بھئی جب سے آیا ہوں تم سے

جی بھر کر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آگرہ شہر کی بہت تعریفیں سنی ہیں کہ یہاں تاج بی بی کا روضہ ہی، قلعہ ہے، اعتماد الدولہ کا مزار ہے، سکندرہ میں اکبر اعظم کی آخری خواب گاہ ہے کیا ہم اسے دیکھنے نہیں چلیں گے؟" میں نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ دیکھوں مہدی صاحب کا مزاج اس وقت کیسا ہے؟۔ وہ میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر بولے " ہاں ضرور، پرسوں تعطیل ہے، ہم پہلے سکندرہ چلیں گے، مجھے اکبر اعظم کے مقبرے کی شاندار عمارت اور اس کے وسیع اور کشادہ صحن اور برآمدے بہت پسند ہیں، عمارت بھی شاید اپنے طرز کی آپ ہے، مجھے افسوس ہے کہ یہ طرز عمارت جو بڑی حد تک شہنشاہ جہانگیر کی جودت طبع کا نتیجہ ہے مرحوم بادشاہ کے ساتھ ساتھ قبر میں چلا گیا۔ اگر اس طرز کو سراہا جاتا تو اس میں وسعت کی بڑی گنجائش تھی اور کیا عجب تھا کہ یہ طریقۂ عمارت سازی کچھ دنوں کے بعد اتنا عام ہوتا کہ سارے ہندوستان میں پھیل کر نہ صرف مردہ جسم کے لئے مزارات بنانا بلکہ زندہ لوگوں کے رہنے کے مکانات بھی تیار کرانے لگتا۔ افسوس ہے کہ شاہ جہاں نے اس طرف دلچسپی کا اظہار نہ کیا اور مقبرہ ہمایوں کو سامنے رکھ کر روضۂ تاج گنج کو بنوایا اور اس میں شک نہیں کہ روضۂ تاج گنج میں گنبد والی عمارت، درجۂ تکمیل کو پہنچتی ہے مگر مغلوں کی فن تعمیر کی دلچسپی اور اس کے اندر کے وسیع مکانات بہ تمام و کمال گنبد والی عمارت کی طرف مائل ہو گئے اور چونکہ گنبد والی عمارت کا صرف ایک مصرف ہو سکتا ہے یعنی جائے عبادت یا مزار اس لئے فن تعمیر کا مصرف محدود ہو گیا اور اس فن کو صرف مرنے کے بعد ضروری سمجھا گیا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں جہاں آخری قیام گاہ پر شاندار مقبرے تعمیر کئے گئے ہیں وہاں ان

صاحبان مقبرہ کے رہنے کے مکانات یا محلات حد درجہ معمولی اور پست ہوتے تھے"!

مہدی صاحب کو جیسے آگرہ کے طرز تعمیر سے گہری دل چسپی ہوگئی۔ میں ان کو سائنس کا خشک طالب العلم سمجھے ہوئے تھا مگر وہ کسی ماہر کی طرح آگرہ کی عمارتوں پر تبصرہ کرنے لگے تھے، چونکہ بات پر لطف تھی اور تمہارے بھائی کی زبانی اس لئے غور سے بیٹھا سنتا رہا، دوران گفتگو میں اکثر ہوں ہاں کر دیتا کہ ان کے کہنے کی دل چسپی قائم رہے، وہ کہتے گئے " ان مکانات کو چھوڑیئے اب ان کا کوئی پتہ نشان نہیں، شہنشاہ کے محلات کو دیکھیئے جو ... ندر ہیں یہ عمارتیں اکبری دور سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانہ تک کی ہیں۔ ان تمام محلات کو دیکھ جائیے بد سلیقہ اور بے ڈھنگے طور پر اوپر تلے چلی گئی ہیں، شاید انہیں عمارتوں کو دیکھ کر کسی ظریف نے دبے لفظوں میں کہا تھا۔ ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت، ان عمارتوں کی بلندی، پالش، پچیکاری، نہر، چھجے وغیرہ پر نہ جائیے یہ تو بادشاہوں کی ٹیپ ٹاپ تھی۔ گھر میں سونا وافر تھا، جے پور کی ریاست رشتہ داروں کی تھی، اپنے محلات کو عوام کی نظر میں ممتاز دکھلانے کے لئے کچھ کرنا ضرور تھا اس لئے قلعی کے بدلے سونے کی لیپ کرا دی، فرش، چھت اور دیواروں پر ہیرے جواہرات جڑوا دیئے اور سسرال سے سنگ مرمر کی سلیں مانگ لائے اور ان کو پائخانہ میں چپکا دیا۔ یہ ظاہرا شان و شوکت کی بات تھی، ان کی چمک پر نہ جائیے بلکہ یہ دیکھیئے کہ یہ عمارتیں انسانی ضرورتوں کو کس حد تک پوری کرتی ہیں: ان کی طرز تعمیر میں کوئی اصول ہے یا نہیں؟"

مہدی صاحب جوں جوں ان عمارتوں کی بنیاد تک پہنچ رہے تھے؟

ان کا جوش بیان بڑھتا جاتا تھا۔ ان کے صاف اور کھلتے ہوئے چہرے کے نقوش لطف اور دلچسپی سے معمور ہو کر اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی یونانی سنگ تراش کا حسین مجسمہ مصروف تکلم ہے۔ میں بھی ان کی باتوں کو شوق سے جی لگا کر سنتا رہا۔ "اصول کا فقدان تو یک سرے سے ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ طرزِ تعمیر میں فقدانِ اصول کی مثال ان عمارتوں سے دی جا سکتی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ صرف برآمدے، بارہ دریاں، چھجے، جھروکے، کھلے صحن، محراب اور حجروں کا نام محلات شاہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ راگ رنگ اور عیاشیوں کے رسیا بادشاہ ان محلات میں خلوت کہاں کرتے ہوں گے یا ان کے لئے پورا قلعہ جائے خلوت تھا؟ کیا جاڑا، گرمی برسات ہر موسم میں انہیں کھلی کھلی بارہ دریوں میں پڑے رہتے تھے؟ ان کی تمام بیگمات کیا سب کی سب مل کر ایک بڑے برآمدے میں سب کچھ کرتی تھیں اور اپنی تمام عمریں یوں ختم کر دیتی تھیں؟ مجھے تو ان محلات میں سوائے حجروں کے اور کوئی جگہ نہیں دکھائی دیتی جہاں جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ مل سکتی ہو یہ حجرے، اُف، کچھ نہ پوچھئے کہ کیسے ہیں؟ تنگ و تاریک جہاں دوپہر میں ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے۔ رات کی طرح اندھیرے اور قبر کی طرح تنگ اور گھٹے ہوئے جہاں چند دن رہنے کے بعد انسان دق یا اینمیا میں مبتلا ہو جائے۔"

مہدی صاحب کے بتائے ہوئے امراض دق اور اینمیا کو سن کر میرا خیال ان عورتوں کی طرف چلا گیا جو ان بیگمات کی دور کی رشتہ دار اور جانشین ہیں ان میں بھی دق اور خون کی از حد کمی ہے اور شاید اس لئے کہ ان کے اسلاف بھی

انہیں امراض میں مبتلا تھے۔ ان دونوں کے لئے وجہ ایک ہے یعنی تنگ اور غیر ہوادار مکانات۔ مہدی صاحب کہنے لگے۔ "ان تمام بے ڈھنگے برآمدے اور چھجوں کے مجموعہ میں صرف ایک عمارت ایسی دکھائی دیتی ہے جس میں فن تعمیر کا کچھ اصول نظر آتا ہے اور وہ ہے رانی جودھ بائی کا محل جو غالباً اسی طباع معمار کے حسن ظن کا نتیجہ ہے جس نے سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ اس معمار میں وہ تمام سلجھی ہوئی باتیں ہیں جو عمارت کو کار آمد اور مفید بنانے میں کام آسکتی ہیں مثلاً نہایت حوصلہ سے پوری عمارت کی مجموعی تصویر بنانا کہ اس کے ہر حصہ میں حسن ہو اور ہر حصہ ایک دوسرے سے میل کھائے۔ اس پوری عمارت کی نمائش دیدہ زیب ہو اور دور سے آنے والوں کو اپنی رفعت اور تناسب سے مخاطب کرے۔ پھر اس پوری عمارت کی جزیات کو اس طرح اپنی اپنی جگہ پر قائم کرنا کہ مجموعی حسن میں کوئی خلل نہ پڑے اور ساتھ ہی روزمرہ ضرورتوں کا بھی لحاظ ہو کہ اس میں متعدد کمرے ہوں، ہوادار اور روشن، برآمدے ہوں، سائبان اور صحن ہوں پھر کچھ کمرے ایسے بھی ہوں جو مختلف حصوں میں بانٹ کر مختلف لوگوں کو دے دئے جائیں الغرض ایسا فن تعمیر جو زندگی اور موت کے بعد دونوں دوروں میں برابر مفید ہوتا وہ افسوس ہے کہ اکبر اور جہانگیر کی موت کے بعد خود بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ افسوس یہ چیز اگر قائم رہتی تو ہندوستان کے ہزاروں شہر آج صاف ستھرے اور نہایت تندرست قسم کے مکانات سے بھرے ہوتے برخلاف اس کے جو آج ہم دیکھ رہے ہیں یعنی پست گندہ اور قبر کی طرح تاریک مکانات جن میں کوئی ڈھنگ کا حصہ نہیں، ہر چیز الٹی سیدھی بنی ہوئی اور ان کی مجموعی

حالت متعفن حجرے سے بدتر ہے ؎

اے بسا آرزو ہا کہ خاک شدہ

بات ختم کرکے مہدی صاحب نے میری طرف غور سے دیکھا۔ شاید ان کو شک ہو گیا تھا کہ میں اونگھنے لگا ہوں مگر ان کا یہ خیال غلط تھا! میں نہایت لطف لے کر ان کے لبوں کو ہلتے دیکھ رہا تھا اور ان کی باتوں کو سن رہا تھا۔ اب یہ دوسری بات ہے اور کسی سے کہنے کی نہیں کریں ان کے ہلتے ہوئے لبوں میں اوپر کے لب کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا کہ یہ ہو بہو تمہارے اوپر کے لب جیسا ہے اور بات کیوں چھپاؤں صاف کیوں نہ کہوں کہ کبھی کبھی ان کی ناک کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ گرچہ یہ تمہاری جیسی باریک اور ستواں نہیں مگر پھر بھی تمہارے بھائی کی ناک ہے۔ شام تبدیل ہو کر رات ہونے لگی تھی۔ باہر برآمدہ میں بیٹھے بیٹھے پاؤں ٹھنڈے ہو کر شل ہونے لگے تھے اس لئے میں نے کہا "مہدی صاحب، ماشاء اللہ، آپ نے مغل فن تعمیر کو خوب غور سے دیکھا ہے اور اس کے ایک زبردست ناقص پہلو کو اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ مجھے ان نادیدہ محلات سے ایک قسم کی گھن سی آنے لگی ہے مگر اکبر اعظم کا مقبرہ ضرور دیکھوں گا اور قلعہ کے اندر جودھ بائی کا محل۔ ان کو آپ نے اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ مجھے خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگا ہے کہ یہ بیچاری بن کھلی کلیاں تھیں جو کم عقل مالی کی غفلت سے ہمیشہ کے لئے مرجھا گئیں ہم انشاء اللہ پرسوں اسے ضرور دیکھیں گے۔ کیا ہم اب اندر چل کر بیٹھیں، یہاں سردی تیز ہو کر جسم میں پیوست ہوئی جاتی ہے۔"

مہدی صاحب اپنے خاص منکسرانہ انداز سے مسکراتے ہوئے اٹھے اور ہم

اندر جا کر نہایت آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئے ۔ رات کی تاریکی ہر طرف پھیل گئی تھی سڑک پر چلنے والے موٹر اور تانگوں کی آواز رفتہ رفتہ کم ہونے لگی تھی ۔ دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک نے سات بجائے ۔ ہمارا سلسلۂ خیال گھڑی کی آواز سے ٹوٹ گیا اور جونہی گھڑی کا بجنا بند ہوا ہم دونوں نے بیک وقت چاہا کہ کچھ بات کریں اپنی اس اتفاقی حرکت پر ہم دونوں مسکرا دیئے اور چپ ہو گئے ۔ پھر فوراً بعد ہم باتیں کرنا چاہ رہے تھے مگر اس بار پھر گویا ہماری باتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں ۔ مہدی صاحب نے ہنس کر خاموشی اختیار کر لی ۔ مگر میں چپ نہ ہوا ، پوچھنے لگا " میں نے سنا تھا محمود صاحب کی بہن ورِدوانہ بیگم بھی یہیں بی ۔ ٹی کر رہی ہیں کیا آپ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی ؟ " کہنے لگے " ملاقات قریب قریب روز ہوتی تھی ، وہ اسی یونیورسٹی سے بی ٹی کر رہی ہیں ۔ پہلے علیگڈھ گئیں مگر وہاں جی نہ لگا تو یہاں چلی آئی ہیں ۔ " میں نے بن کر پوچھا " یہ کیا ؟ ملاقات ہوتی تھی ؟ کیا اب نہیں ہو گی ؟ میں ان سے ملنا چاہتا تھا عرصہ سے ان کو نہیں دیکھا ہے ۔ " مہدی صاحب کے چہرہ پر بہت ہلکی سی کپکپی پیدا ہوئی یا شاید میرا یہ صرف خیال ہو ۔ کہنے لگے " آپ جس دن آئے تھے اس کے دوسرے دن وہ آئی تھیں اور میں نے آپ کا تذکرہ بھی کر دیا تھا کہ وہ اس وقت کمرے میں ہیں ۔ " میں نے حیرت سے کہا " ارے ، وہ آئی تھیں اور میں یہیں موجود تھا پھر مجھ سے ملاقات کیوں نہ کی ؟ " مہدی صاحب نے جواب دیا " میں آپ کے کمرہ میں گیا تھا مگر دیکھا آپ پلنگ پر لیٹے ہیں اور آپ کی آنکھ لگ گئی ہے اس لئے جگانا مناسب نہ سمجھا ۔ "

مجھ سے جس طرح ہو سکا میں نے بڑے زوردار طریقہ سے اظہار افسوس

کیا اور ان سے نہ ملنے کا ملال ظاہر کیا اور ساتھ ہی دل کا بھید لینے کے لئے یہ کہا۔
"مہدی صاحب، مجھے ان سے ملائیے۔ بڑی پر لطف آدمی ہیں۔ غالب کے اشعار بڑی مدھ بھری آواز میں پڑھتی ہیں کہ دل لوٹنے لگتا ہے، میں تو ان سے ضرور ملونگا"
مہدی صاحب کے چہرہ کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی اور اندرونی کش مکش کا اثر آواز پر بھی پڑا۔ بولے "آپ صرف ان کی شعر خوانی پر نہ جائیے، ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں جو میرا دل جانتا ہے مگر میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب ان کو تکلیف نہ دونگا
میں نے ہمدردی کے لہجے میں پوچھا "یہ کیوں، آخرش کیا ہوا کہ آپ صنف نازک کی ایک نہایت گداز پیکر جمیل سے یوں خفا ہو بیٹھے؟ اجی مہدی صاحب، آپ بڑے خشک کیمیا داں ہیں۔ بھلا کوئی جوان لڑکی سے بھی خفا ہوتا ہے؟" مہدی صاحب نے ذرا غمگین آواز میں کہا "آپ کا کہنا درست ہے کہ حسین چیز سے خفا ہونا اپنی حماقت کی دلیل ہے مگر کیا کروں ان کے سامنے احمق بننا ہی پڑا اور چند وجوہات کی بنا پر جن کو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا، میں نے اپنے دل میں ایک قسم کا مضبوط عزم کر لیا ہے کہ اب ان کی خوشامد نہیں کروں گا" ان کے دل پر چوٹ ضرور لگی تھی مگر اس کا گھاؤ کتنا گہرا تھا اس کا پتہ نہ چلا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ چوٹ معمولی تھی۔ بالکل اسی قسم کی جیسی میں تمہارے اس قسم کے جملوں سے محسوس کرتا ہوں بس رہنے دیجئے جانیے، مجھے تنہا چھوڑ دیجئے" یا پھر "میرے اللہ، کیا کروں، کہاں چھپ جاؤں کہ میری نگوڑی صورت پر کسی کی آنکھیں بار بار نہ اٹھیں!"
میں نے کہا "بھائی عہد یا عزم آپ نے کیا ہے، میں نے نہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، مجھے ملا دیجئے" وہ بہت بچکچا کر بولے "مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے

اگر آپ ان سے ملنا اتنا ضروری سمجھتے ہیں تو لیڈیز ہوسٹل کے ۱۱ نمبر کمرہ میں ان سے جا کر مل آئیے۔ مگر میں معافی چاہتا ہوں کہ از حد مجبور ہوں۔" یہ کہہ کر مہدی صاحب اٹھے اور گفتگو کے غمناک اثر کو کمرے سے باہر نکال دینے کے لئے ہارمونیم لے لیا اور مدھم آواز میں گانے لگے ؎

ہمارے گھر کبھی ان کا بھی آنا جانا تھا
خدا گواہ ہے کہ اپنا بھی اک زمانہ تھا

میں نے مہدی صاحب کو اکثر گاتے سنا تھا مگر اس میں کوئی خاص بات نہ پائی تھی بجز اس کے کہ آواز مردانہ اور صاف تھی اور غزلوں کو سیدھی طرح سے بغیر سر سے اترے ہوئے گا لیتے تھے مگر آج تو ماشا اللہ ایک سماں باندھ دیا تھا اور آواز میں گداز بھی کافی تھی۔ میں مبہوت بنا سنتا رہا۔ غزل ختم ہوئی اور ہماری اس شام کی صحبت بھی۔

میری اچھی نیلو، یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں مگر رہ رہ کر خیال تمہاری طرف جا رہا ہے۔ ممکن ہے کوئی بات دھیان سے گر گئی ہو اور کچھ غلط ہو گیا ہو تو معاف کرنا۔ اپنے مرض کا بہانہ کر کے لمبے خط کی فرمائش میرے خیال میں تکلف کی بات ہے میری جان تم تندرست رہو اور مجھ سے لمبے خط کی فرمائش کرو، دیکھو کر لکھتا ہوں یا نہیں؟ ان خطوں کے لکھنے میں خود اپنی دلچسپی ہے اس لئے تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری خاطر اتنی دردسری مول لیتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ خط کا جواب جلد دو اور طبیعت کا حال مفصل لکھو۔

(تمہارا)

(۱۴۱)

آگرہ

۱۰ فروری ۱۹۳۶ء

میری جانِ آرزو!

پرسوں ایک خط لکھ چکا ہوں اور جواب کا انتظار کئے بغیر آج پھر لکھ رہا ہوں آج صبح سے جی نڈھال ہے اور تمہارا خیال اس طرح آرہا ہے۔ جیسے پژمردہ اور پامال پھول پر شبنم کے قطرے گریں اور یہ نازک سے مجموعہ رنگ و بو کی ٹمٹماتی ہوئی حیات ذرا دیر کے لئے تر و تازہ ہوکر پھر جانکنی میں مبتلا ہو جائے میں کوشش کرتا ہوں کہ ان گھڑیوں کو الگ کروں جن میں تمہاری یاد میرے دل میں ٹیس پیدا نہیں کرتی تو دن رات میں کوئی لمحہ بھی مجھے ایسا نہیں ملتا۔ ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ خیال کی دنیا میں کوئی ہر وقت تمہارا نام لے کر پکارتا رہتا ہے۔ یہ آواز صاف نہیں بلکہ اس کی کپکپی اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور اس کے پیدا کئے ہوئے طلاطم دل و دماغ کو جھنجوڑتے ہیں۔ بعض وقت یہ آواز صاف ہوکر اتنی قریب ہو جاتی ہے کہ اس کے لمس کو محسوس کر کے دل اچھلنے لگتا ہے۔ سانس زیر و زبر ہونے لگتے ہیں اور اندر کچھ چبھن سی ہونے لگتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہی آواز مجھے اپنے ساتھ لئے آہستہ آہستہ دوڑتی ہوئی فضا کے کسی نامعلوم گوشہ میں چلی جاتی ہے اور مجھے وہاں اکیلا چھوڑ کر ارض و سما کے خلا میں اس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے بنسری کی آواز چاندنی راتوں میں دریا کی سطح پر ہلکی سی لہر چھوڑ کر غائب ہو جائے کیا کہوں کہ یہ آواز بڑی پرکیف ہے اور اسے سنکر میں کھو جاتا ہوں اور اپنے سے

سے بہت دور چلا جاتا ہوں۔

جان من، تم نہایت لطیف شے بن کر میری حیات اور میری دنیا کی ہر شے میں پیوست ہو گئی ہو اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری روح کا ہر ذرہ تم سے بنا ہے اور کبھی شک سا ہونے لگتا ہے کہ میں تم ہوں یا تم میں ہو، میرے دل کی دھڑکن میں، آنکھوں کی روشنی میں، انگلیوں کے لمس میں الغرض میری ہر شے ظاہر و باطن پر تم چھا گئی ہو۔ یہ "تم" پتہ نہیں کون ہے؟ نیلو ہے یا نیلو جیسی اور کوئی شے لطیف؟ میں تمہارے خیال میں اتنا منہمک رہتا ہوں کہ تمہارا خیال اب تمہاری ظاہری شکل سے بھی بے نیاز ہو گیا ہے۔ ہر گھڑی خیال میں صرف تم ہو جس کی کوئی شکل و صورت نہیں اور اگر اسے بیان کرنا چاہتا ہوں تو بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ تمہاری یاد بجلی کی طرح چھو جاتی ہے مگر جس طرح بجلی کے اجزاء کیمیادی کو بیان نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تمہاری یاد کن چیزوں سے بنی ہے وہ مجھے معلوم نہیں۔ واقف بہاری، جوانان مرگ شاعر نے اس قسم کی مجبوری کو کتنے حسین طرح سے شعر میں بیان کیا ہے ؎

کھینچ سکتا ہے کوئی کب نقشۂ رفتار برق
درخور امکاں نہیں ہے شرح کیفیات حسن
خرمن واسوختہ ہے آئینہ بردار برق
ہیں نہاں خاکستر دل میں تجلیات حسن

میری زندگی اور روح کی جان نیلو، تم سے کیا کہوں کہ کتنی اچھی ہے۔ یہ ہر گھڑی میرے دل اور دماغ میں میرے ساتھ رہتی ہے، میں جب سونا

چاہتا ہوں تو یہ مجھے لوریاں دیتی ہے، میں جب گھبرا اٹھتا ہوں تو یہ مجھے تسلیاں دیتی ہے اور میں جب روتا ہوں تو یہ اپنے آنچل سے میرے آنسو پونچھ کر کہتی ہے "میری جان اتنا نہ رو، کلیجہ پھٹ جائے گا"۔ الغرض کیا کہوں کہ اس نیلو نے مجھے اب تک جلائے رکھا ہے اور ایک تم ہو کہ کبھی سیدھے منھ بات بھی نہیں کرتیں مجھ سے دور دور رہتی ہو اور کبھی جھوٹوں بھی خیریت نہیں پوچھتیں۔ میری نیلو، دیکھو کیسی ہے یہ اس وقت بھی میرے پاس بیٹھی مجھے خط لکھتے دیکھ رہی ہے اور جب خط لکھ کر ختم کر دوں گا تو مجھ سے کہے گی "تم تو ناحق اتنی محنت کرتے ہو اور تھک کر چور ہو جاتے ہو، آؤ تمہیں سیر کرا نے لے چلیں"۔

خدایا تیری پناہ، میری بکواس، خیالی دنیا، خواب، لطف صحبت کی باتیں...... میں کیا دیوانہ ہو گیا ہوں؟ میری جان، کہیں اپنی اس رقیب سے خفا نہ ہو جانا، یہ تو کچھ بھی نہیں خیال کے ساتھ آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ یہ تمہارا کیا مقابلہ کرے گی؟ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ بیچاری کہاں سے آتی؟ اگر تم مجھے محبت کرنا نہ سکھاتیں تو آج یہ تجلیات کی دنیا کیونکر آباد ہوتی؟ تم کہیں سچ مچ میری خیالی نیلو سے رشک نہ کرنا۔ اس کا تم پر احسان ہے۔ یہی تو وہ ہے جو تم کو میرے خیال میں رکھے ہوئے ہے اور اگر یہ نہ ہو تو شاید میں تم کو پہچان بھی نہ سکوں۔ اب تو تمہاری زیارت کسی خاص تقریبی موقعہ پر ہوتی ہے مگر ایسا پہلے نہ تھا۔ اس وقت بیساختہ جی چاہتا ہے کہ ایک ملاقات کی جھلک پھر دیکھوں کہ تم کو دیکھے عرصہ ہو گیا ہے۔

پارسال کی ایک شام تھی، ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا تھا اور شاید کوئی

پندرہ بیس دن کے بعد دیکھنا نصیب ہوا تھا اور تم کو کس حال میں دیکھا تھا ؟
تمہارا وہ ٹھٹک کر مسکراتے ہوئے آنا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی شرما کر جھجک جانا اور پھر دوڑ کر چھپ جانا......... پھر ہمت کر کے دوسرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے آنا اور خواہ مخواہ کھڑکی کو بند کرنے کی کوشش بلیغ میں لگ کر اپنے نازک، خوبصورت اور سفید بازو اور گداز بھولی بھولی انگلیوں سے کھڑکی کے دونوں پٹوں کو پکڑ کر سامنے جھک جانا جیسے کھڑکی کے باہر کوئی چور کھڑا ہو اور تم اسے جھانک کر دیکھ رہی ہو اور جھکنے میں بیساختہ مجھ سے نظر کا پھر لڑ جانا اور جاتی ہوئی جھینپ کا پھر لوٹ آنا اور اتنی شدت سے کہ چہرہ چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملی تو سر کو جھکا کر اپنے کاندھے پر رکھ لینا...... ہائے کچھ نہ پوچھو کہ اس وقت دل نے کیا محسوس کیا تھا؟ اب جھینپ سے جیسے تمہارے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اسی جھکی ہوئی حالت میں یہ فکر ہونے لگی کہ میں نظر موڑوں تو دھڑ سے تم کھڑکی بند کر کے غائب ہو جاؤ اور اس غرض سے تمہارا اپنے سر اور چہرہ کو رہ رہ کر کاندھوں سے اٹھانا اور دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر شرما جانا اور پھر چہرہ کو چھپا لینا اور آخر میں گھبرا کر کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر بھاگ جانا الغرض تمہارا وہ دیکھنا، مسکرانا، شرما کر جھجک جانا، بل کھانا اور الٹے پاؤں بھاگ جانا۔ کیا کہوں کہ اب تک یہ جلوہ یاد ہے اور اس کے خیال سے آنکھیں مخمور ہو جاتی ہیں۔

اس وقت تم نے کیا پہن رکھا تھا وہ بھی سن لو، ہلکے گلابی رنگ کی ساری تھی جو تمہارے کھلتے ہوئے گندمی رنگ میں کیفیت شعلہ سامانی پیدا کر رہی تھی۔ اس وقت تمہارے چہرہ کی خوبصورتی اور جذبات کی فراوانی کو کون بیان کر سکتا

ہے۔ اس وقت تمہارا مکمل حسین چہرہ ایسے کنول کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا جس پر صبح کے آفتاب کی ہلکی گلابی کرنیں پڑ رہی ہوں اور نسیم سحری اٹھکیلیاں کرتی ہوئی اس کی نازک پنکھڑیوں کو پیار سے گدگدا رہی ہو۔ اگر سارے جہان کے نقاش تمہارے اس انداز کی تصویر کھینچنا چاہیں تو کھینچ نہیں سکتے۔ ساکن مجموعہ رنگ و بو میں وہ کیونکر تمہاری چنچلتا کو بند کر سکتے ہیں؟ شوخی ملی ہوئی جھینپ جو مسلسل آ، اور جا رہی ہو وہ ایک جگہ اسقدر کیونکر ہو سکتی ہے؟۔

اس دن تم تمام حسینوں سے بازی لے گئی تھیں۔ میں نے کسی میں تناسب اعضا کی ایسی تکمیل نہیں دیکھی جو تم میں تھی۔ تاروں کے جھرمٹ میں تمہاری حیثیت چاند کی سی تھی۔ میں حیرت اور خوشی سے تم کو دیکھ رہا تھا کہ میری مرکز خیال ماشاءاللہ کسی سے کم نہیں، اگر تمہاری کوئی چیز آنکھوں میں کھٹکتی تھی تو وہ تمہارے بازو تھے جو اب تک ذرا کچھ دبلے تھے مگر میں بھی کیسا احمق ہوں۔ تمہاری اتنی سی عمر میں تمہارے بازو میں گداز مانگتا ہوں، نازک ٹہنی میں جوان شاخ کی گولائی چاہتا ہوں۔ تمہاری اُس دن کی جھینپ کچھ بڑی پیاری تھی۔ مجھ سے دور دور رہ کر اپنی سہیلیوں سے ایسا گھل مل کر باتیں کرنا جیسے اس کمرہ میں اور کوئی نہ ہو اور ان سے بات کرتے ہوئے کبھی دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا دینا اور آنکھوں میں کہنا "گھبراؤ نہیں ان سے باتیں کر لوں تو تم سے بھی کروں گی۔"

جدائی محبت کی چاشنی ہے۔ فرقت وصال کو زیادہ مزیدار بنا دیتی ہے۔ تم کو دیکھے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب صرف تم کو دیکھنے کے خیال سے گدگدی سی ہونے لگتی ہے، جسم تھرتھرانے لگتا ہے اور دل دھکڑ پکڑ کرنے لگتا ہے۔ پتہ نہیں یہ نیک ساعت

کب آئے گی کہ میں تم کو دیکھوں اور اپنی اندھیری زندگی میں بجلی چمکالوں اور آنکھوں کو خیرہ کرلوں۔ تمہاری قربت سے دل جو گرمی محسوس کرتا ہے پھر اسی گرمی میں پسینہ پسینہ ہونے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔ کیا تم جلد نہ آؤ گی؟

میری جان، میں جب تم کو خط لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ بھول جاتا ہوں کہ میں خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے مزے لے کر باتیں کرنے لگتا ہوں اور جب کاغذ ختم ہو جاتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ کام کی کوئی بات نہ کر سکا اور اتنی ساری فضول باتیں کر ڈالیں۔ اب تم ہی کہو، کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میں تم سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ نہیں کی جا سکتی مگر ہر بار، ہر خط میں اپنے دل کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور پھر وہی سب کچھ کہنے لگتا ہوں جو نہ جانے کتنی بار کہہ چکا ہوں۔ میں شاید پروانہ ہوں جو جل چکنے کے بعد اگر پھر زندہ کیا جائے تو وہ پھر جا کر جل مرے گا۔ میری شمع، اونہہ، یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، مجھے تو "میری جان" کہنے میں لطف آتا ہے اور دل جذبات برافروختہ کی خلش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور آنکھیں نہ جانے کیوں جھپک جاتی ہیں۔ دن بھر میں نہ جانے کتنی بار تم کو میری جان کہہ کر مخاطب کرتا ہوں اور ہر بار زبان تکرار کا مزہ لیتی ہے۔

تمہاری مرضی کے مطابق یہ لو، یہ خط داستان دل کا ایک طویل باب ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو تم خدا کے لئے اپنی عینک لگا کر پڑھنا نہیں تو آنکھوں کے دکھنے کی شکایت کرو گی اور مجھے اس کا ذمہ دار ٹھیراؤ گی۔ خوب یاد آیا۔ نہ جانے کیسی ساعت میں تمہاری عینک آئی کہ اس دن سے لے کر آج تک تم کو جی بھر کر دیکھنا نصیب نہ ہوا، اور نہ یہ دیکھ سکا کہ اس عینک سے تمہارے حسن میں کتنا اضافہ ہوا اگر کیا اضافہ ہوگا؟ چودھویں کا چاند اور کتنا حسین ہو سکتا ہے؟ سنا تھا کہ وہ عینک تم کو پسند نہ آئی۔ یہ کیوں؟ عینک

آنکھوں کے آرام کے لئے ہے نہ کہ فیشن کے لئے۔ میرے خیال میں تم کو اس عینک سے کام لینا چاہیے، آہستہ آہستہ اس کی عادی ہو جاؤ گی تو درد سر کی شکایت جاتی رہے گی۔

طویل خط کی فرمائش اور ان خطوں کو شائع کرانے کا خیال، عرصہ ہوا کہ مجھے آسمان تخیل پر لے گیا تھا مگر اب تو یہ حال ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں اسے صرف کوئی پڑھ لے تو سمجھوں کہ محنت ٹھکانے لگی۔ کبھی تمہارے اس نادر خیال کو سنکر بہت خوش ہوا تھا کہ ہماری یہ داستان محبت ہمارے بعد بھی باقی رہے گی اور آنے والے جو ہمیں کبھی نہ دیکھیں گے اس داستان میں ہمارے دلوں کا دھڑکنا محسوس کریں گے اور کہیں گے۔ "ان کے دل ہماری طرح تھے اور کبھی ان میں محبت کی گرمی نے ایسی بے چینی پیدا کی تھی کہ کاغذ کے صفحے اب تک سیاہ نظر آتے ہیں"۔

کل رات آٹھ اور نو کے درمیان میں ماہیٔ بے آب کی طرح ایک کرسی سے اٹھکر دوسری پر جا بیٹھتا تھا۔ اس وقت بے اختیار دل یہ چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے ہوتیں تو میں کتنی محبت اور پیار سے تمہارے آگے گھٹنے ٹیک کر تمہارے ہاتھوں کو بوسہ دیتا اور تمہارے قدموں پر سر رکھ کر اتنا روتا، اتنا روتا کہ آنکھوں سے چھوٹی چھوٹی گنگا جمنا بہ نکلتیں۔ تم کو نہ جانے کونسا خیال روکتا ہے اور مجھے میرے شوق کی فراوانیاں بے ہوش کئے دیتی ہیں -- کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا کبھی تم کو میری محبت اتنا بیچین کر سکتی ہے کہ تم دیوانہ وار میرے پاس چلی آؤ اور کہو "بس رونا دھونا بند کرو۔ یہ لو تمہاری نیلو آگئی"!

میری جان! تم نے اپنے کسی خط میں لکھا تھا "اتنا گھبراتے کیوں ہیں، مجھے آپ کی باتوں کا خیال ہے"۔ اف کتنا حسین جملہ کتنے حسین لبوں سے نکلا تھا! تمہارے

ان جملوں کو یاد کرتا ہوں اور اپنے گرد اٹھتے ہوئے طوفان کو دیکھتا ہوں۔ تمہاری دلائی ہوئی امید تاریک رات میں بھنور کے اندر پڑی ہوئی کشتی کے لئے کنارے کا دیا ہے۔ اسی روشنی کو دیکھ کر ڈگمگاتی کشتی ڈوبنے سے بچ رہی ہے اور ملاح کے شل بازو میں آخری کوشش کی ہمت آتی ہے۔ دیکھو یہ کشتی یوں ڈگمگاتی ہوئی اپنے تھکے ہوئے ملاح کے ساتھ کب تک تھپیڑوں کی زد سے بچتی رہتی ہے؟

خدا کرے یہ خط بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے اور تھوڑی دیر تک تمہارے بستر علالت پر تمہارے لئے دل چسپی کا سامان پیدا کرے۔ مجھے اپنی صحت کا حال جلد لکھ بھیجو، از حد تعلق ہے۔ خدا حافظ۔ (بہت بے چین)

---

( ۴۲ )

آگرہ

۱۵ فروری ۳۶ء

ڈارلنگ!

تمہارے خط نے مرجھائے ہوئے کھیت پر بارش کا کام کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تمہاری طبیعت رو بصحت ہے اور تم جلد تبدیل آب و ہوا کے لئے آگرہ آنا چاہتی ہو، خدا کے لئے آؤ اور جلد آؤ، ایسا نہ ہو کہ آنے میں دیر ہو جائے اور وہ خود چلا جائے جو تم کو اتنے پیار سے بلا رہا ہے۔ غصہ نہ ہو، میں کوئی منحوس بات زبان سے نہیں نکال رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ جس غرض سے آگرہ آیا تھا وہ اس مہینہ کے آخری ہفتہ تک پوری ہو جائے گی اور مجھے رانچی واپس جانا پڑے گا۔ آج جی چاہتا ہے کہ درود یوار

پر طرح طرح کے بیل بوٹے بناؤں، گھر کو خوب صاف ستھرا کر کے اس کے رنگین فرش پر لوٹوں جس طرح بچے کسی تقریب کے موقع پر لوٹتے پھرتے ہیں۔ کبھی آسمان پر غصہ آتا ہے کہ یہ خوب شوخ رنگ میں کیوں رنگ نہیں جاتا۔ اور کبھی نامراد زمین کو کوستے دیتا ہوں کہ یہ پھولوں سے لد کیوں نہیں جاتی؟ الغرض آج کیا کہوں کہ میں کیا ہو گیا ہوں؟ دل نغمے گا رہا ہے اور ہر سانس ستار بجا رہا ہے، اور خوشی سے مدہوشی کا یہ عالم ہے کہ بن پئے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں اور زمین پر جو قدم پڑتا ہے وہ گویا چوتھے طبق پر پڑتا ہے فضا میں ہر طرف خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ جیسے عید کے دن مبارک، سلامت کے پیغامات دوڑ رہے ہوں۔ ہوا اٹھلاتی ہوئی آکر چھیڑتی ہے، زمین پر اگا ہوا سبزہ تلوؤں میں گدگدی کرتا ہے اور تمنائیں آرزوئیں جوق در جوق ہنسی سے بلبلاتی چلی آرہی ہیں آج میرے ہاں برات آئی ہے اور ہر طرف وہ رونق اور گہما گہمی ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کیا تم واقعی آرہی ہو! ؎

خراماں خراماں چلے آرہے ہیں

گلستاں گلستاں ہوا جا رہا ہے

جب خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول جائیں تو خط اور لمبے مزیدار خط کی فرمائش کیونکر پوری کروں؟ جذبات کی فراوانی میں من کی یکسوئی کہاں؟ یہ پگلی تو کپڑے پھاڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی؟ اسے کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟ ......... مگر خیر! تعمیل حکم کرتا ہوں، اب چیز پسند نہ آئے یا کوئی بات خلاف مزاج ہو جائے تو میرا ذمہ نہیں۔ کیا لکھوں، مضمون کی تلاش کہاں کروں؟ تمہارے بھائی صاحب عجیب خشک مزاج ہیں۔ ان کے ساتھ رہ کر اپنی داستان کو کیوں کر رنگین بناؤں۔ ان سے

ملنے ان کے کالج کی لڑکیاں آتی ہیں مگر سب اپنی اپنی فکر میں۔ کوئی سبق پڑھنے کے بہانے، کوئی ٹینس کھیلنے کے لئے، کوئی ٹل طلب کیمسٹری کا فورمولا لئے ہوئے۔ کوئی آکر چلی جاتی ہے، کوئی جاکر نہیں آتی، کوئی اندھی، کوئی بھینگی، کوئی ٹھنگنی اور کسی کے دانت باہر نکلے ہوئے، الغرض میں بیٹھا ان تصویروں کو چلتے پھرتے دیکھتا رہتا ہوں اندرونی ہی دل میں ہنستا ہوں کہ یہ بیچاریاں پڑھ لکھ کر کہیں نوکری کر کے اپنی حسرت بھری زندگی کو گذار دیں گی صرف ایک امید میں کہ کوئی ان سے محبت کرے عورت کو بدصورت بنانا فطرت کا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اے کاش یہ بیچاریاں پیدا نہ ہوئی ہوتیں!

ان کو دیکھ دیکھ کر مجھے وہ پیکر رعنا ہمیشہ یاد آتی ہے جو اتنی جمیل ہے کہ مہدی صاحب جیسا وقت پسند اور سخت گیر انسان اس کے آگے اپنی ہار مان چکا ہے وردانہ بیگم کی یاد آتے ہی میرے کانوں میں جلترنگ بجنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ میں جس وقت ماہ نیم ماہ کو دیکھنے میں کھو جاؤں تو یہ پاس ہی کہیں بجتا رہے جیسے کسی پجاری کے سجدۂ عقیدت کے وقت مندر میں ستار بجائے جاتے ہیں۔ کہ مورتی کو اپنے ساجد کا سجدہ پسند آجائے۔ مجھے مہدی صاحب کا انتخاب پسند ہے اور یہ جوڑا خوب رہے گا مگر خواہ مخواہ محض مہمل سی بات پر بدمزگی پیدا ہو گئی ہے مجھے اس کا سخت افسوس ہے اور ۔۔۔۔ کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میری وجہ سے ان کا عیش منغض ہو گیا ہے۔ اگر آج میں نہ ہوتا تو اس قسم کی کوئی رسہ کشی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے اس پھانس کی چبھن کو دور کرنے کی جو کوشش کی اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ حسب ذیل ہے۔

اس واقعہ کے متعلق میں نے اپنے گذشتہ خط میں لکھا تھا کہ میں نے مہدی صاحب سے کہا کہ مجھے دردانہ بیگم سے ملائیے مگر وہ میری بات پر راضی نہ ہوئے۔ اس گفتگو کے دوسرے دن میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر لیڈیز ہوسٹل پہنچا اور گیارہ نمبر کے کمرہ میں ان کو ایک آرام کرسی پر دراز پایا۔ شام کے ۵ بجے تھے اور لڑکیاں کچھ باہر چلی گئی تھیں اور کچھ بیڈمنٹن وغیرہ کھیل رہی تھیں۔ ہوسٹل سونا تھا۔ بعض بعض کمرہ سے لڑکیوں کے ہنسنے اور ٹھٹھول کرنے کی آواز آرہی تھی گویا ان کمروں میں ساز سنگیت بج رہا تھا۔ جوان لڑکیوں کے قہقہے موسیقی کے سفید ہنس ہیں جو ان قہقہوں کو سننے والوں کے ہوش و حواس کو لے کر لنکا کی طرف اڑجاتے ہیں۔ خیریت تھی کہ میرے پاس اس قسم کی کوئی چیز کو تم نے نہیں چھوڑا ہے ورنہ میرا بھی وہی حال ہوتا جو اوروں کا ہو چکا ہے۔ میں نے اپنا کارڈ اندر بھیجا۔ کارڈ دیکھتے ہی دردانہ بیگم کی جلترنگ جیسی آواز گنگنانے لگی اور اس کے گونج سے سارا کمرہ بول اٹھا۔ "آئیے آئیے، ڈاکٹر صاحب، آداب عرض ہے، آپ نے بڑی مہربانی کی وغیرہ وغیرہ"۔ مجھے ان کے تمام الفاظ یاد نہیں آتے جو انہوں نے میرے استقبال میں مجھ پر برسا دیئے تھے۔

جھولی چھوٹی تھی اور پھول بہت سے تھے!

میں نے بیٹھ کر پہلے ان کو غور سے دیکھا۔ اس آٹھ ماہ کی مدت نے ماشاءاللہ چشم بددور، ان کو خوب حسین بنا دیا تھا۔ گداز جسم اور مرمریں باہیں، کلائی، انگلیاں رخسار، الغرض شباب نے ان کے ہر عضو میں مخمل کا گداز اور ریشم کی چمک پیدا کرکے گلاب کا رنگ بھر دیا تھا۔ سر سے پاؤں تک جہاں نظر پڑتی تھی پھسلی جاتی تھی۔ اور اگر دل میں کوئی تمنا ہوتی تو وہ ہر جگہ مچل کر کہتی۔ "مجھے بس یہیں چھوڑ دو" دردانہ

شاید دردانہ نے صرف خود کو سنانے کے لئے کہا تھا مگر میں نے بھی سن لیا اور تبسم زیر لب سے ان کی اس نادر تشبیہہ کی داد دی۔

دردانہ نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب کب آئے۔کیوں آئے، کب تک رہیں گے، آپ کو میرا خط ملا تھا، کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا نہیں کیا تو پھر ایک بار میں اپنی حماقتوں کی آپ سے معافی چاہتی ہوں" میں نے گھبرا کر کہا "بس بھئی بس، میں سب کچھ بتاؤں گا، پہلے مجھے سانس تو لینے دو" میری بوکھلاہٹ پر وہ ہنس پڑیں اور قریب بیٹھے ہوئے چچا بھتیجی نے ہماری طرف دیکھا اور آپس میں معنی خیز ہنسی ہنسنے لگے۔ دردانہ بیگم نے ان کی اس اظہار غلط فہمی کو دیکھ لیا اور غصہ سے آگ بگولا ہوگئیں۔ چڑ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھ سے کہا "چلئے احاطہ میں ٹہل کر باتیں کریں گے، یہاں نامعقول لوگوں کا اجتماع ہو گیا ہے" مجھے دردانہ بیگم کے مجروح جذبات سے ہمدردی تھی، تعمیل حکم میں سرو قد کھڑا ہو گیا اور ایسی چال سے چل کر باہر جانے لگا جس میں احتجاج کی دھمک اور فریاد کا شور تھا۔ محترمہ کے پاس سے جب ہم گذرے تو انہوں نے ذرا ہنستے ہوئے دردانہ سے کہا "چلیں اچھا، اتنا جلد" دردانہ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ لاپرواہی سے اپنی گردن میں ذرا سا خم ڈال دیا اور اپنی ٹھوڑی کو ذرا اور اونچا کر لیا۔ میں سیہ سالار کے پیچھے پیچھے تھا۔ مجھے بھی لامحالہ وہی کرنا پڑا جو وہ کر رہی تھیں اور ہم دونوں لقا کبوتر بنے باہر چلے آئے۔

باہر نکل کر کھلی ہوا میں دردانہ بیگم نے ایک لمبا سانس باہر پھینکا جیسے ملاقاتی کمرہ کی ایسی ہوئی فضا سے ان کا دم گھٹ رہا ہو اور سرو کے گاؤدم درخت کی طرف

بیگم نے کالج سے آکر اپنی سفید ساری بدل ڈالی تھی اور ہلکے آسمانی رنگ کی ساری باندھ لی تھی اور گہرے نیلے رنگ کا اونی سوئٹر کوٹ پہن لیا تھا، سینڈل سفید رنگ کے تھے۔ اور ان کے بالوں کا جوڑا اُس قدیم مصری مشاطہ کے ہاتھ چومنے پر مجبور تھا جس نے آج سے ہزاروں سال آگے اپنا کمال فن اپنی حسین مالکہ کے خوبصورت گھنگھریالے بال کے سنوارنے میں دکھایا تھا۔ ان کا یہ جوڑا ان کے خوبصورت بیضوی شکل پر بہت زیب دیتا ہے۔ حسین چہرہ پر آنکھیں گاڑے رہنے سے آنکھیں نہیں تھکتیں اور چاہتا تو آسمانی پری کے لہلہاتے ہوئے باغ کی کیاریوں پہ ٹہل ٹہل کر خوب لطف و سرور کے مزے لوٹتا مگر میں نے کہا "دردانہ بیگم مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے وہ پیچھے بیان کروں گا، پہلے ہم لوگ چل کر ہوسٹل کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھیں، میں نے زیادتی کی جو ملازمہ کے روکنے سے بھی نہ رکا۔ کیا فائدہ کہ وہ فضول شور کرتی پھرے۔" انہوں نے کہا "ہاں ٹھیک ہے چلیے۔" ہم جس وقت ملاقاتی کمرے میں پہنچے تو کئی بھائی اپنی بہنوں سے اور کئی ماموں اپنی بھانجیوں سے اور اسی قسم کے اور کئی رشتہ دار ہنس ہنس کر رازدارانہ لہجہ میں بڑی اہم گفتگو کر رہے تھے۔ ہم بھی ایک بید کے بنچ پر بیٹھ گئے۔ قریب ہی ایک محترمہ اپنے چچا سے گفتگو کر رہی تھیں اور ہمیں بیٹھتے دیکھ کر دردانہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرائیں اور ان کے چہرہ پر تشفی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ محترمہ کے چچا جو عمر میں شاید اپنی بھتیجی سے بھی کم تھے۔ پہلے دردانہ کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور پھر میری طرف خاص ادا سے مسکرا کر دیکھنے لگے۔ جیسے ان کو میری قسمت پر رشک آرہا ہو۔ دردانہ نے محترمہ کی مسکراہٹ کا جواب "کتیا" کہہ کر دیا۔ یہ لفظ

نظریں کئے ہوئے بولیں "اف اس مردار نے میٹھنا مشکل کر دیا تھا اور اس کا وہ ناہنجار ...... جو چچا بن کر آتا ہے اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے شرم بھی نہیں آتی! میرا بس چلے تو ان تمام بھائی بہنوں، ماموں بھانجیوں اور چچا بھتیجیوں کو جوتی مار کر باہر کر دوں، کیسے بے شرم اور بے حیا لوگ ہیں ؟" میں نے دیکھا کہ اگر یوں چھوڑ دیتا ہوں تو دردانہ بیگم کا غصہ صبح تک ختم نہ ہوگا۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "مس دردانہ چھوڑ دیئے برائے بکھیڑوں کو، میں تو اس غرض سے حاضر ہوا تھا کہ سچ بتاؤں؛ خفا نہ ہوں گی؟ آپ کو دیکھوں" میں نے ہنس کر جملہ پورا کیا "اور اگر ایک بار پھر ہو سکے تو غالب کا وہ شعر اسی بے تکلف انداز میں سنوں" دردانہ بیگم ہنس پڑیں اور ان کی ہنسی سے جاڑے کی ٹھٹھری ہوئی ہوا گرما گئی اور زناٹے سے خوشی کا ستار بجاتی ہوئی فضا میں دوڑ گئی وہ ہنس کر بولیں "ڈاکٹر صاحب آپ تو مذاق کرتے ہیں، بھلا میری حقیقت نیلو کے سامنے کیا، آپ تو ان سے تمام شعرائے اردو کے دیوان سنئیے، میں بیچاری کس گنتی میں ہوں" میں نے چھیڑنے کے لئے ناز اٹھانے والے لہجہ میں کہا "اجی دردانہ بیگم آپ تو خاکساری پر اتر آئی ہیں۔ آپ کی قدر وہی کر سکتا ہے جو ہیرے کو کنکریوں کے ڈھیر سے چن سکتا ہو" وہ پھر ہنسیں اور اس دفعہ مولسری کے درخت پر بیٹھی ہوئی بلبل چہچہانے لگی اور خوشی سے پھدکنے لگی۔

میں نے کہا "خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، میں آیا اس لئے تھا کہ آپ کی شکایت کروں کہ آپ اس دن مہدی صاحب سے ملنے گئیں، ناچیز بالکل بغل والے کمرہ میں تھا مگر آپ کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بلوا بھیجیں یا کم از کم خود آ کر مل جائیں" ان کے موزوں چہرہ پر ہنسی اور متانت نے مل کر ہلکے سرخ رنگ کا غازہ مل دیا تھا

کہنے لگیں "مجھے خود افسوس ہے کہ آپ سے نہ مل سکی، مہدی صاحب نے کہا کہ آپ تھک کر آرام کر رہے ہیں اس لئے جگانا مناسب نہیں" میں نے جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں اس دن سے میں آپ کا برابر منتظر رہا مگر نہ آپ آئیں اور نہ مہدی صاحب نے آپ کے نہ آنے کی کوئی معقول وجہ بتائی۔ آخر بھئی میں پیاسا تھا خود ہی کنوئیں کے پاس دوڑا آیا کہ دیکھوں کہیں آپ نے مجھے بھلا تو نہیں دیا" مہدی صاحب کا نام سن کر، میں نے دیکھا جیسے ایک دم ان کے چہرہ کی سرخی کم ہو کر اور بڑھ گئی انہوں نے اپنے خون کے اس ہیجان کو چھپانے کے لئے جواب دیا "آپ ایسے نہیں کہ آپ کو بھلا دیا جائے، میں کسی دن آپ سے ملنے آجاتی۔ آپ نے ناحق تکلیف کی اور میرے نہ آنے کی کوئی وجہ ہوتی تو مہدی صاحب آپ کو بتاتے" میں نے کہا "خیر وجہ کچھ ہو یا نہ ہو، میں تو آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں؟"

دردانہ بیگم میری فرمائش کے لئے تیار نہ تھیں، اس افتاد ناگہانی سے کچھ سٹپٹا گئیں اور ان کے رسیلے گداز لب والے منھ کے کونوں پر تشویش جھلکنے لگی۔ میں نے ان کی گھبراہٹ کو تاڑ لیا اور ان کو خیالی مصیبت سے چھٹکارا دلانے کیلئے ان سے کہنے لگا "مس دردانہ، گھبرائیے نہیں، میں آپ سے زیادہ کچھ نہ مانگوں گا۔ آپ کو معلوم ہے۔ میں نے آگرہ کبھی نہیں دیکھا، یہاں پہلی بار آیا ہوں، سنتا ہوں، قدیم عمارتیں بڑی نادر اور عجائب عالم میں سے ہیں۔ مہدی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کل مجھے سکندرہ دکھانے لے جائیں گے۔ کل تعطیل ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ سکندرہ نہ چلیں گی؟" میرے کہنے میں خوشامد کا جز زیادہ تھا اور مردوں کے ہاتھ میں یہ اتنی زبردست چیز ہے جس سے وہ ہر عورت کو راضی کر سکتا ہے۔ دردانہ بیگم

سکیں گے۔ مگر میری بے تابیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگے اور جب دوبارہ میں نے بڑے شوق سے کہا: "مہدی صاحب آپ کو چلنا پڑے گا، میں نے دردانہ سے وعدہ کر لیا ہے۔ مجھے کم از کم ان کی نگاہ میں جھوٹا نہ بنائیے"۔ تو وہ کچھ غور کرنے لگے اور آخر میں قہرِ درویش برجانِ درویش والے مقولے کو سوچ کر خاموش ہو رہے۔

ٹھیک دو بجے ہم ہوسٹل پہنچے، دیکھا دردانہ بیگم سرمئی رنگ کی ساری اور نیوی بلو کوٹ پہنے چلی آ رہی ہیں۔ میں نے بڑھ کر ان کا بڑا کوٹ لے لیا اور تانگے کی پچھلی نشست پر جہاں میرے اترنے سے مہدی صاحب کے بغل میں جگہ خالی ہو گئی تھی وہاں مس دردانہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہایت پر تکلف لہجہ میں کہا: "یہ ہیں مسٹر مہدی حسن، ایم، ایس، سی، ریسرچ اسکالر"۔ اور مہدی صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا: "آپ ہیں مس دردانہ بیگم، بی، اے، آنرز، دونوں مسکرا کر ہنس پڑے۔ مہدی صاحب نے تانگے سے اترتے ہوئے کہا: "یہاں آپ بیٹھئے میں آگے ........" مگر میں یہ کہتا ہوا مہدی صاحب کے اترنے سے پہلے تانگے والے کے پاس اگلی نشست پر جا بیٹھا "گستاخی معاف، آپ ہی مس دردانہ کو زیادہ خوش کر سکیں گے"۔ یہ کہہ کر میں نے سگریٹ نکالا اور جلا کر مزے سے پینے لگا اور کنکھیوں سے دیکھا کہ دردانہ بیگم کوئی راہ فرار نہ پا کر وہیں خالی جگہ پر بیٹھ گئی ہیں اور مہدی صاحب نے شاید اخلاق میں کھسک کر پچھلی نشست میں اتنی جگہ بنا دی ہے کہ ان دونوں کے درمیان اگر میں چاہتا تو بخوبی بیٹھ سکتا تھا۔

تانگہ چلا اور پرانے شہر پناہ کے دہلی دروازہ سے ہوتا ہوا سکندرہ کی طرف

نے مجھے غور سے دیکھا جیسے وہ میرے لہجہ پر اعتبار نہ کر رہی ہوں مگر جب دیکھا کہ یہ واقعی بھکاری ہے اور کسی کا بھیجا ہوا نہیں تو افسوس سے کہنے لگیں "کل تعطیل تو ضرور ہے مگر مجھے چند ضروری کام ......" میں نے ان کا جملہ پورا نہ ہونے دیا اور ضدی بالک کی طرح اُڑ گیا۔ "میں آپ کے کسی عذر کے سننے کے لئے تیار نہیں ہوں، آپ کو چلنا پڑے گا اور اگر نہ چلیں گی تو میں یہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا مس درّدانہ چلئے" میں نے آخری جملہ کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ وہ ہنس پڑیں اور کہنے لگیں "آپ بن تو خوب سکتے ہیں۔ اگر آپ کی ضد ایسی ہے تو پھر کیا کرنا ہے، میں چلی چلوں گی۔

کفر خدا خدا کر کے ٹوٹا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، ان کی رحمدلی کی شان میں قصیدہ خوانیاں کیں۔ آسمان زمین کے قلابے ملا دیئے اور یہ کہہ کر ان کو ہنستا ہوا چھوڑ آیا۔ "کل ٹھیک دو بجے ہم آکر آپ کو لے جائیں گے"۔

دوسرے دن صبح ہی سے میں نے سکندرہ چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں شام کی چار کا سامان ٹھیک کرنے لگا، ملازم کو خواہ مخواہ کئی بار بازار دوڑایا کہ فلاں چیز لے آ اور فلاں چیز تو نے خراب لا دی ہے اسے بدل لا۔ مجھے یہ دکھانا منظور تھا کہ میں سکندرہ جانے کے لئے بے قرار ہو رہا ہوں اور میری یہ چال کارگر ہو گئی میں نے جس وقت ان سے کہا کہ میں نے درّدانہ بیگم کے ساتھ چلنے کا وعدہ لے لیا ہے میں نے دیکھا کہ مہدی صاحب کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے اور ان کا جی کچھ کچھ دھیما ہونے لگا۔ پہلے تو انہوں نے چلنے سے گویا انکار کر دیا کہ آج ایک بہت ضروری فورمولا کو لابورٹری جا کر ٹسٹ کرنا ہے اس لئے شاید وہ ساتھ نہ دے

جانے لگا۔ راستہ میں پرانے کھنڈرات ملے، ہرے بھرے باغ اور جتے ہوئے کھیت دکھائی دیئے۔ مناظر بدلتے گئے اور فضا شہر کے بوجھل اثرات سے خالی ہوتی گئی، دیہات کا سکون اور کھلی ہوا کی سادگی اعضاءِ مضمحل میں فرحت پیدا کرنے لگی تھی۔ جاڑے کی دھوپ ٹھٹھرے خواہشات میں گرمی پیدا کرنے لگی تھی۔ اور کم از کم مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ شکنتلا اپنے بھولے ہوئے سوامی کو ساتھ لئے برہما کے چرن چھونے کو ہوا کے رتھ میں سوار ہو کر جا رہی ہے اور میں ان کا ادنیٰ داس ہوں جو محض ہمدردی میں ان کے ساتھ چلا جا رہا ہوں۔ ہم یونہی اپنے خیالات میں مگن چلے جا رہے تھے کہ تانگے والے نے ایک کٹھرے کے اندر پتھر کا گھوڑا دکھاتے ہوئے کہا "یہ اکبر بادشاہ کا گھوڑا ہے۔" میں نے ہنس کر تانگے والے سے کہا "مگر چپ بیٹھا ہے چلتا نہیں!" دردانہ بیگم نے کہا "ہم اتر کر اسے دیکھیں گے۔" ہم اتر گئے اور بیچارے گھوڑے کے کان اور ناک ٹھیک کر دیکھنے لگے۔ مہدی صاحب اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے تھے بلکہ پاس کی لائن پر گذرنے والی ریل کے شاید ڈبے گن رہے تھے۔

جب اکبر بادشاہ کے گھوڑے کو اچھی طرح چمکار کر دیکھ چکے تو پھر ہمارا تانگہ آگے بڑھا مگر شکنتلا یا ان کے مہاراج نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ ہمارے تانگہ کا گھوڑا شاید جان گیا تھا کہ وہ ہوا کے رتھ میں جتا ہوا ہے اس لئے اس نے کول تار کی سڑک پر فراٹے بھرنا شروع کیا گویا وہ ہوا میں اڑنا چاہتا تھا۔ سبز رنگ کے خوبصورت جسم کا گھوڑا تھا اور جس وقت اس نے اپنی گردن کمان کی طرح خم کر لی اور اپنے دونوں کانوں کو سونت کر آگے کر دیا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا تو ایسا محسوس

ہوا کہ کوئی تیر ہے جو کمان سے نکل گیا ہے یا ہوائی ہے جس کو آگ دکھائی گئی ہے ۔ سڑک کے کنارے کے درخت بے تحاشا ہماری الٹی سمت بھاگنے لگے ۔ راہ پر چلتے ہوئے مسافروں نے پلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا اور فاختہ کا ایک جوڑا باوجود اپنی کوشش کے ہم سے آگے نہ بڑھ سکا ۔ سڑک کے کنارے چرتی ہوئی بکریاں اپنے کان کھڑے کرکے بھاگنے لگیں اور ان کو چرانے والا چھوکرا ایک ہاتھ سے اپنی لنگوٹی سنبھالے اور دوسرے سے اپنی لاٹھی پکڑے دوڑتا اور ہنستا ہوا ہمیں دیکھنے کے لیے سڑک کے کنارے آ گیا جیسے ہمارا تانگہ کوئی ریل کا ڈبہ تھا یا موٹر گاڑی ۔ چمکتی ہوئی سڑک پر گھوڑے کی پڑتی ہوئی ٹاپوں سے مسلسل مشین گن کے چلنے کی آواز آ رہی تھی اور اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مہابھارت کی لڑائی میں ارجن کا رتھ ہر طرف اپنے دشمنوں کی کھوپڑیاں پٹختا ہوا آگے بڑھ رہا ہے ۔

بجلی کی طرح دوڑتے ہوئے گھوڑے کو ٹھوکر لگی یا وہ پھسلا ؟ پتہ نہیں کیا ہوا ؟ ایک جھٹکا سا لگا اور میری آنکھ جب کھلی تو دیکھا فرش راہ پر بے تکلف اکڑوں بیٹھا ہوں ، گھوڑے کی پیٹھ پر تانگہ والا سوار ہے اور گھوڑا حملہ کرنے والے شیر کے انداز میں سڑک پر بیٹھا ہے ۔ نظر اور پیچھے گئی تو دیکھا دردانہ بیگم زمین پر ہیں ۔ اور پاس ہی مہدی صاحب تکلف سے لیٹے ہوئے ہیں ۔ حادثہ کے خیال سے گمان ہوا زخمی ہو گیا ہوں ، ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں اور مفلوج ہو کر زمین پر بیٹھ گیا ہوں ۔ فالج کے خوف سے اپنے ہاتھ پاؤں کو ہلا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ مگر آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں ، بازوؤں اور ٹانگوں پر گیا ہوا اعتماد پھر واپس آ گیا اور میں کھڑا ہو کر گرد جھاڑے بغیر ان کی طرف بھاگا ۔ کہنی اور گھٹنے

میں ہلکی خراش کے ماسوا مجھے کوئی دوسرا زخم نہیں تھا۔ میں جب تک پہنچا مہدی صاحب اٹھ بیٹھے تھے اور وہ بھی شاید تذبذب میں تھے کہ اپنی ٹانگوں پر وزن ڈالیں یا نہیں؛ مجھے آتے دیکھ کر ان کو بھی ہمت ہوئی اور وہ اٹھ بیٹھے۔ دروازہ اب تک خاموش پڑی تھیں اور ان کی پیشانی سے خون کا چھوٹا سا دھارا بہہ کر ان کے گلگوں رخسار پر آ رہا تھا۔ میری زبان سے گھبراہٹ میں "ارے یہ تو......" نکلا اور میں نے جھپٹ کر ان کی نبض دیکھی!!

مہدی صاحب کبھی حیرت سے میرا منہ دیکھ رہے تھے اور کبھی دروازہ کا ان کے چہرے پر میں نے کبھی اتنے شدید غم و افسوس کے آثار نہیں دیکھے تھے کہ آنکھیں میرے دل کے اندر گھس کر یہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ واقعہ کیا ہے اور میرے اس نا تمام جملہ کے معنی کیا ہیں؟ میں نے نبض دیکھ کر مہدی صاحب سے کہا "ان کے سر کو اپنی گود میں آہستہ سے اٹھا کر رکھو، میں ابھی آیا" میں نے کبھی اتنی شدت سے دوڑنے کی آزمائش نہیں کی تھی مگر اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ وقت پڑنے پر میں دوڑ بھی سکتا ہوں۔ جائے حادثہ سے قریب دو فرلانگ کے فاصلہ پر کنواں تھا، میں وہاں پہنچا اور دیکھا کہ ایک دہاتی الھڑ گھنگرے والی سانولی عورت اپنا پیتل کا گھڑا بھر کر کنوئیں سے اترنا چاہتی ہے مجھے دیکھ کر اس نے ایک لمبی سی گھونگٹ نکالی۔ میں ان دہاتیوں کی فطرت سے واقف تھا۔ جانتا تھا کہ اگر میں یہاں گر کر مر بھی جاؤں تب بھی یہ عورت خوشی سے مجھے پانی نہ دے گی۔ اس لئے خوشامد کرنے یا انسانی ہمدردی کا واسطہ دلانے میں قیمتی وقت کو ضائع کئے بغیر میں نے شریمتی جی کے سر سے گاگر اتار کر کرشن کنھائی

کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ وہ چیختی رہ گئیں، اور ان کی گالیاں دیر تک میرا تعقب کرتی رہیں مگر وہ پھر بھی تھک کر پیچھے رہ گئیں اور میں چھلکتی ہوئی گاگر لئے وہاں پہنچا جہاں مہدی صاحب سوگوارانہ انداز میں دردانہ بیگم کا زخمی سر اپنی گود میں لئے بیٹھے تھے۔

میں نے تانگہ کی سفید چادر جو نشست پر بچھی ہوئی تھی نوچ لی۔ اور اسے ٹھنڈے پانی میں بھگو کر دردانہ بیگم کے پورے سر کو اس سے لپیٹ دیا۔ اپنے اور مہدی صاحب کے رومال کو بھگو کر بہتے ہوئے خون کو پونچھا اور ایک بھیگے ہوئے رومال سے زخم کو خوب کس کر باندھ دیا۔ ٹھنڈا پانی مسلسل ڈالنے کے بعد دردانہ بیگم نے اپنی آنکھیں کھولیں، ہمیں دیکھا اور پھر غافل ہو گئیں۔ نبض کی حالت سدھر چکی تھی مگر ہوش نہیں آتا تھا۔ ان کے دماغ میں گرنے کی وجہ سے چوٹ کی دھمک آگئی تھی۔ مہدی صاحب چلّو بھر بھر ٹھنڈا پانی ڈال رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے آنسو مچل کر باہر آنا چاہتے تھے مگر وہ ضبط کئے ہوئے پی رہے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا مگر ہوش آنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایسے حادثوں کے موقع پر سڑک کے کنارے راہی تماشا دیکھنے چلے آتے ہیں اور دور سے کھڑے ہو کر صرف تماشا دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ مدد دیں اور اگر ان سے کہا جائے کہ بھیڑ کم کرو تو الٹا غصہ کرتے ہیں اور تیکھی نظروں سے مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی اس قسم کے نامعقول اور بے رحم لوگوں کا مجمع ہو گیا تھا اور میرے اور تانگے والے کی لاکھ کوشش کے بعد بھی یہ حضرات ٹلنے کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ فقرہ چست کر رہے تھے۔ ایک نیم شہری قسم کے لونڈے نے جو شاید کسی کارخانہ میں مزدور یا جمال تھا۔

بولا "گود میں لئے رہنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا ہے !" دوسرے نے جو شاید شہر کا رہنے والا کوئی سبزی فروش تھا کہا " اجی یہ سب ان صاحب لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں چوٹ ووٹ کچھ نہیں مکر کرکے بیٹھی ہے " اور ایک مولوی صاحب نے تو واللہ کمال کردیا۔ پہلے بھیڑ کے اندر گھس آئے اور ہمیں خوب اچھی طرح دیکھنے کے بعد اپنا منہ بسور لیا اور اپنی کچی پکی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر دفعتاً پلٹ گئے اور نفرت سے بولے " لاحول ولا قوۃ یہ بائسکوپ والے "

ان سنڈاس کے کیڑوں کو آپس میں ریل پیل اور گتھم گتھا کرتے چھوڑ کر میں ان سے الگ سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا کہ کوئی خدا کا نیک بندہ ملے جو ہماری مدد کرے۔ ابھی مجھے سڑک پر انتظار کرتے دیر نہ ہوئی تھی کہ دیکھا ایک انگریز اپنی نہایت کشادہ موٹر گاڑی میں دہلی کی طرف سے چلا آرہا ہے۔ اس نے سڑک کے کنارے بھیڑ دیکھ کر اپنی گاڑی روکی اور مجھ سے دریافت حال کیا۔ میں نے کہا " یہ بھیڑ ہم پر جو حادثہ ہوا ہے اس کا تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہوئی ہے، کیا آپ میری مدد کریں گے ؟" انگریز اپنے ڈرائیور کو ساتھ لئے فوراً اتر پڑا اور کہنے لگا " ضرور، مجھ سے کہئے میں کیا کروں ؟" میں نے کہا " مہربانی کرکے ہمارے زخمی ساتھی کو ہمارے بنگلہ تک پہنچا دیجئے " انگریز کی صورت دیکھ کر یہ غول بیابانی آہستہ آہستہ پسپا ہونے لگا تھا اور جب اس نے بڑھ کر ذرا غصہ میں کہا " یو بلڈی، ڈیم سوائن " تو پھر نہ پوچھو کہ یہ سوراج مانگنے والے کالے لوگ دم دبا کر ایسا غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ہم نے درد آنہ بیگم کو آہستہ سے اٹھا کر موٹر میں رکھا اور بنگلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انگریز جو فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہوا تھا پوچھنے لگا " کیا یہ بہتر

نہ ہوتا کہ ہم سیدھا ان کو ہسپتال لئے چلتے۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا" ابھی انہیں ہمارے بنگلہ پر پہنچا دیجئے اگر ضرورت ہوگی تو پھر ہسپتال لے جائیں گے۔" میڈیکل اسکول کے ایمرجنسی وارڈ میں جہاں علاج کم اور دیکھا زیادہ جاتا ہے۔ میں درِ دانہ بیگم کو بطور تختۂ مشق پیش کرنا نہیں چاہتا۔

بنگلہ پہنچ کر ہم نے درِ دانہ بیگم کو نہایت گرم اور آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ میں نے برف منگوائی اور اس کی تھیلی ان کے سر پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے از حد ملال ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا۔ اگر میں ضدی بن کر ان کو اپنے نشیمن سے نہ نکالتا تو یہ اس وقت آرام سے وہاں بیٹھی اپنا جلترنگ بجاتی ہوتیں اور ان کی دو چار سہیلیاں ان کے ساتھ بیٹھی اپنا الگ الگ طنبورہ بجاتی ہوتیں اور پھر سب مل کر چین کی بنسری بجاتیں۔ افسوس یہ مجھے کیا سوجھی تھی کہ ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر مفت میں ان کو مجروح کرا دیا۔ میرا ایک ہاتھ برف کی ٹوپی تھامے ہوا تھا اور دوسرا ان کی اس کلائی کی نبض پر تھا جس میں سیاہ ریشمی فیتے سے ایک چھوٹی سی دھڑکتی ہوئی سونے کی گھڑی بندھی تھی اور اس وقت پانچ بجا رہی تھی۔ درِ دانہ بیگم کا خوبصورت اور گداز بیضوی چہرہ میری آنکھوں تلے تھا۔ جو اس وقت مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح پھیکا اور بے رونق ہو رہا تھا۔ ان کی کشادہ اور روشن پیشانی پر اب صاف پٹی بندھی ہوئی تھی مگر زخم پر اس پٹی میں پھر خون کا دھبہ آ گیا تھا۔ سیاہ گھنگریالے بال، جو پیچھے کی جانب سمٹ کر مغربی وضع کا جوڑا بن گئے تھے کچھ خاک اور خون میں لتھڑ کر سخت ہو گئے تھے اور ان کے صاف اور اجلے کپڑے سلوٹوں سے چور چور ہو کر بے ترتیب ہو رہے تھے۔ ہر شے

سانس اور دل کی آواز ہماری امیدوں کو ڈھارس بندھا رہی تھی ورنہ دردانہ بیگم کی کمھلائی ہوئی صورت کو دیکھ کر بے اختیار رونے کو جی چاہتا تھا اور مہدی صاحب پاس ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے شاید رو رہے تھے۔

ڈاکٹر ہو کر میرے اوسان اور بھی خطا ہوئے جا رہے تھے، یہاں میں صرف علاج نہیں کر رہا تھا بلکہ میرا دل ایک عزیز کی تکلیف کو دیکھ کر غم بھی کرنا چاہتا تھا اور یہ دہرے فرائض میرے لئے کس قدر مشکل ہو گئے تھے وہ میں جانتا تھا۔ ایک طرف دردانہ کی یہ حالت جس کے ہونے والے تمام مہلک اثرات میری نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے اور دوسری طرف تمہارے بھائی، غمگین اور سوگوار رہ کر تشویش سے میری صورت دیکھتے تھے اور اپنے دل میں نہ جانے میرے متعلق کیا رائے قائم کر رہے تھے۔ میں گھبرا کر دردانہ بیگم کی لمبی پلکوں سے ڈھنکی ہوئی آنکھوں کو کھول کر دیکھتا تھا کہ اب پتلیوں کی کیا حالت ہے اور ان میں احساسات پلٹ کر آرہے ہیں یا نہیں مگر ہر بار میں دل شکستہ ہو کر حسرت سے ان کی صورت کو دیکھنے لگتا تھا جس پر جوانی پھٹی پڑتی تھی مگر افسوس اس وقت اس پر ایک جہان ماتم چھایا ہوا تھا۔ میں نے کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں اور ان پر پڑے ہوئے پردوں کو تان کر کمرہ کو نیم تاریک کر لیا تھا۔ خود اپنے جوتے اتار لئے تھے اور ملازموں کو ننگے پاؤں آتے جانے کی تاکید کر دی تھی پاس کی میز پر سوئی سے داخل کرنے والی تمام ضروری دوائیں اور پچکاری رکھ لی تھی کہ خدانخواستہ اگر دل نے چلنا بند کرنا چاہا یا سانس نے اکھڑنا شروع کیا تو ان دواؤں سے حتی الوسع کوشش کروں گا کہ جسم و جان کا تعلق نہ ٹوٹنے دوں۔ یہ

سب کچھ احتیاطی تدبیریں کر رہا تھا مگر دل جانتا تھا کہ انسانی ہاتھوں کی پہنچ بہت محدود ہے اور وہی ہو کر رہتا ہے جو کچھ ہونا چاہتا ہے۔

خط اتنا لمبا ہو گیا کہ اب خط نہ رہا بلکہ افسانہ بن گیا۔ اگر اسے یہاں ختم کر کے "باقی کل رات" کہوں تو تم یقینی چیں بجبیں ہو کر کہو گی "آپ کو میری قسم پورا کر لیجئے تب جائیے گا" اور اگر تمہاری اس قسم کی تھوڑی دیر پروا نہ کروں اور ٹال جاؤں تو تم غصہ ہو کر کہو گی "نہیں کہتے تو جائیے، میں بھی نہیں سنتی" اور یہ غصہ میری تمام محنتوں پر پانی پھیر دے گا اور یہ تمام رات کی محنت شاقہ رائگاں جائے گی۔ اس لئے آؤ صاحب، اب جیسے بنے قصہ شروع کرتا ہوں۔ آنکھوں دیکھی کہتا ہوں، کانوں سنی نہیں۔ تم اب صبح کرنے کے تیار ہو جاؤ اور ارادہ کر لو کہ سوؤ گی نہیں بلکہ جونہی کہانی ختم ہو گی وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑی ہو جاؤ گی۔ جی بہت چاہتا ہے کہ تم کو نماز پڑھتے دیکھوں اور یہ دیکھوں کہ سورج نکلتے آفتاب کے سامنے کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے، خدا کرے وہ دن جلد آئیں جب میں بھی تمہارے ساتھ مل کر اس گھر کے آگے سجدہ کروں جس میں سرِ شام آفتاب چراغ جلانے کے لئے جاتا ہے۔

شام ہو گئی، سات بج گئے، آٹھ بج گئے، رات ہو گئی، مگر ہم اپنی جگہ پر بت بنے بیٹھے رہے اور روزوانہ بیگم کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگتے رہے۔ جب آٹھ بج گئے تو میں نے ناامید ہو کر مہدی صاحب سے کہا "وہ ہوش اب تک نہیں آیا اور نہ اس کے آنے کے کوئی آثار ہیں۔ آپ مہربانی کر کے شہر کے کسی اور ڈاکٹر کو بلا لائیے۔ اور اگر اس کی بھی رائے ہوئی تو ہم روزوانہ بیگم کو ہسپتال لے چلیں گے۔ آپ جب شہر جائیں تو ان کے ہوسٹل میں بھی اطلاع دے دینا" مہدی صاحب کے صبر

استقلال کو دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا کہ شاباش یہ ایک بہادر انسان ہے اور زندگی کی ہر افتاد کا سورما کی طرح مقابلہ کرتا ہے۔ میرے اس خیال سے ان کو جو صدمہ پہنچا ہو وہ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ میں نے صرف یہی دیکھا کہ جب میں نے ان کو ڈاکٹر بلانے کو کہا تو وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ جیسے کچھ بھی نہ تھا مگر جب آگے بڑھے تو ان کے قدم لڑکھڑائے اور وہ سر پکڑ کر دردانہ بیگم کی پائنتی تلے بیٹھ گئے۔ میں نے افسوس اور تشویش سے گھبرا کر کہا "مہدی صاحب، یہ کیا ہوش میں آیئے۔" میری فہمائش سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور دبے پاؤں باہر جانا چاہا۔ مگر دروازہ تک پہنچ کر پھر لوٹے اور بے تابی سے دردانہ بیگم کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے اور ایسے غمناک لہجہ میں کہا کہ میرا کلیجہ کٹ گیا "مائی ڈارلنگ میری خطا کو معاف کر دو۔"

اُس شام کے بعد میں نے پہلی مرتبہ مہدی صاحب کی زبان سے ڈارلنگ کا لفظ سنا اور آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ دردانہ بیگم سے کتنی گہری اور اٹوٹ محبت کرتے ہیں۔ ان کے معافی مانگنے کی تمنا میں ایک عالم آرزو تھا جو جھوم رہا تھا، اف میں نے بہت کم دل سے نکلی ہوئی ایسی صدا سنی ہے جو دل میں چھید کر دیتی ہے۔ دردانہ بیگم کی حالت چونکہ از حد تشویشناک تھی اور ان کی جانبری صرف جاں بخش کے ہاتھوں میں تھی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ان دو محبت کرنے والوں کو تھوڑی دیر تنہا چھوڑ دوں۔ میری یہ حرکت اپنے پیشہ کے نقطۂ خیال سے ناقابل معافی جرم تھا مگر میں کہہ چکا ہوں یہاں مجھے دہرے فرائض انجام دینا تھے اور مجھے مہدی صاحب کے جذبات کا بھی پاس تھا۔ میں نے کہا۔

"مہدی صاحب آپ جانے سے پہلے تھوڑی دیر میرا ہاتھ بٹا دیں، میرے اس بازو میں برف کی ٹوپی پکڑے رہنے سے درد ہونے لگا ہے آپ ذرا تھوڑی دیر انکے سر پر برف رکھئے، میں اپنے کمرے سے گرم کوٹ پہن آتا ہوں"

مہدی صاحب میری کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور برف کی ٹوپی سنبھال لی میں نے چلتے وقت احتیاطاً ایک بار اور روانہ بیگم کی نبض دیکھ لی۔ ان کا دل بدستور جیسے کسی دلچسپ لذت کے احساس سے ... دھڑک رہا تھا، مہدی صاحب کے چہرہ پر غم، پشیمانی، حسرت، افسوس، الغرض سیکڑوں ملے جلے جذبات نمایاں تھے اور جس وقت ان کا چھریرا اور مناسب قد کرسی پر جھک کر بیٹھ گیا اور ان کے الجھے ہوئے سیاہ بالوں کے چھلّے ڈھلک کر ان کی کشادہ پیشانی پر آگئیں تو مجھے ایک بار پھر یونانی سنگ تراش یاد آگئے جن کا مجسمۂ سوگوار مہدی صاحب کے اس انداز نشست کی یاد دلاتا تھا۔ اب یہ میری بدتمیزی سمجھو یا گنوارپن کچھ بھی خیال کرو مگر جو بات سچی ہے وہ کہوں گا۔ میں مہدی صاحب کو تنہا مریض کے کمرے میں چھوڑ کر چلا ضرور آیا تھا مگر مجھے اطمینان نہ تھا اور ہر وقت یہ دھڑکا لگا تھا کہ کہیں وہ ایسی کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں یا چیخ نہ اٹھیں جس سے سارا کیا دھرا گڑبڑ کر رہ جائے۔ اس لئے فیلو معاف کرنا، میں دوسرے کمرے میں جاکر دروازہ کے دراز سے جھانکتا رہا۔ اور اپنے کان انہیں کی طرف مخاطب رکھے۔

مہدی صاحب یونانی مجسمہ کی طرح پہلے روانہ کو غور سے دیکھتے رہے۔ اور پھر ان کے چلتے ہوئے سانس کو دیکھتے رہے۔ میں نے دل میں کہا "بڑے اچھے ہیں"! ابھی میرا یہ خیال مکمل طرح سے میرے دماغ میں تشکیل نہ پا سکا تھا کہ کیا دیکھتا

ہوں مہدی صاحب کا سینہ زور زور سے پھولنے اور پچکنے لگا۔ میں نے کہا "یہ کیا ہوا؟"
صورت دیکھی تو لال ہو رہی تھی اور ان کے لب ایک دوسرے سے پیوست ہو رہے تھے۔ میں نے کہا "ارے یہ تو رونا چاہتے ہیں اور شاید اپنی چیخ کو گھونٹ رہے ہیں یہ بڑا غضب ہو جائے گا۔ اور میں نے چاہا، آہستہ سے ان کو ہوشیار کروں کہ ذرا رکے ہوئے"۔ مگر میری تنبیہہ سے پہلے ہی انہوں نے اپنا منھ اونچا کیا اور ایک لمبی سی آہ باہر پھینک کر کچھ سکون پذیر ہو گئے۔ گویا دل کی بھڑاس نکل گئی اور اڈا ہوا مہاساگر شانت ہو کر دھیرج ہو گیا۔ اب اس مہا ساگر میں چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ان لہروں کے حسب منشاء ان کا ہاتھ اٹھ کر دردانہ بیگم کی پٹی بندھی ہوئی پیشانی پر پیار سے لوٹنے لگا۔ یہ ہاتھ نسیم سحری کی طرح کبھی ان کی پیشانی کو چھو کر ان کی غلافی آنکھوں کے بند پپوٹوں پر سے گذرتا ہوا شاداب رخسار پر چلا جاتا جہاں بہے ہوئے خون کی موٹی پپڑیوں کو جھاڑ کر نیچے گراتا اور کبھی پیشانی کو مس کرتا ہوا ان گھنگھریالے بالوں سے الجھ جاتا جو اس وقت خاک اور خون میں لتھڑ کر سخت ہو گئے تھے۔ جذبات برافروختہ کی شدت ان کے سینہ میں طوفان اٹھائے ہوئے تھی۔ اور یہ اپنے پھسلتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ساتھ "ڈارلنگ، اوہ مائی ڈارلنگ" کہتے جاتے تھے۔ ان کی آواز محبت سے بھری ہوئی ان کے دل کی گہرائی سے آ رہی تھی۔ اور ان کے خشک لب تک آتے آتے ہلکی اور نہایت مدھم سرگوشی میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

محبت کی یہ آواز اور محبت کا یہ برق بردوش لمس، دل کی گہرائی سے نکل رہا تھا اور دل کی گہرائیوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس آواز کی تاثیر نے دردانہ بیگم کی تاریک دنیا میں جا کر دردانہ بیگم کو پکارا۔ دردانہ نے اس آواز کو سن لیا۔ ان کی غلافی آنکھیں

کھل کر شمع کی طرح جھلملانے لگیں، لب پر ارتعاشی کیفیت طاری ہوئی، کملائے ہوئے رخسار کے پھول نسیم سحری کے لمس سے پھر شاداب ہو گئے اور آواز آئی "ڈارلنگ، میں کہاں ہوں؟" مہدی صاحب نے بے قرار ہو کر دردانہ بیگم کی پٹی بندھی ہوئی پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے اور کہا "ڈارلنگ، تم میرے پاس ہو"

میں نے کمرے سے باہر نکل کر نہایت آہستگی سے مہدی صاحب کو دردانہ بیگم کے سرہانے سے ہٹا دیا اور کہا "مہدی صاحب، خطا معاف، آپ جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر چکے، یہاں سے اب میری خدمت کی ضرورت ہے"

ڈارلنگ، لو صبح ہو گئی، خط ختم کرتا ہوں، جواب جلد دو کہ تم یہاں کب پہنچ رہی ہو؟۔ (تمہارا منتظر)

---

(۴۳)

مغل سرائے

۲۵ فروری ۳۷ء

میری آرام جاں!

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، یعنی تمام دن کی بے چینی اور تمام رات کی اختر شماری جو قسمت میں لکھی تھی وہ رہی۔ آگرہ میں آخری دس دن جس بے چینی سے گذارے اور تم کو دیکھنے کی امید کو جس طرح کلیجہ سے لگائے رکھا ہے وہ اس کے دل سے پوچھو جس نے مہینوں سے یہ نہیں جانا ہے کہ لطف حیات اور امید زیست کیا ہے۔ تم نے اپنے آنے کی خبر سنا کر ایسی خاموشی اختیار کر لی کہ نہ خود آئیں اور نہ میرے خط کا جواب دیا۔

مہدی صاحب سے میں نے تمہارے آنے اور خط کے متعلق اتنی بار پوچھا کہ اب اس کے خیال سے مجھے خود شرم آتی ہے۔ اگر اس سلسلۂ خط وکتابت کو بند کرنا چاہتی ہو تو وہ لکھ بھیجو، میں انشااللہ کوشش کروں گا کہ پھر تم کو ایسی زحمت نہ دوں یا اگر دل میں اس کے ماسوا کچھ اور ہے تو وہ کہہ دو۔ میں تمہاری ہر مرضی پر چلنا اپنی عین خوش نصیبی سمجھتا ہوں جہاں تمہارے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں وہاں اللہ واسطے ایک اور کردو کہ مجھے اپنے دل کا حال ٹھیک ٹھیک لکھ بھیجو۔ آخر میں اس حالت تذبذب میں کب تک پڑا رہوں اور تابکے اپنے ہم چشموں میں قابل رحم بنا رہوں، تم جانتی ہو کہ میں کتنا حساس اور زود رنج ہوں۔ اگر کوئی مجھے میرے خلاف مزاج کچھ کہہ دے تو پھر میں مرتے دم اس کی دہلیز پر قدم نہیں رکھتا۔ چاہے ایسا کرنے میں مجھے کتنی ہی تکلیف نہ ہو۔

خدا کے لئے مجھے اور زیادہ پریشان نہ کرو اور صاف کہہ دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ دنیا کچھ کہے میں اس کا اعتبار نہیں کرتا، مجھے تو تم جو کچھ اپنی زبان سے کہہ دوگی اسے پتھر کی لکیر سمجھوں گا۔ اگر صورت حال نے میرے خلاف شکل اختیار کرلی ہے تو میری کچھ پرواہ نہ کرو اور وہی کرو جو تمہارے بزرگ یا رشتہ دار کہتے ہیں۔ میری وجہ سے (ایسے نصیب کہاں) تم کسی کی خفگی یا ناراضگی کا باعث نہ بنو۔ تم اگر ایسا کردوگی تو مجھے تکلیف ہوگی اور میں خود اپنی نظر میں گرجاؤں گا۔ مصائب روزگار اور مرور ایام کسی کو چین نہیں لینے دیتے اور ان کی یہ نوازش جو میرے حال پر ہے وہ کچھ میرے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کے چکر میں جو پڑ گیا وہ اچھی طرح جھنجوڑا جاتا ہے اس لئے اپنی اس قسمت پر جو مجھے ایک گڑھے سے نکال کر دوسرے میں گرادیتی ہے۔

کیوں شکایت کروں اور جو دنیا پر گذر رہی ہے اسے دیکھ کر اپنے دل کو ڈھارس کیوں نہ دوں۔ اب میں تھک گیا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی تھوڑی سی جگہ کسی ویرانے میں مل جائے تو ابدی خواب کے مزے لینے لگوں۔

یہ خط تم کو بمبئی میل کے ڈبہ میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں۔ اس وقت رات کے کوئی ۲ بجے ہیں اور گاڑی مغل سرائے کے اسٹیشن میں کھڑی ہے۔ نیند نہیں آ رہی ہے اور یہ غم مارے ڈالتا ہے کہ آگرہ سے تم کو دیکھے بغیر رانچی جا رہا ہوں۔ ایسی غمگین و بے سدھ حالت میں مَیں تم کو ہمیشہ لمبے خط لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اور خط لکھتے وقت جو تم سے خیالی باتیں کرنے کا لطف آتا ہے اس میں اپنے غم کو بھول جاتا ہوں۔ میرے خیالات پریشان، جو پریشان ہونے کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں تم کو مرکز غور و فکر بنائے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے جمع ہو کر ایک نقطہ پر آ جاتے ہیں اور یہ تبدیلی میرے دل و دماغ کے لئے سبب سکون بن جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک کشتی بے بادباں بپھرے ہوئے سمندر سے نکل کر استھر دریا میں آ جائے۔ خیالات کی پریشانی ہر گھڑی میرے وجود میں ایک ہل چل مچائے رہتی ہے۔ صبر و قرار میرے لئے خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی مسئلہ پر تھوڑی دیر کے لئے بھی غور نہیں کر سکتا۔ کتاب کے ایک صفحہ کو سینکڑوں بار پڑھتا ہوں مگر مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگوں کو بات کرتے سنتا ہوں اور ان کے لبوں کو ہلتے دیکھتا ہوں مگر مقصد یا موضوع گفتگو سمجھ میں نہیں آتا۔ بہر حال قصہ مختصر، یہ بگولے جیسی حالت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ میری موجودہ زندگی کی ہلتی ہوئی بنیاد کو کوئی تھام نہ لے۔

عرصہ ہوا کہ تم کو دیکھا تھا مگر وہ تمہاری پیاری صورت کی یاد اب تک تازہ

ہے اور یہی یاد میری غمگین زندگی کی تنہا متاعِ مسرت ہے۔ کبھی تمہاری غمگین صورت اور اداس چہرہ کی یاد آتی ہے تو طبیعت مرجھا کر سرنگوں ہو جاتی ہے اور دل امنڈ کر آنکھوں کو پُرنم کر دیتا ہے۔ تمہاری گاڑی جب چلنے لگی تو نہ جانے تم مجھے اس قدر مضمحل کیوں نظر آنے لگی تھیں کہ تمہارے اس اضمحلال کو سوچ کر اب بھی میرا دل نڈھال ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے میرا یہ خیال صرف اپنا حُسنِ ظن ہو اور تمہاری وہ نقاہت اور اداسی روزہ رکھنے کے سبب سے ہو۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو، اثر موجود تھا۔ اور اسی اثر کو یاد کر کے اپنا جی اور نڈھال کر لیتا ہوں۔

تمہاری اس اداسی کو یاد کر کے خود بخود یونہی کبھی جی چاہتا ہے کہ کوئی ایسی تدبیر ہاتھ آتی کہ تمہاری زندگی سے ان اداس لمحوں کو ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیتا اور تم بلبلِ ہزار داستاں کی طرح ہمیشہ محوِ گلگشت اور مصروفِ نغمہ رہتیں اور خوشی سے بے خود ہو کر اس طرح بھاگتی پھرتیں کہ تمہارا زرکار دوپٹہ ہوا میں لہرا کر تارے بکھرے آسمان کی طرح ہو جاتا اور اس آسمان سے پرے تمہارے سنہرے قہقہے فضا کو مخمور کر دیتے۔ کیا ہمارے وہ دن پھر نہ آئیں گے جب ہم گھنٹوں بیٹھے ہنستے تھے اور آئیس کریم کی پلیٹ پر پلیٹ چڑھاتے جاتے تھے؟

تم جس دن مرشد آباد جا رہی تھیں اس دن مجھ پر جو حالت گذری تھی وہ اکثر یاد آتی ہے اور آج اسے دہرا رہا ہوں۔ کس لئے؟ پتہ نہیں! جوں جوں تمہارے جانے کے دن قریب ہوتے جاتے تھے میرا دل بیٹھا جاتا تھا اور کچھ عجیب قسم کی یاس گلا دبانے لگتی تھی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑی لگانا چاہتی تھیں۔ اور رہ رہ کر جی چاہتا تھا کہ انسان، بے رحم انسان کی آبادی سے نکل کر جنگلوں میں چلا جاؤں۔ اور نیلو نیلو پکارتا پھروں۔

تمہارے عزیز تم کو چھوڑ نہیں سکتے تھے، تمہارا جانا ضرور تھا۔ ایسی حالت میں میرے لئے تنہا رہ کر تمہارا نام پکارنے کے سوا اور کیا شغل ہو سکتا تھا۔ کبھی یہ جی چاہتا تھا کہ تم کو مرشدآباد نہ جانے دوں بلکہ تم کو اپنے ساتھ لے کر اس ناپاک بے رحم کرۂ ارض کو چھوڑ کر چلا جاؤں اور زہرہ کی لطیف اور روحانی دنیا میں چل کر آباد ہو جاؤں جہاں کچھ نہ ہو، خود ہم بھی نہ ہوں۔ اور ہماری تمنائیں اور حسرتیں ایک دوسرے سے مل کر کرۂ زہرہ کے حسین آسمان کے لئے ایک مکمل اور نیا چاند بنائیں۔ جس کی روشنی میں حسن اور بھی حسین ہو جائے اور عشق اور بھی شعلہ ساماں بن جائے۔

تم نے مرشدآباد پہنچکر گہرے نیلے رنگ کے آسمان کو دیکھا ہوگا اور آفتاب کی چمکدار کرنوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ کیا تم نے محسوس کیا کہ میں ان کے اندر سمایا ہوا ہوں پھر راتوں کو تم نے اس آسمان میں تاروں کو ٹمٹماتے دیکھا ہوگا اور ایک منور چاند کو بھی روشن پایا ہوگا۔ کیا کبھی تم نے مجھے ان کی روشنی کے پردوں سے اپنی طرف جھانکتے ہوئے پایا اور کیا تم سوتے جاگتے اور چلتے پھرتے اپنے دل کو دھڑکتے محسوس نہیں کرتیں؟ میں ان دھڑکنوں میں رہتا ہوں الغرض میری جان حیات، کیا بتاؤں کہ تم کو دیکھنے کی غرض سے میں ارض و سما کے کس جز میں پیوست نہیں ہوں؟

اب اس قسم کا یہ آخری خط ہے جو میں تم کو لکھ رہا ہوں اور تمہارا جواب اگر رانچی جلد نہ آیا تو سمجھوں گا میرا قصہ تمام ہوا اور پھر اس کے بعد تم سن لو گی کہ میں نے جو کچھ ٹھانی تھی وہ کر بیٹھا۔ فقط۔ خدا حافظ و ناصر۔ تمہارا

(ازل سے لے کر ابد تک)

---

(۴۴)

رانچی
۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء

میری باعث حیات!

تم نہیں چاہتیں کہ میں مرجاؤں اور اس کے لئے اپنی جان کی قسمیں دیتی ہو اور تم یہ بھی نہیں چاہتیں کہ میں زندہ رہوں جس کے لئے تم قسمیں دیتی ہو کہ میں جلدی نہ کروں۔ یہ تم نے مجھے ایک پہاڑی پگڈنڈی پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جس کے دونوں طرف کھڈ ہیں۔ خدا کے لئے مرنے سے پہلے میری آزمائش کے لئے پل صراط نہ کھڑا کرلو۔ تم جانتی ہو انسان ہوں۔ بھول چوک سبھوں سے ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ بال جیسی باریک راہ پر قدم ڈگمگا جائیں اور میں ایسا گروں کہ تحت الثریٰ سے ادھر کی خبر نہ ہو۔ کیا تم کو یہ منظور ہے کہ میری زندگی تباہ و برباد ہو جائے! اور میں یونہی غبارہ کی طرح ہر جگہ کی خاک چھانتا پھروں؟ تم نے کبھی صاف صاف مجھے کچھ نہ بتایا۔ ہمیشہ پہیلیوں میں باتیں کرتی ہو۔ آگرہ پہنچکر کیا بات ہوئی اور آگرہ آنے سے پہلے بردوان کے لڈو رکھ لئے گئے یا واپس کر دیئے گئے؟ یہ تم نے کچھ بھی نہیں لکھا اور جہاں تم کو ان باتوں کی تفصیل لکھنا تھی وہاں بس یہ ایک جملہ لکھ کر آگے بڑھ گئیں "آپ کو اکثر لوگوں کے متعلق غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔ نہ بھائی جان اور نہ دردانہ بہن نے آپ کے خلاف کچھ کہا بلکہ وہ تو آپ سے بہت خوش ہیں اور کہتے ہیں ہم ان سے جلد رانچی میں ملینگے"

تم نے شاید مجھے کسی اخبار کا نامہ نویس سمجھ لیا ہے جب ہی محمود صاحب کے مقدمہ کا حال لکھنے کی فرمائش کرتی ہو۔ اب مجھ سے اس فرضِ کا بار اٹھایا نہیں جاتا

اور تم ہی کہو میں کیا بار برداری کا کوئی جانور ہوں کہ بوجھ بھی اٹھاؤں اور اوپر سے ڈنڈے بھی کھاؤں؛ صاحب، جب تک میری دل جوئی نہیں کی جائے گی اور مجھے امید نہیں دلائی جائے گی میں لمبا خط لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر اف کیا کروں، دل نہیں مانتا کہ تم کو میری نافرمانی کی وجہ سے سرگرانی ہو اس لئے رانچی کے ہندی اخبار "چھوٹا ناگ پور پتر" کے ایک صفحہ کا ترجمہ بھیجتا ہوں۔ اس اخبار میں محمود صاحب کے مقدمہ کی ہر پیشی کا حال بڑے آب وتاب سے چھپتا ہے اور اخبار بیچنے والے لڑکے "زرینہ بیگم کی نالش، زرینہ کے مقدمہ کے انوکھے گواہ" وغیرہ کا نعرہ بلند کر کے اخبار خوب بیچتے ہیں اور لوگ شوق سے اسے خرید کر ہوٹلوں اور چار خانوں میں پڑھتے ہیں اور ان پر رائے زنی کرتے ہیں۔

زرینہ بیگم اور محمود الحسن، وکیل کا مقدمہ
انوکھے اور نادر گواہوں کا بیان!
فریقین کے وکلاء آپس میں جھگڑ گئے!
اجلاس میں سنسنی، مجسٹریٹ نے تماشائیوں کو خاموش
رہنے کا حکم دیا!

رانچی

۸ مارچ ۱۹۳۸ء، آج متذکرہ بالا مقدمہ کی پیشی صاحب ایس، ڈی، او بہادر کے اجلاس میں ہوئی۔ یہ اس مقدمہ کی آخری پیشی تھی جس کے بعد فیصلہ جلد سنایا جائیگا حسب معمول آج پھر اجلاس تماشائیوں کے ہجوم سے بھر گیا تھا اور حاکم اجلاس نے اژدھام دیکھ کر لوگوں کو باہر جانے کے لئے کہا مگر کوئی باہر نہ گیا۔ شہر میں مقدمہ کی

گوناگوں دلچسپیوں کے باعث خاص ہنسی پھیلی ہوئی ہے اور لوگ مقدمہ کی پیشی کے دن کچہری میں جوق در جوق آتے ہیں کہ چل کر اپنی آنکھوں سے مدعیہ کو دیکھیں اور مقدمہ کے پر لطف بیانات کو سنیں۔ آج مدعیہ کی طرف سے ان کے تین گواہ پیش کیے گئے۔ ان کے بیانات اور ان بیانات پر کیے ہوئے جرح حسب ذیل ہیں۔

مدعا علیہ کے وکیل نے چمیلی نام کی ملازمہ پر یوں جرح کی۔

وکیل :۔ تمہارا نام؟

چمیلی :۔ چمیلی خاتون

وکیل :۔ تم نے اپنا نام پہلے چمیلی بتایا اب چمیلی خاتون کہتی ہو۔ یہ کیا؟

چمیلی :۔ اب جو سمجھو، چاہے چمیلی کہو، چاہے چمیلی خاتون۔ میری مرنے والی ماں بیچاری مجھے چمیلی خاتون کہتی تھی مگر اب ہر کوئی چمیلی کہتا ہے اور نگوڑا نانبائی کا خنگا، موا عبدل تو مجھے چمیلیا کہتا ہے۔ میں نے بیگم صاحب سے کہہ دیا ہے موئے کی زبان کھینچ لوں گی اگر اس نے پھر......

وکیل :۔ فضول باتیں نہ کرو، جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ۔

چمیلی :۔ اے ہے، کہہ تو چکی۔ اب کتنا پوچھو گے؟ سمجھتے نہیں تو یہ کالا چغہ پہنے لاٹ کیوں بنے پھرتے ہو؟

وکیل :۔ (حاکم کی طرف اداۓ احتجاج سے دیکھ کر) یور آنر، گواہ بدتمیزی کرتی ہے!

مجسٹریٹ نے اس نوک جھونک کو دیکھ کر ہنس دیا اور وکیل صاحب نے اپنی عینک کے اوپر سے دیکھ کر مجمع کی طرف دیکھا اور اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر

غصہ سے بے قرار ہو گئے۔ مگر وکیل صاحب کی اس خفگی کا رعب مجمع پر نہ پڑا۔ مجمع کو ہنستے دیکھ کر مدعیہ نے بھی وکیل صاحب کی بگڑتی صورت دیکھ کر رومال سے اپنا منھ چھپا لیا۔ چمیلی گواہ کوئی تیس ۳۰ سال سانولی رنگ کی نوکرانی ہے، اس وقت گواہ کے کٹھرے میں کھڑی پان چبا رہی تھی اور اپنی دھانی ساری کے آنچل سے رہ رہ کر اپنے لب اور باچھوں کو پونچھ رہی تھی جہاں پان کا رنگ پھیل کر دھبہ کی طرح ہو گیا تھا۔ اجلاس سے متانت اور اہمیت کو غائب ہوتے دیکھ کر بوڑھے اور سفید بالوں والے مجسٹریٹ نے جن کے منھ میں ہر وقت موٹی سی چرٹ سلگتی رہتی ہے کچھ ٹھنسی آواز میں بولے۔ آنڈر: آنڈر: مجسٹریٹ کی بھنبھنائی ہوئی آواز سے نہیں بلکہ مجمع ہنس کر خود ہی چپ ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کوئی اور ہی مزیدار بحث چھڑے۔

وکیل:- ہاں چمیلی یہ بتاؤ کہ ......

چمیلی:- دیکھو جی وکیل صاحب پھر چمیلی کہا تو اچھی بات نہ ہوگی، یہ کیا کہ تم بھی مجھے چمیلی کہہ کر پکارنے لگے۔ (زرینہ بیگم کی طرف مخاطب ہو کر) بی بی سنتی ہو یہ تیل کا بیٹہ مجھے ......

وکیل صاحب نے اپنے متعلق گواہ کی یہ پھبتی اچھی طرح سنی بھی نہیں اور گھبرا کر صاحب مجسٹریٹ کی طرف فریادی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ مجمع کی بیساختہ ہنسی میں حاکم کی کوئی بات سنائی نہ دی، صرف ان کی چرٹ ہلتی ہوئی دیکھی گئی۔ جب کمرہ میں شانتی ہوئی تو وکیل صاحب نے اپنے چغہ کو پھر کاندھے پر کھینچ لیا جو وہاں سے سرک گیا تھا۔ اپنی عینک کو ناک کی نوک پر سے سرکا کر پھر ناک کی جڑ پر رکھا اور غصہ کھا کر ذرا اپنے کو بچائے ہوئے بولے۔

وکیل :۔ تم مدعیہ کی نوکرانی ہو؟

چمیلی :۔ اے ہے موئے تیرے منھ میں خاک، نگوڑی مُدیا کی کیوں نوکرانی بنوں، وہ خود جوتیاں گھسیٹتی پھرتی ہے، خود نوکری کرے گی کہ دوسروں کو نوکر رکھے گی؟

وکیل :۔ (گھبراکر اور بغلیں جھانکتے ہوئے کہ مجمع پھر کہیں نہ ہنس پڑے) میرا یہ مطلب نہ تھا، کیا تم (زرینہ بیگم کی طرف اشارہ کرکے) ان کی نوکرانی نہیں ہو؟

چمیلی :۔ (پان کی پیک اجلاس کی دیوار پر پھینکتے ہوئے) خدا ان کو سلامت رکھے، میں ان پر پرواری، میں ان کی بھی غلام ہوں اور اللہ رکھے بڑی بیگم کی بھی اور میاں کی بھی اور ان کے سارے ملنے جلنے والوں کی بھی۔

وکیل :۔ (غصہ سے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے) یور آنر گواہ سیدھی طرح بات نہیں کرتی۔

صاحب مجسٹریٹ نے جیرٹ اپنے منھ میں ادھر اُدھر پھرایا اور قلم کو ہاتھ میں لیکر بولے "چمیلیں، تم وکیل صاحب کی بات کا سیدھا جواب دو۔ فضول باتیں نہ کرو اور دیکھو دیوار پر پان کھاکر مت تھونکو"

چمیلی :۔ دے تو رہی ہوں اور کس طرح دوں، جو وہ پوچھ رہے ہیں وہ بتا رہی ہوں اور میاں پان کی پیک کہاں پھینکوں؛ مجھے ان سے (پولیس کے سپاہی کی طرف اشارہ کرکے) ڈر لگتا ہے

وکیل :۔ کیا تم مدعا علیہ کو پہچان سکتی ہو؟

چمیلی :۔ آپ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو، کہاں مُنڈو گوالا اور کہاں میں۔ ارے میں تو بہت چھوٹی تھی جب وہ مر گیا۔ اب تو میاں کے ہاں اس کی بہو سندری

دودھ دینے آتی ہے۔ یہ تم کو اس بیچارہ کی کیا پڑی ہے؟ سنتی ہوں مرنے والا نیک تھا۔ مگر دودھ میں پانی بہت ملاتا تھا۔

مجمع نے پھر ہنسنا چاہا مگر مجسٹریٹ صاحب نے اپنے "آنڈر، آنڈر" سے بڑھتے ہوئے سیلاب کو وقتی طور پر روک لیا۔ مجسٹریٹ صاحب نے وکیل مدعا علیہ کو جلدی کرنے کے لئے کہا اور اپنی جیب گھڑی نکال کر دیکھنے لگے۔

وکیل :۔ (محمود الحسن کو دکھا کر) ان کو پہچانتی ہو یہ کون ہیں؟

چمیلی :۔ اجی یہ تو وہی وکیل صاحب ہیں، بھلا سا نام ہے ان کا، ارے میری یاد پر پتھر پڑے! کیا ہاں ممّو صاحب، ان کو بھلا کیسے نہ پہچانوں؟ انہیں نے تو چھوٹی بیگم صاحب کو بہکا کر دھوکا دیا ہے اور سبز باغ دکھا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا ہے، میں نے بی بی کو سمجھایا کہ دیکھو بی بی چندھی آنکھیں اور تنگ پیشانی والوں سے .....

وکیل :۔ (مجسٹریٹ سے) یور آنر گواہ میرے موکل کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔

مجسٹریٹ :۔ دیکھو جی بات پوچھی جائے صرف اس کا جواب دو اور کسی کے متعلق زیادہ کچھ نہ کہو (وکیل کو مخاطب کر کے) جرح جلد ختم کرو، گواہ مدعا علیہ کو پہچانتی ہے۔

وکیل :۔ (پھسلا کر) اچھا چمیلی، اوہ چمیلی خاتون، تم نے ممّو صاحب کو اپنی بی بی سے کوئی وعدہ کرتے سنا تھا اور اگر سنا تھا تو کیا سنا تھا اور کہاں سے سنا تھا اور کیوں سنا تھا؟

چمیلی :۔ (وکیل صاحب کی چمیلی خاتون سے خوش ہو کر مگر ان کے ٹیڑھے

اور مسلسل سوالوں سے گھبرا کر۔ اب تم مجھے گھبراؤ نہیں۔ ایک ایک بات پوچھو تو سب بتادوں گی۔ ممّو صاحب کو ایک نہیں ہزار بار، بنکڑوں طرح کے وعدے کرتے سنا ہے۔ کبھی یہ کہتے مر جاؤں گا، میں کٹ جاؤں گا، میں زہر کھالوں گا، میں پاگل ہو رہا ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کبھی کہتے تمہارے لئے میری جان حاضر ہے۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں، میں تم کو اپنی دلہن بناؤں گا اور کبھی یہ کہتے ........

وکیل صاحب نے "بس بس" کر کے اشارہ سے چمیلی کو روکا، محمود الحسن اور مدعیہ، دونوں نے ناک صاف کرنے کے بہانے اپنے اپنے منھ پر رومال رکھ کر سر نیچا کر لیا۔ مجمع پر ہنسی کی لہر بندھے ہوئے دریا کی سطح پر دوڑتے ہوئے تھپیڑوں کی طرح کانپ رہی تھی مگر آدمیوں کا یہ ٹھٹ سراپا گوش ہو کر خاموش تھا۔ وکیل مدعا علیہ نے بات کا رخ بدل کر گواہ سے پوچھا۔ "مگر تم نے ان باتوں کو کیوں سنا اور کہاں سے سنا ہے۔"

چمیلی :- اے میں کیا جان بوجھ کر کسی کی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہوں، اجی میں ایسی بہوری نہیں۔ یہ کوئی اور ہوں گی جو میاں بیوی کی بات سننے کے لئے دروازے کھڑکیوں کے شگاف سے دیدے پھاڑ کر دیکھتی ہیں مجھے تو اپنے کام سے کام ہے۔ اب اگر جھاڑ پونچھ، یا آنے جانے میں کوئی بات کان میں پڑ گئی تو پڑ جائے، میں کیا کان بند کر لوں یا کان پکڑ کر اٹھنے بیٹھنے لگوں کہ بی بی میری توبہ، میاں میری خطا معاف بندی نے کچھ بڑی بات سن لی ہے، مجھے سزا دیجئے، میرے کانوں میں گرم ڈالئے اور جو چور کی سزا ہو وہ مجھے دیجئے۔ یہ کہتے وقت چمیلی نے اپنے دونوں کان پکڑ لئے

اور چہرہ پر مجرموں جیسی دہشت طاری کر لی جس کو مجمع نے بہت پسند کیا۔ مجمع کی یہ جارحانہ گستاخی مجسٹریٹ صاحب کو بہت ناگوار گذری اور جرح کو جلد ختم کرتے ہوئے کہا "گواہ جا سکتی ہے" مگر وکیل مدعا علیہ نے احتجاج کی کہ ابھی اس کو اور بھی سوالات پوچھنا ہیں۔ مگر مجسٹریٹ صاحب راضی نہ ہوئے اور کہا "گواہ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی۔ اب اس سے زیادہ پوچھنا فضول ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں" وکیل جرح اپنی موٹی سرخ پنسل کو اوپر اٹھا کر پھر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ چمیلی گواہوں کے کٹھرے سے یہ کہتی ہوئی نیچے اتر آئی "میاں کو اللہ کو خوش رکھے اور لاٹ بنائے، بڑے رحم دل ہیں"

اب مجسٹریٹ نے گواہ نمبر ۵ کو جرح کے لئے پیش کرنے کا حکم دیا۔ یہ گواہ پستہ قد، دبلا، پتلا کوئی ۴۰ سال کا تانگے والا تھا جس نے اپنے ہاتھ سے چابک رکھنے سے قطعی انکار کر دیا اور چونکہ مجسٹریٹ کو جلدی تھی اس لئے تانگے والے کو اپنے ہاتھ میں چابک رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ گواہ کے کٹھرے میں بھی بڑی مشکل سے گیا اور جب پولیس نے اسے دھکے دے کر اندر کر دیا تو رونے لگا۔ اور روتے ہوئے اس نے احلاس سے چلا کر اپنے لڑکے کو کہا "رمجاتی بیٹا، کھیال رکھنا کہیں گھوڑ الجھ کر نہ اٹھے"
گواہ کمزور طبیعت کا آدمی تھا۔ جس کے کپڑے وغیرہ بھی میلے تھے اور اس کے پائجامہ میں بہت سے پیوند لگے تھے۔ وکیل مدعا علیہ نے پوچھا۔

وکیل:- تمہارا نام؟

جمعراتی:- سیک جمعراتی ولد سیک سوبانی، ساکن نیا ڈلہ، تھانہ کوتوالی، جلع رانچی، بگلم کھود (بقلم خود)

وکیل:- کیا بکتا ہے، فضول بکواس کرتا ہے، جو پوچھا جائے صرف اس کا جواب

دے ؟ ـــ

وکیل مدعیہ :- یور آنر، مجھے وکیل فریق ثانی کے طرز کلام پر اعتراض ہے، یہ اجلاس ہے، تانگہ اسٹینڈ نہیں کہ گواہ کے ساتھ تانگوں والا جیسا سلوک اور طرز خطاب استعمال کیا جائے۔ یہاں وہ ایک معزز گواہ کی صورت میں ایک معزز خاتون کی طرف سے اجلاس حضور والا میں گذرانا گیا ہے کہ ایک صداقت کی تصدیق کرے اور فرد جرم ملزم پر ثابت کرے۔

مجسٹریٹ :- ہاں ٹھینک ہے، گواہ کو یوں مخاطب نہ کرنا چاہیئے۔

وکیل مدعا علیہ نے ایک بار پھر اپنے کھسکتے ہوئے چغہ اور عینک کو سنبھال کر اپنی جگہ پر رکھا، چغہ اور شیروانی کے اوپر سے نیچے گرتے ہوئے پتلون کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے اوپر اٹھایا جس سے ان کی موٹی توند ہلنے لگی۔ وکیل مذکور نے اب اپنا طرز تخاطب بدل دیا اور یوں بولے۔

وکیل :- تمہارا نام؟

جمعراتی :- حجور بتا تو چکا؟

وکیل :- اچھا تم کیا کام کرتے ہو اور کب سے کرتے ہو؟

جمعراتی :- حجور یہی تانگہ چلاتا ہوں اور جب سے والد صاحب کھپوت (فوت) ہو گئے ہیں ان کے کام کو سنبھالے ہوئے ہوں۔

وکیل :- تمہارے والد کا کب انتقال ہوا؟ ـ

جمعراتی :- (سر کھجلا کر) حجور جب رمجانی گود میں تھا، ارے توبا، گھٹنوں

وکیل :- اور رمضانی کتنی عمر کا ہے؟

جمراتی :- سرکار (اجلاس سے باہر اشارہ کرتے ہوئے) وہ دیکھئے بیٹھا ہے، کھو دیکھ لیجئے کہ کتنی عمر کا ہو گا۔ بڑا نیک لڑکا ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ "جمراتی اسے پڑھاؤ تو یہ وکیل صاحب بن جائے گا۔ بڑا ہونہار ہے" مگر سرکار کہاں سے پڑھائیں سواریاں پیسے کم دیتی ہیں، میونسپلٹی والے داروگا جی ......

وکیل :- زیادہ مت بکو، جو پوچھا جائے اس کا جواب دو، تم تانگہ کس وقت جوتتے ہو۔

جمراتی (گھبرا کر اور پولیس کانسٹبل پر خوفزدہ نگاہ ڈالتے ہوئے) سرکار جوتتا تو ہوں دن رات ہر گھڑی مدر (مگر) دن کو جرا (ذرا) بیگار میں پکڑ لیا جاتا ہوں اس لئے رات ہی کو تانگہ نکالتا ہوں کہ اس گھڑی جرا چین ملتا ہے اور نئے نئے جمکدار تانگے بھی کم ہوتے ہیں، اس لئے سواری جیادہ ملتی ہے اور پیسے بھی پورے ملتے ہیں۔ حجور اگر رات کو نہ نکالیں تو پیٹ کیونکر بھرے اور بال بچے کیا کھائیں؟

وکیل :- سچ بولو دن کو تانگہ کیوں نہیں نکالتے اور تم کو بیگار میں کون پکڑتا ہے؟

جمراتی :- (وکیل کی غصیلی اور بھاری آواز سے ڈر کر) سرکار یہ نہ پوچھئے تو اچھا ہو تا (پولیس کانسٹبل کو دکھاتے ہوئے) یہ بیچارے بھگت جی تو بڑے اچھے ہیں یہ نہیں مدر ان کے اور ساتھی اور ڈرنڈہ ٹھانے کے سپاہی تو راہ چلتے پکڑ لیتے ہیں سواری بھی کرتے ہیں اور گالیاں بھی دیتے ہیں۔

وکیل :- تم مدعا علیہ کو جانتے ہو۔

جمراتی :- میں پہچانتا تو شہر کے ہر بھلے آدمی کو ہوں مدر، ہجور نے جن کا نام

لیا ان کو میں نے دیکھا تک نہیں۔

وکیل:۔ یور آنر، گواہ جس کے خلاف گواہی دینے آیا ہے اس کو اس نے کبھی دیکھا تک نہیں (خوشی سے وکیل صاحب نے پنسل ہوا میں اچھال دی)

وکیل مدعیہ (تیزی سے اٹھ کر) یور آنر، میں وکیل ثانی کی اس شاندار کامیابی پر ان کو مبارک باد دیتا ہوں مگر جناب عالی نے گواہ کی کم علمی اور سادگی کا خود اندازہ کرلیا ہوگا اور ایسے کم علم آدمی کے سامنے عربی فارسی کے عظیم الشان الفاظ کو استعمال کرکے وکیل صاحب نے گواہ کو دھوکہ میں مبتلا کردیا ہے۔ گواہ نہیں سمجھ سکا کہ اس سے کیا پوچھا گیا اور وہ کیا جواب دے رہا ہے۔

مجسٹریٹ:۔ کھٹینک کہتے ہیں وکیل صاحب گواہ سے اچھی طرح سمجھا کر پوچھیے!

وکیل مدعا علیہ:۔ تم بتا سکتے ہو کہ وکیل صاحب یہاں ہیں یا نہیں جن کو تم زرینہ بیگم کے ساتھ لے کر جاتے تھے؟

جمراتی:۔ (ادھر ادھر دیکھ کر اور آخر میں محمود الحسن صاحب کو پہچان کر) حجور وہی تو ہیں جو کالی سیروانی اور سپھید پائجامہ پہنے بیٹھے ہیں۔ ہم ان کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ ایسے تو کم اُکل (عقل) نہیں کہ اپنے پڑوسی کو بھی نہ پہچان سکیں۔

وکیل مدعا علیہ۔ کیا تم ان کی سواری میں رہے ہو اور اگر ایسا ہے تو ان کے ساتھ اور کون کون تھا؟

جمراتی:۔ حجور بہت بار میں نے ان کو اپنے تانگہ پر بٹھایا ہے اور ان کے ساتھ تو نہ معلوم اور کتنے لوگ بیٹھے ہیں۔

:۔ کیا کبھی زرینہ بیگم کو لے گئے ہو؟

جمعراتی :۔ جی

وکیل :۔ کس کے ساتھ ؟

جمعراتی :۔ (محمود الحسن صاحب کی طرف اشارہ کرکے) ان کے ساتھ۔

وکیل :۔ کس وقت ؟

جمعراتی ۔ رات کو، آدھی رات گئے بھی اور بائسکوپ سے لوٹ کر بھی۔

وکیل :۔ تم جھوٹ بکتے ہو۔

جمعراتی :۔ نہیں حجور، میں کیوں جھوٹ بولوں، کہو تو مجیت (مسجد) میں کران اٹھاکر کسم کھالوں۔ ایک دو بار نہیں بلکہ بہت بار دونوں کو تماسا دکھانے لے گیا ہوں اور تماسے کے بعد میر کے لئے کبھی کانکے کی طرف اور کبھی ڈرنڈہ سے پرے لے گیا ہوں۔

وکیل ۔ دیکھو، سچ بولو نہیں تو سزا ہو جائے گی اور تانگہ گھوڑا ضبط ہو جائیگا

وکیل مدعیہ :۔ یور آنر، وکیل صاحب اپنے مطلب کو نہ پا کر کھسیانے ہو گئے ہیں اور ہمارے معزز گواہ کو کوسنے کاٹنے لگے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ڈرا دھمکا کر گواہ سے غلط بیانی کرالیں مگر اجلاس حضور والا میں امید کی جاتی ہے کہ ایسی ناروا حرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مجسٹریٹ :۔ (وکیل مدعا علیہ کو تنبیہی لہجہ میں) متھرا پرشاد صاحب، آپ عصاں (غصہ) جلد ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھینک بات نہیں، آگے چلئے، بہت دیر ہو گئیں۔

وکیل :۔ (ہر طرف سے لتھاڑیں کھاکر منفعل ہوتے ہوئے) شیخ جمعراتی

دیتا ورنہ یوں نہیں۔ یہ جس وقت گواہوں کے کٹہرہ میں داخل ہوئے تو سگریٹ پی رہے تھے اور اپنے خوبصورت رنگ کے ریشمی رومال سے اپنی ناک پونچھ رہے تھے جو طوطے کی چونچ جیسی آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ کٹہرہ میں کھڑے ہوکر انہوں نے پہلے تمام ناظرین کی طرف دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا جیسے وہ مجمع سے دوستی کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، پھر اسی انداز مخلصانہ سے مدعیہ کو دیکھا اور پھر ذرا اپنے جسم کو جھٹک کر کھڑے ہو گئے تاکہ دہرے بٹنوں والا کوٹ جو ذرا تنگ تھا وہ ٹھیک سے جسم پر آجائے۔ سگریٹ کے جلے ہوئے باقی حصّہ کو زمین پر پھینک دیا اور اسے اپنے نہایت چمکدار سیاہ جوتوں تلے دبا کر مسل دیا۔ جب یہ سب کچھ کر چکے تو وکیل مدعا علیہ کی طرف دیکھ کر اس طرح مسکرائے جس کے معنی تھے۔ "جناب آپ بڑے گرگ باراں دیدہ ہیں، میں آپ کو خوب پہچانتا ہوں! مگر مجھے بھی کچھ کم نہ سمجھنا۔ میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔"

وکیل نے پوچھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ گواہ نے خود ہی مسکرا کر جواب دیا "جناب وکیل صاحب میرا نام محمد اسلم خاں ہے اور آپ میرا نام پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کیجئے سمجھے"، مجمع اس قسم کے چٹکلے کا منتظر تھا، ہنس پڑا، اسلم صاحب بھی ان کے ساتھ ہل کر ہنسنے لگے اور وکیل فریق ثانی پر جو بڑھ کر کاری وار کر دیا تھا اس کی داد مدعیہ سے مانگنے کے لئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس خوبی سے جھک گئے جیسے اپنے جوتے کے پاس سے کچھ اٹھانا چاہتے ہیں، مجسٹریٹ صاحب اس ہنسی سے بہت برافروختہ ہوئے اور "انڈر۔ انڈر" پکارنے لگے۔ ان کے منہ کی چرٹ اب جل کر بہت تھوڑی سی رہ گئی تھی جواب بہتے ہوئے لعاب دہن میں بھیگ کر بکھرنا چاہتی تھی۔ مجمع جب شانت

جب تم ان کو لے گئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی اور ہوتا یا یہ اکیلے ہوتے تھے؟

جمراتی:۔ (غور کرنے کے لئے اپنے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے) جی یاد آیا کبھی یہ (انگلی سے ڈاکٹر زیدی کی طرف اشارہ کرکے) اور کبھی یہ (انگلی سے پنڈت گجادھر پرشاد کو دکھاتے ہوئے) میرے پاس بیٹھ کر سیر کو جاتے تھے۔

وکیل مدعیہ:۔ یور آنر، یہ وہی دو حضرات ہیں جن کو مدعا علیہ نے بطور گواہ صفائی پیش کیا ہے۔ برائے مہربانی نوٹ کر لیا جائے۔

مجسٹریٹ:۔ (وکیل مدعا علیہ کو مخاطب کرکے) اب گواہ کو جانے دیا جائے

جمراتی:۔ سرکار کو لاٹ صاحب کلکٹر بنائیں۔ بڑی دیر ہو گئی تھی اور اب تک ایک پائی بھی نہیں ملی ہے۔

مجمع اب آپس میں بات چیت کرنے لگا اور اجلاس کے کمرہ میں محسوس ہونے لگا کہ بہت سی شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ وکیل مدعا علیہ کو مجمع کے ہنسنے کا بہت تلخ تجربہ تھا۔ اس لئے اس نے حاکم سے مجمع کی ہنسی اور شور کا ذکر کیا۔ صاحب مجسٹریٹ بھی اس بھیڑ سے کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ حکم دیا کہ ان لوگوں سے کہو کہ چپ رہیں ورنہ نکال دیئے جائیں گے۔

اب مدعیہ کا گواہ نمبر چھ اور آخری گواہ پیش کیا گیا۔ یہ عمدہ سوٹ نیلے سرج کا پہنے تھے اور اسی رنگ کی ٹائی بھی گلے سے بندھی تھی۔ گواہ کی عمر ۲۶، ۲۷ سال سے زیادہ۔۔۔ نہ ہوگی۔ ان کا سانولا رنگ تھا، چھریرا جسم تھا جو کسی قدر دبلا تھا اور آنکھیں بھینگی تھیں مگر زیادہ نہیں۔ صرف غور کرتے یا آنکھیں ملاتے میں بھینگاپن دکھائی

ہوا تو وکیل صاحب نے ایک بار پھر اپنا چشمہ سنبھالا، عینک درست کی اور اپنے گنجے سر پر اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیر کر پوچھا۔

وکیل :۔ آپ مدعیہ کے کون ہوتے ہیں؟

اسلم :۔ کوئی بھی نہیں سمجھے۔

وکیل :۔ اگر کوئی نہیں تو پھر آپ کو زرینہ بیگم کے گھر سے آتے جاتے کیوں دیکھا جاتا ہے؟

اسلم :۔ (جھینپ کر) دور کی رشتہ ہے وہ میری ماموں زاد بہن ہوتی ہیں۔ سمجھے اور یہ جب مدھوپور آئی تھیں تو میرے ہاں ٹھہری تھیں، سمجھے

وکیل :۔ ڈیسک پر ہاتھ مار کے جس کی دھمک سے اسلم صاحب چونک گئے۔ اور اپنے وکیل کی طرف اپنی ہمت بڑھانے کے لئے دیکھنے لگے) بس مار لیا۔ پھر یہ کہئے کہ آپ مدھوپور کے رہنے والے ہیں اور یہاں زرینہ بیگم سے صرف ملاقات کرنے کی غرض سے آئے ہوئے ہیں۔

اسلم :۔ (گھبرا کر اور کچھ غصہ سے) کیا مار لیا تیر یا تکا؟ کہہ تو رہا ہوں کہ سمجھے ہیں مدھوپور کا رہنے والا خان بہادر انصار احمد خاں کا سگا بھتیجا ہوں اور ....... (اسلم صاحب کچھ سوچ کر چپ ہو گئے)

وکیل :۔ اور بولئے بولئے، یہ حاکم کا اجلاس ہے، یہاں کسی کی بات چھپی نہیں رہتی، اگر آپ چھپائیں گے بھی تو چھپی نہیں رہے گی۔ مجھے سب معلوم ہے۔

اسلم :۔ (گھبراہٹ سے پریشان ہو کر اور اس فکر میں مبتلا ہو کر کہ شاید کہیں ان کے راز سے واقف نہ ہو) اور سمجھے کچھ بھی نہیں۔ اس کو مقدمہ سے کوئی

تعلق نہیں۔

وکیل :- یور آنر، گواہ باتیں چھپا رہا ہے اور اجلاس کا بھی خیال نہیں کرتا۔ ایک ضروری بات جس کا تعلق مقدمہ سے سراسر ہے مگر گواہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ ابھی گواہ نے حضور کے سامنے اپنے اس جرم کا خود اقبال کر لیا ہے۔

اسلم :- (اقبال جرم، مقدمہ وغیرہ الفاظ سن کر بری طرح خوف کھاتے ہوئے) حضور میں نے کوئی اقبال نہیں کیا، یہ وکیل صاحب کا بالکل جھوٹا بیان ہے۔ اور میں نے کوئی بات نہیں چھپائی۔

وکیل :- یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا وہ اور کے بعد والا جملہ پورا کرنا پڑے گا۔ اسی پر سارے مقدمہ کا دارومدار ہے اور اگر آپ نہیں کہیں گے تو میں خود کہہ دوں گا!

اسلم :- (یقین کرتے ہوئے کہ وکیل اس کے راز سے ضرور کچھ آگاہی رکھتا ہے) اور کے بعد میرا مطلب یہ تھا کہ چچا مرحوم نے مجھے اپنا وارث بنایا تھا

اب مجسٹریٹ نے اپنے منہ میں چرٹ کے بچے ہوئے چھوٹے سے ٹکڑے کو ادھر ادھر ہلا کر کہا "میں خان بہادر صاحب کو جانتا ہوں۔ ان کی وارث ان کی دونوں لڑکیاں ہوں گی آپ کیونکر ہو سکتے ہیں؟" وکیل مخالف کو موقع مل گیا۔ مسکرا کر چڑانے کے لئے کہنے لگا "یور آنر، بڑے لوگوں کے بہت سے درثا بن جاتے ہیں!" اسلم صاحب پر یکے بعد دیگرے دو حملے ہو گئے اور وہ گویا ان حملوں کی تاب نہ لا کر چاروں شانے چت گر پڑے۔

وکیل مخالف :- تب اسلم صاحب، حضور والا نے خود جان لیا کہ آپ کا

یہ بیان کتنا غلط تھا، کیا آپ نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ سچ نہیں بولیں گے؟۔

وکیل موافق :۔ یور آنر، وکیل فریق ثانی پھر اپنی جگہ سے جنبش کرنا چاہتے ہیں اور جرح کے بدلے ذاتیات پر اتر آئے ہیں اور.... ایک جنٹلمین کو یوں جھوٹا بنا رہے ہیں۔ حضور والا کا اجلاس رواداری اور انصاف پسندی کے لئے دور دور تک مشہور ہے کم از کم یہاں تو ایسا " سنایان شان نہیں معلوم ہوتا کہ ایک شریف انسان کو یوں ذلیل کیا جائے

مجسٹریٹ :۔ ٹھینک ہے آگے بڑھئے۔

وکیل مخالف :۔ اسلم صاحب، آپ نے بتایا نہیں کہ زرینہ بیگم کے ہاں آپ کا آنا جانا کیوں ہوتا ہے؟

اسلم :۔ جی سمجھے، میں تو یونہی آتا ہوں، بس ملاقات ہے اور رشتہ بھی ہے،

(جھینپ کر رومال سے منہ پونچھنے لگتے ہیں)

وکیل مخالف :۔ آپ یہ بیان دیتے وقت کچھ جھینپ رہے ہیں۔ ہو نہ ہو کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور آپ کا مدھو پور سے یہاں آنا کچھ معنی رکھتا ہے۔

اسلم :۔ معنی یہی ہیں کہ مجھ سے مدھو پور میں زرینہ بیگم نے کہا تھا کہ محمود الحسن وکیل سے ان کی شادی ہو رہی ہے اور انہوں نے وعدہ بھی کر لیا ہے، سمجھے

وکیل مخالف :۔ اسلم صاحب، آپ جست کر رہے ہیں اور جو کچھ میں نہیں پوچھتا اس کا بھی جواب دیتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سکھا پڑھا کر بھیجا گیا ہے۔

اسلم :۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ مجھے کون پڑھا سکتا ہے۔ مجھے جو کچھ پڑھنا

وہ پڑھ چکا۔ چچا مرحوم تو مجھے پڑھا لکھا نہ سکے تو اور کوئی کیا پڑھائے گا؟

وکیل مخالف :- اگر آپ نے سیکھا پڑھا نہیں تو یہ اچھے اچھے کپڑے اور یہ شان وشوکت کہاں سے ہے؟

اسلم :- (اس اچانک سوال سے چونک کر) یہ مجھے ممانی جان نے دیئے ہیں مگر ان باتوں کو میرے اس جواب سے کیا غرض کریں ۔ مے زرینہ بیگم کی زبانی محمود صاحب کے وعدے سنے تھے ۔ سمجھے۔

وکیل :- یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس سوال کو مقدمہ سے بہت تعلق ہے ۔ نقلی صاحبوں کی آمدنیاں بھی نقلی ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی باتیں اجلاس حضور والا میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں ۔

وکیل موافق :- یور آنر۔ میں وکیل صاحب کے اس تیزابی جملے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں ۔ یہ اجلاس نہ ہوا مشکوک اڈہ ہو گیا ۔ جہاں کپڑے اتار لئے جاتے ہیں اور جیبیں کتری جاتی ہیں ۔

وکیل مخالف :- یور آنر۔ میں وکیل فریق ثانی کے محض بازاری قسم کی تشبیہ کو برداشت نہیں کر سکتا ۔ اور یہ اس قسم کے ریمارک اب سے پہلے بھی کر چکے ہیں اور میں محض جناب والا کے رعب کی وجہ سے سن کر چپ رہ گیا ہوں اور خون کے گھونٹ پی رہا ہوں ۔ اگر آپ کا خیال ......

وکیل موافق :- یور آنر۔ میری باتوں کو بازاری قسم کا کہنے والا میرے خیال میں خود سوقیانہ خیال کا انسان معلوم ہوتا ہے اور اس جیسے زبان دراز انسان کے لئے حضور والا کا اجلاس موزوں جگہ نہیں ۔ جہاں شرفا آتے ہیں اور حق و باطل کو الگ

کرنے میں حکومت کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

وکیل مخالف :- یور آنر، مجھے بازاری اور زبان دراز کہنے والا انسان اس قابل نہیں کہ اسے شرفائے اجلاس میں بیٹھنے دیا جائے، جہاں صرف شرفا اور اچھے لوگ بیٹھتے ہیں۔

وکیل موافق :- یور آنر، میں احتجاج کرتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ مجھے اجازت ملنی چاہئے کہ بابو متھرا پرشاد پر ڈیفے میشن کی نالش داغ دوں اور دفعہ .....

وکیل مخالف :- یور آنر مجھے بھی اجازت ملنی چاہئے کہ بابو رگھوناتھ سرن کے خلاف مقدمہ چلاؤں۔

مجسٹریٹ صاحب نے وکلا کو لڑتے دیکھ کر آنڈر آنڈر کا شور کیا مگر مجمع کی ہنسی سے ان کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہوگئی۔ آخر کار صاحب ایس۔ ڈی او بہادر نے حکم دیا کہ تماشائیوں کو ڈنڈے مار کر باہر کردو۔ ادھر تماشائی باہر نکالے جارہے تھے اور ادھر گواہ اپنے کٹہرے سے اتر کر نیچے چلا آیا اور اپنے چہرہ اور پیشانی کے پسینہ کو نہایت خوشبودار رومال سے پونچھنے لگا۔ شکار کو پنجرے سے فرار ہوتے دیکھ کر وکیل مخالف نے سردست اپنی نالش کا خیال چھوڑ دیا اور مجسٹریٹ صاحب کو مخاطب کرکے کہنے لگے " یور آنر، گواہ نے آپ کے حکم کے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی اور نیچے اتر کر نہایت اطمینان سے اپنا پسینہ خشک کر رہا ہے " مجسٹریٹ صاحب وکلا کے جھگڑنے سے نہایت کبیدہ خاطر ہوگئے تھے، جھنجھلا کر پوٹ کے بھیگے اور گلے ہوئے ٹکڑے کو اپنے منہ سے نکال کر زمین پر پٹک دیا اور کھڑے ہو کر بولے " بس اب اس غریب کی جان چھوڑیئے، مقدمہ آج ملتوی کیا جاتا ہے !! "

نیلو، یہ لو اخبار "چھوٹا ناگ پتر" کے ایک صفحہ کا ترجمہ بھیج رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر تم کو محمود صاحب کے مقدمہ کی ایک تاریخ کا پورا حال معلوم ہو جائے گا۔ اب میں تھک گیا ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔ مقدمہ کے فیصلہ کی خبر سناؤں گا۔ مگر ایک شرط پر کہ مجھے بھی میری قسمت کا فیصلہ جلد سنا دو۔ میں ملزم کی طرح کوئی ڈیڑھ سال سے تمہارے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں، گواہ پر گواہ گذر گئے، ہر قسم کے بیانات، کاغذات، خط خطوط، سب پیش کر دئے گئے مگر صاحب جج بہادر کا فیصلہ صادر نہیں ہوتا۔ یہ تمہارا فیصلہ کیا جان و دل کا فیصلہ، یا یوم قیامت کا فیصلہ ہے؟ زیادہ کیا لکھوں۔ رات تمام ہونے کو آئی۔ چڑیاں اپنے نغمے سنا رہی ہیں چہچہانے لگی ہیں اور عنقریب پورب سے شہنشاہ خاور طلوع ہونے والا ہے۔ اپنی اماں سے میرا سلام کہنا اور مہدی صاحب اور رعنا بیگم کو میری یاد دلا دو۔ فقط تمہارا

(امیدوں کا مارا)

---

(۴۵)

رانچی

۲۰ مارچ ۳۳ء

میری کائنات حیات! خوش رہو۔

تمہارا خط آیا اور اس کے بعض جملے اتنے حسین اور لذیذ تھے کہ زبان ابتک چٹخارے لے رہی ہے اور کام و دہن کو آسودگی بخش رہی ہے مگر اس چاشنی سے بھوک اور جاگ اٹھی ہے جو ایک قحط زدہ انسان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ تمہارا

یہ جملہ کتنا مزیدار تھا" آپ تو نادان بچے کی طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ موقعہ کیا ہے" پھر تمہارا یہ لکھنا" دنیا میں کوئی کام گھبرا کر کرنے سے نہیں ہوا ہے بھائی جان کو دیکھئے، اگر وہ دردانہ بیگم کی خفگی سے گھبرا اٹھتے تو آج کچھ بھی نہ ہوتا اور پھر یہ لکھنا" ہر کام کے لئے قسام ازل نے وقت مقرر کر دیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے صبر و ضبط خوب کیا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے، سب کچھ اپنے وقت مقررہ پر خود ہی ہو جائے گا" تمہاری یہ پہیلیاں میری سمجھ میں نہ کبھی آئی ہیں اور نہ اب آئیں گی۔

میں اپنے ہر خط کے بعد مصمم ارادہ کر لیتا ہوں کہ اگر اب کے خاطر خواہ جواب نہ ملا تو کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤں گا مگر ہر بار تمہارا خط آتا ہے، اس میں کچھ بھی نہیں ہوتا پھر بھی میں جواب لکھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہوں اور جو کچھ پوچھتی ہو اس کا جواب مفصل لکھنے لگتا ہوں۔ زرینہ بیگم کے مقدمہ کا فیصلہ کل سنا دیا گیا اور کل ہی میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا جس کی وجہ سے اس وقت میرا بایاں ہاتھ پٹی سے بندھا ہے اور شاید اس کی ہڈی میں چوٹ آ گئی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہوا کہ کل دوپہر کو میں اپنے کام سے فارغ ہو کر دفتر میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ میں نے کہا" اندر آجاؤ" دیکھا لچھمن سنگھ ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لئے اور سر پر گنواروں جیسی پگڑی باندھے جو اس کا معمولی لباس ہے، چلا آ رہا ہے مجھے سلام کر کے مودب بیٹھ گیا۔ میں نے کہا" بیٹھو کیسے آنا ہوا؟ کیا پھر آنکھوں میں تکلیف شروع ہوئی؟"

اس نے جواب دیا" نہیں میں دوسرے ضروری کام سے آیا ہوں۔ حکم ہو تو

کہوں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "ہاں ہاں کہو، مگر ذرا جلدی کرو، مجھے باہر جانا ہے"
لچھمن سنگھ نے میرا یہ جواب سن کر باہر جھانکا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی
سننے والا نہیں تو رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھ پر احسان کیا
ہے کہ بغیر کسی فیس کے میرا علاج کیا اور میری آنکھیں اچھی کر دیں، آپ میرے محسن ہیں
اور میری نظر کے سامنے کسی کی مجال نہیں کہ آپ کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔" میں
ہنس دیا اور اس کے مخلص جذبات کے ساتھ اپنی آنکھوں سے ہمدردی کا اظہار
کیا اور کہا "لچھمن سنگھ، بھئی تم تو صاف صاف کہو کہ کیا ہوا، میں جانتا ہوں کہ
تم راجپوت ہو اور راجپوت ذرا کم جھوٹ بولتا ہے۔" وہ میری کرسی کے پاس کھسک
آیا اور کہنے لگا "مجھے پکی خبر معلوم ہے کہ آج رات کو کچھ لوگ آپ پر حملہ کریں گے"
میں نے بناوٹی خوف اور تعجب سے پوچھا "یہ کیوں اور کیسے؟" اس نے جواب دیا۔
"آج رات آپ کو ایک آدمی بلانے آئے گا کہ اس کے ہاں کوئی سخت بیمار ہے۔
چل کر دیکھئے اور راستہ میں آپ پر حملہ ہوگا۔" میں نے کہا "شاید تم کو غلط خبر ملی
میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے کہ کوئی میرا دشمن ہوگا اور اگر یہ ٹھیک ہے جیسا کہ تم کہتے
ہو تو میں رات کو بلانے والے کے ساتھ نہ جاؤں گا۔"

لچھمن سنگھ کی آنکھوں سے خلوص اور محبت کی چنگاری نکل رہی تھی، میں
جانتا تھا کہ یہ سیدھا سادھا ست بچن راجپوت ہے۔ اس نے مجھ سے اسی رازدارانہ
لہجہ میں کہا "دنیا میں ہر کسی کا دوست دشمن ہوتا ہے، اس غفلت میں نہ رہیئے کہ
سب آپ کے دوست ہیں۔ اور اگر آپ آج رات کو نہ جائیں گے تو معاملہ یہاں
ختم نہیں ہوگا بلکہ ممکن ہے کبھی دوسرے موقعہ پر خطرہ اور اچانک طرح سے آجائے

اس لیئے بہتر ہے کہ اس خطرہ کی جڑ ہمیشہ کے لئے کاٹ دی جائے۔" میں اب اس عجیب طرح کی پیشین گوئی میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ لچھمن سنگھ سے دریافت کیا۔ "یہ کیسے ؟" اس نے ایک بار اٹھ کر پھر باہر دیکھا اور اندر آکر کہنے لگا "کیا آپ کو مجھ پر بھروسہ ہے ؟" میں نے اسے یقین دلانے والے لہجہ میں کہا "ضرور۔" لچھمن سنگھ میرا اعتماد دیکھ کر مسکرا دیا اور کہنے لگا "تو پھر اب جو کوئی بھی بلانے آئے اس کے ساتھ چلے جائیے۔" یہ کہہ کر وہ نہایت احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا میرے بنگلہ سے چلا گیا اور مجھے دریائے حیرت میں غوطے کھانے کے لئے چھوڑ گیا۔

ٹھیک ایک بجے رات کو ایک معمولی شکل وصورت کا انسان مجھے اپنے گھر لے جانے کو آیا اور اس نے کہا کہ اس کی بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔ جلد چل کر دیکھ لیجئے۔ میں نے چاہا کہ نہ جاؤں مگر وہ اتنی خوشامدیں کرنے لگا اور میرے پاؤں سے روتا ہوا لپٹ گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھے یہ سچا معلوم ہونے لگا اور لچھمن سنگھ جھوٹا اور پھر دل میں کچھ یہ بھی خیال آیا کہ چل کر دیکھوں کیا ہوتا ہے ؟۔ میں نے احتیاطاً اپنی جیب میں ریوالور رکھ لیا کہ اگر واقعی جان پہ آبنے گی تو اسے استعمال کرونگا۔ اور اسے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل پڑا۔ جب ہم ہیلو سے آگے سنسان میدان میں پہنچے تو سڑک کے کنارے چند آدمی ملے جو میرے موٹر کو دیکھتے ہی سڑک پر بڑی بڑی چٹانیں لڑھکانے لگے۔ اگر میں گاڑی روک نہ لیتا تو یقینی ان پتھروں سے ٹکرا کر سڑک کے کنارے جا گرتا۔ ابھی گاڑی مشکل سے رکی تھی کہ یہ لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میرے پاس جو بیٹھا تھا وہ بھی مجھ سے چمٹ پڑا۔ میں بے دست وپا ہو گیا۔ میرے متعلق ان آدمیوں کے ارادے

جیساکہ ان کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا، اگر قاتلانہ نہیں تو کم از کم ظالمانہ ضرور تھے میں اپنے یوں چلے آنے پر دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف سے آدمیوں کا دوسرا جھنڈ نکلا اور اس نے چشم زدن میں مجھ پر حملہ کرنے والوں کو باندھ کر ڈال دیا۔ مجھے بچانے والا لچھمن سنگھ تھا اور یہ لوگ جن میں ڈاکٹر زیدی اور پنڈت جی بھی تھے کسی اور کے فرستادہ تھے۔ لچھمن سنگھ نے ان کو باندھ کر کوتوالی لیجانا چاہا مگر میں اس بات پر راضی نہ ہوا۔ ڈاکٹر زیدی اور ان کے ایک چشم پنڈت جی بلبلا کر مجھ سے رحم کی درخواست کر رہے تھے۔ جب میں نے ان کو کوتوالی لیجانے سے انکار کیا تو لچھمن سنگھ نے کہا "اب آپ ان بدمعاشوں کو سزا دلوانا نہیں چاہتے تو چھوڑ دیجئے مگر یاد رہے، یہ مار آستین ہیں، کبھی نہ کبھی پھر سے وار کریں گے۔" میں نے مکدر ہو کر کہا "بلا سے ان کو جانے دو ان کا ضمیر ان پر خود ملامت کرے گا۔"

لچھمن سنگھ کا راجپوتی خون پورے جوش پر تھا، اس وقت رحم یا ضمیر وغیرہ کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے شاید اپنے وہ دن یاد آ رہے تھے جب ان لوگوں نے اسے مل کر خوب لوٹا تھا اور اسے الو بنایا تھا۔ وہ بھرے ہوئے شیر کی طرح ٹہل رہا تھا اور اپنے بندھے ہوئے شکاروں کو کچا کھا جانا چاہتا تھا خاص کر اسے پنڈت جی سے بڑا غصہ تھا۔ اس نے غصہ سے بھوت ہو کر کہا "اگر آپ ان کی سزا کے لئے راضی نہیں تو نہ ہوں، میں ان کی سزا کروں گا۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا "بہادرو، لگاؤ ان کے منہ پر پھٹے جوتے اور رنگ دو ان کے منہ کو کولتار سے۔" لچھمن سنگھ کے ساتھی اپنے کام میں ہوشیار معلوم ہوتے تھے اور اپنے سامان سے لیس ہو کر آئے تھے۔ جب انہوں نے اپنی کاروائی شروع کی تو

مجھ سے نہ دیکھا گیا اور میں لوٹ کر چلا آیا۔

میں اس واقعہ پر مزید رائے زنی کرنا نہیں چاہتا۔ ہر انسان کی فطرت جدا جدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایک چیز کو برا سمجھتا ہے تو دوسرا اس چیز کو بھلا۔ اور چونکہ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست اس لئے حادثہ پر بغیر کچھ اور کہے ہوئے میں آگے بڑھتا ہوں اور یہ استدعا کرتا ہوں کہ تم بھی خدا کے لئے اس کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا۔ جو میرے دشمن ہیں اللہ کو یہ خبر ہو گئی ہو گی کہ مجھے ان کی ذلیل ذہنیت کا پتہ چل گیا ہے اور اگر ان کے دل میں ضمیر کی پکار اب تک سنائی دیتی ہے تو وہ یقینی اپنی اس ذلیل حرکت پر پریشان ہوں گے اور آئندہ بہتر زندگی گذارنے کی کوشش کریں گے۔ میرے ہاتھ میں معمولی چوٹ ہے جو دو چار دن میں اچھی ہو جائے گی۔ کوئی تردد کی بات نہیں۔

تم کو یہ سنکر افسوس ہوگا کہ محمود صاحب مقدمہ ہار گئے۔ اور مجسٹریٹ نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے: "زرینہ بیگم ایک شریف ماں باپ کی بیٹی ہیں اور ان کو جان بوجھ کر شادی کا جھوٹا وعدہ دیا گیا ہے اور پھر دھوکا دیا گیا ہے۔ مدعیہ کے گواہ اور اس کے پیش کئے ہوئے خطوط باوجود ہر کوشش کے جھٹلائے نہ جا سکے اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ الہ آباد کے تحریر پہچاننے والے اکسپرٹ کا بیان بھی غلط تھا اور اس نے اس قسم کی غلط بیانی میں لالچ سے کام لیا ہے۔ میں اس فیصلہ میں حکام بالا کا دھیان اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ تحریر پہچاننے والوں کی جماعت کو لالچ اور اس کے پیدا کئے ہوئے برے نتائج سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اس قسم کی غلط بیانی کو حاصل کرنے کے لئے ملزم نے جو تدبیریں اختیار کی ہیں وہ

اس لئے اور بھی ناقابل معافی ہیں کہ ملزم قانون داں ہونے کی حیثیت سے اس
قسم کے جرائم سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس کی سزا کیا ہے۔ مگر چہ تجزیہ
تمام باتیں ایک ایسے مقدمہ کے دوران میں نکل آئی ہیں جن کا تعلق ایک شریف
مہذب اور تعلیمیافتہ خاتون سے ہے اس لئے اس پر مزید کارروائی ابھی خلاف
موقعہ معلوم ہوتی ہے۔ مدعیہ کے ساتھ جو ظلم کیا ہے اور اسے بدنام کرنے کی جو تدبیر
کی گئی ہے وہ ظاہر ہے اور جب ایک شریف خاتون کو دھوکا دے کر اسے خراب
کیا گیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ عدالت کو کھٹکھٹائے
اور قانون وقت سے انصاف طلب کرے۔ مجھے مدعیہ کی ہمت اور شجاعت پر
خوشی ہے کہ اس نے اپنی دیگر مظلوم بہنوں کی طرح خاموش رہ کر تمام عمر کی بدنامی
اور اپنی ہم چشموں کی نظر میں خواری کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے سے انکار
کر دیا ہے"

وہ ضرورت ہے کہ ہندوستان کی تعلیمیافتہ لڑکیاں اپنی حفاظت کریں اور
اپنے ساتھ برا سلوک کرنے والے بدمعاشوں کو ان کے کیف کردار کو پہنچائیں۔
ہمارے دیس کی خواتین جب اتنی بہادر ہو جائیں گی تو پھر اس قسم کے دوست نما
دشمن کا خطرہ جاتا رہے گا۔ میں فیصلہ صادر کرتا ہوں کہ مدعیہ کا دعوے صحیح ہے اور
محمود الحسن صاحب نے اسے کھلا ہوا دھوکا دیا ہے جس کی ان کو سزا ملنی چاہئے اور
وہ یہ کہ اگر یہ دس دن کے اندر زرینہ بیگم سے حسب قاعدہ نکاح اسلام یا سول میرج
شادی نہیں کرینگے تو ان کو معاوضہ میں پانچ ہزار کی رقم دینا پڑے گی جو پھر بھی ایک شریف
خاتون کی عزت کے مقابلہ میں بہت کم ہے اگر ان شرطوں میں سے کسی ایک پر

بھی عمل نہیں کیا گیا تو میں ۲½ سال کی قید بامشقت کی سزا تجویز کرتا ہوں "

مجھے اس مقدمہ کے فیصلہ کے متعلق آج صبح اسلم صاحب نے کہا۔ بیچارے خوش خوش مجھے یہ تمام فیصلہ کی نقل پڑھ کر سنانے لگے اور جب ختم کر چکے تو میری طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ میں فیصلہ کی دلچسپ زبان کی شیرینی میں کھویا ہوا تھا اور یہ نہ دیکھ سکا کہ اسلم صاحب داد طلب ہیں۔ میں نے ان کا دل بڑھانے کے لئے کہا "واہ خوب، یہ تمام آپ کی محنتوں کا نتیجہ ہے اور میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں" اسلم صاحب فدویانہ انداز میں جھینپے اور سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "یہ آپ کی مہربانی ہے، ممانی جان نے بھی بہت دعائیں دیں اور کہا "بیٹا تمہاری مدد سے یہ بیل منڈھے چڑھی ورنہ نہ جانے میری بٹیا کا کیا حال ہو جاتا؟" میں نے چھیڑنے کے لئے کہا "اور زرینہ بیگم نے شکریہ ادا کیا یا نہیں، وہ تو آپ سے بہت خوش ہوں گی" اسلم صاحب کچھ غمگین ہو کر بولے "جی ہاں، ہیں مگر اتنی نہیں جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، وہ شاید مجھ سے خفا ہو گیا" میں نے حیرت سے پوچھا "یہ کیوں"؟ بہت آزردہ اور مضمحل ہو کر بولے "مقدمہ کی آخری پیشی کے دن جب وکیل نے مجھ پر جرح کی تو میں گھبرا گیا تھا اور شاید کچھ ادھر کی بات ادھر کر دی تھی۔ وہ جب اجلاس سے باہر نکلیں تو بگڑ کر کہا۔ "تم احمق ہو، معمولی وکیل کی ذرا سی دھمکی پر اول فول بکنے لگے تھے، تم کسی مصرف کے نہیں" مجھے اسلم کی سادگی اور خلوص پر رحم آ رہا تھا اور مس زرینہ کی بے دردی اور بے رخی پر غصہ۔ میں نے اسی غصہ میں اسلم صاحب سے پوچھا "اور اس فیصلہ کے بعد اگر زرینہ بیگم سے محمود صاحب نے شادی کر لی تو پھر وہ آپ کو شاید اپنے گھر

باہر نکال دیں گی ؟"

اسلم نے شاید اب تک فیصلہ کے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ میرے کہنے سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جن میں اندرونی غم کے آنسو چھلکنے لگے تھے۔ مجھے اس معصوم اور بھولے انسان پر رحم آرہا تھا کہ وہ اٹھے اور یہ کہہ کر چلے گئے "میں نے اس پر اب تک غور نہیں کیا تھا، جا کر ممانی جان سے ان کی رائے لیتا ہوں"

ادھر اسلم صاحب گئے ہیں اور میں یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ میری کلائی میں جہاں پٹی بندھی ہے اس میں کچھ درد ہونے لگا ہے۔ مجھے اجازت دو کہ پٹی کھولکر دیکھوں، شاید یہ زیادہ سخت بندھ گئی ہے جس سے درد بڑھ گیا ہے۔ خدا حافظ

(تمہاری دید کا مشتاق)

---

(۴۶)

رانچی

یکم اپریل

باعثِ لطف و خمار!

آج ایک بجے دن کو تمہارا تار آیا کہ ہم آرہے ہیں، ملنے کے لئے تیار رہیئے۔ شکریہ۔ میں نے بھی اس تار کا فوراً یہ جواب دیا "رانچی میں شدید زلزلہ، ہر مکان سرنگوں، میں خود بھی اس کا شکار، جلد آؤ" تار دے کر بیٹھا تھا کہ بیرنگ چٹھی ملی، لیکر دیکھا، لکھا تھا "پہلی اپریل" تم نے اپنی تحریر بگاڑ کر لکھا تھا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می زیب
من انداز قدت را می شناسم

یہ اپریل فول کی باتیں بہت ہوئیں ۔ کب تک مجھے فول بنایا جائے گا ؟ ۔ مذاق کی یہ باتیں کبھی سنجیدہ صورت اختیار کریں گی یا یہ طفل شوخ ہمیشہ بالک پن میں رہیگا اور کبھی جوان نہ ہوگا ، میری وجہ حیات ، کیا کہوں ، میری صورت سوال ہے اور ایک عرصہ سے ، دیکھو بھکاری کو زیادہ دیر کھڑا رکھنے کے بعد اگر اسے بھیک دی جائے تو پھر اس خیرات کی قیمت کم ہو جاتی ہے ۔ بھوکے کو اگر خوب ترسا کر کھانا دیا جائے تو پھر بھوکا اس غذا کی لذت سے پوری طرح لطف نہیں لے سکتا ۔ میں بھکاری ہوں اور بھوکا ، عرصہ کا ، اور مدت سے تمہارے رحم و کرم کے بھروسے پر زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں ۔

پرسوں تمہارا خط آیا تھا جس میں کچھ بھی نہ تھا ۔ وہی ٹال مٹول کی باتیں تھیں کچھ دردانہ بیگم اور مہدی صاحب کے چٹکلے اور گدگدیاں تھیں ، کچھ مجھ پر فقرے چست کئے گئے تھے اور میری طرز تحریر کا خاکہ اڑایا گیا تھا ۔ مگر سارے خط میں الف سے لے کر یے تک حرف مطلب کا ایک شوشہ بھی نہ تھا ۔ تمہاری اس بے رخی سے اب عرصہ ہوا کہ وہ تمام باتیں بھول گیا ہوں جو ہمارے افق امید پر گلال اچھالا کرتی تھیں اور ہماری آرزوؤں کے نازک پودے پر اوس بن کر ٹپکتی تھیں ۔ اب تو تخیلات کے باغ میں خزاں آگئی ہے ، ہو کا عالم ہو گیا ہے ، سوکھے پتے کھڑکتے ہیں اور خاک اڑتی ہے ۔ اور ان باتوں کے باوجود ستم ظریفی یہ ہے کہ لمبے اور مزیدار خطوں کی فرمائش برابر جاری ہے اور محمود صاحب کی تفصیلی حالت سننے کے لئے ہنوز روز اول کی سی بے قراری ہے ۔

جب تم اپنی عادت نہیں بدلتیں تو پھر میں اپنی وضع کیوں بدلوں۔ لو سنو۔ کل بیچارے اسلم صاحب پھر آئے اس دفعہ نہ تو ان کے کپڑے ایسے صاف اور سجل تھے اور نہ ان کی چاندی کی ڈبیہ میں سنہرے سگریٹ۔ آئے اور تھکے ہوئے راہی کی طرح ٹھنڈا سانس لیکر بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا "اسلم صاحب، خیریت ہے، مزاج کیسے ہیں" ٹھنڈا سانس لیکر بولے "اچھا ہوں، خدا کا شکر ہے۔ کلکتہ جا رہا ہوں اس لئے ملنے چلا آیا" مجھے اسلم صاحب کی سادہ لوحی سے ہمدردی ہے، میں نے رنجیدہ ہو کر پوچھا "بھئی خیر تو ہے، یہ کلکتہ کیوں جانے لگے؟" انہوں نے پھر ٹھنڈا سانس لے کر مجھے جواب دیا "اب یہاں رہ کر کیا ہوگا۔ جو امید تھی وہ ٹوٹ گئی، جو خواب تھا اس کی الٹی تعبیر ہوگئی" میں نے غمگین آواز میں پوچھا "دو بھائی، آج کیا ہوگیا کہ یوں شکستہ دل ہو رہے ہو، آخر ش کیا ہوا کہ یوں بیراگی بن کر دیس سے بدیس ہوا چاہتے ہو"

اب ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، نہایت مہین آواز میں بولے "محمود صاحب نے زرینہ بیگم سے شادی کرلینا منظور کرلیا ہے اور ۵ اپریل اس کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے شادی کلکٹر کے سامنے ہوگی" "ارے" میرے منھ سے بیساختہ نکل پڑا اور میں نے حیرت سے ان کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا "یہ کلکٹر کے سامنے، کیا سول میرج ہوگا" انہوں نے اپنا سر ہلا دیا اور کچھ نہ بولے۔ اب میری حیرت سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی طرح دمبدم بڑھتی جارہی تھی اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے دریافت کیا "یہ سول میرج پر زرینہ بیگم کیوں راضی ہوگئیں، کیا دونوں مسلمان نہیں ہیں؟" اسلم صاحب نے نظریں نیچی کرکے کہا "یہ سول میرج زرینہ کے ایما سے ہو رہا ہے، ان کے اس خیال پر ان کے والدین نے مخالفت کی مگر زرینہ نے ایک نہ مانا وہ برابر یہ کہتی رہیں

کہ میں اسلامی طریقہ نکاح سے بندھ جاؤں گی اور محمود صاحب جیسے شوہر کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔ مجھے ایسے طریقۂ نکاح کو کام میں لانا چاہئے۔ جس سے میں اپنے شوہر کے برابر رہ سکوں اور میرے حقوق بھی اتنے ہی ہوں جتنے کہ ان کے ہوں۔ سول میرج سے میں ان کے دباؤ میں نہ رہوں گی اور جس وقت انتظام یا بے رخی برداشت نہ کر سکوں گی تو ان سے الگ ہو جاؤں گی۔" اسلم صاحب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔ اور میرا خیال مجھے بگولے کی طرح آسمان و زمین کی سیر کراتا رہا اور ان واقعات کی طرف لے گیا جہاں اکثر مسلمان عورتوں نے ارتداد کو اپنے ظالم شوہر پر ترجیح دی اور اس طرح اس بندھن کو توڑا ہے جس میں بندھ کر وہ اپنے شوہر کی دست نگر ہو گئی تھیں۔

میں ان واقعات کو سوچ رہا تھا اور زرینہ بیگم کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔ ایک خاص قسم کی سوسائٹی میں رہ کر میری آنکھوں پر تعصب کی عینک لگ گئی تھی مگر اب اس عینک سے آنے والے آزاد اور بہادر زمانے کی دھندلی تصویر آنکھوں کو نظر آنے لگی تھی، یہ تصویر آہستہ آہستہ صاف ہوتی جاتی تھی اس لئے نہیں کہ عینک کا شیشہ گرد و غبار سے صاف ہو گیا تھا بلکہ آنے والا زمانہ آہستہ مگر یقینی بڑھتے ہوئے قدموں سے میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیخ کر کہوں "اے آئینہ کی طرح صاف اور مرمریں سختی رکھنے والے بہادر زمانے، تم جلد آؤ کہ ہم تم کو لبیک کہنے کے انتظار میں کب سے کھڑے ہیں۔" میرے اس خیال کے سلسلہ کو اسلم صاحب نے اپنی کھانسی اور کھنکھار سے توڑ دیا۔ میں نے اپنی خاموشی کی معذرت کرتے ہوئے کہا "اسلم صاحب، یہ آپ نے عجیب خبر سنائی، بہرحال زرینہ بیگم نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر اپنی بھلائی کے لئے کیا ہوگا۔ مگر اب آپ کیا کریں گے؟"

میرے اس سوال پر انہوں نے آہ سرد کھینچی اور کہا "ممانی جان نے دو ہزار روپے دیئے کہ یہ کل تمہاری رقم میں سے بچے ہیں، اور کہا "بیٹا، تم کو اللہ زندہ رکھے بڑے اڑے وقت میں تم نے اپنی بدقسمت ممانی کا ساتھ دیا۔ ان روپیوں سے کلکتہ میں جاکر اپنا کاروبار شروع کرو، تمہارے ماموں وہاں تمہیں کسی کام پر لگا دیں گے۔ اور دیکھو گھبرانا نہیں، تمہاری ممانی تم کو اپنے بیٹے سے زیادہ پیار کرتی ہے۔" یہ دنیا کی احسان فراموشی اور خودغرضی کی ایسی مثال تھی کہ جس کو میں سن کر اچنبھے میں آگیا۔ اللہ اکبر۔ جی چاہتا تھا زمین پر ڈنڈے ماروں، آسمان پر سیڑھی لگا کر چڑھ جاوں اور اس کے تمام چاند، تارے اور سورج کو نوچ کر پھینک دوں۔ یہ اندھیر۔ یہ ظلم، یہ خودغرضی اور یہ دغابازی! اف اف میرا کلیجہ پھٹا جاتا تھا اور کسی کو پیٹ کر فرش کرنا چاہتا تھا، میں اپنی سینہ کوبی اور جامہ دری کے کٹھور خیالوں میں پھنسا ہوا تھا کہ اسلم صاحب خاموشی سے اٹھے اور گردن جھکا کر باہر نکل گئے۔

(تمہارا)

---

(۴۷)

رانچی
۱۱ اپریل ۳۷ء

میری جان!

لیجئے صاحب، کل محمود صاحب اور زرینہ بیگم کا سول میرج ہو گیا۔ مجھے دلہا دلہن دونوں نے مدعو کیا تھا۔ میں نے بھی خوب شاندار سوٹ چڑھایا، اچھی طرح

شیو کر کے چہرہ پر خوب روغنیات اور خوشبویات ملے اور بن ٹھن کر نکلا کہ دیکھنے والے دیکھتے رہیں۔ سول میرج میں شیروانی اور چست پائجامہ کی گنجائش کہاں ؛ محمود صاحب بھی صاحب بنے بیٹھے تھے اور زرینہ بیگم کا نہ پوچھئے، وہ تو ایسے زرق برق اور شان و شوکت میں تھیں کہ کمرہ روشن ہو گیا تھا اور دور دور تک ہوا کی لپٹیں تختہ گل بن گئی تھیں۔ زرینہ بیگم کے والد اور وہ معصوم کھینٹ جس کو ہم اب تک اسلم صاحب کہہ کر پکارتے ہیں وہاں موجود تھے۔ اول الذکر کچھ اس طرح جیسے وہ کوئی گناہ کر رہے ہیں۔ اور آخر الذکر سر جھکائے، مغموم اور کھویا ہوا گویا پروہت کے گنڈا سے کا منتظر۔ ہر شخص اپنے خیال میں مگن تھا اور محمود صاحب کے یار غار ڈاکٹر زیدی اور پنڈت گجادھر پرشاد نئے نئے کپڑوں میں یوں چمکتے پھرتے تھے جیسے سانپوں نے کینچلیاں بدل ڈالی ہوں۔

زرینہ بیگم مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ آج عرصہ کے بعد ان کو دیکھا تھا۔ شاید تردد ات اور پریشانیوں کی وجہ سے وہ کچھ اور دبلی ہو گئی تھیں اور ان کا دھان پان جسم کچھ اور نازک ہو گیا تھا۔ ان کے صاف نقوش، روشن آنکھیں اور جاذب توجہ منھ اور ہونٹ پر ایک خاص قسم کے استقلال اور خود اعتمادی کی روشنی جھلک رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی دروپدی ہے جس کو خود غرض اور غافل سماج نے دیویودھن کے حوالہ کر دیا ہے۔ مجھے زرینہ بیگم کو دیکھ کر ہمیشہ میرے جذبات میں ایک خاص قسم کی کشمکش ہو جاتی ہے اور میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو جاتا ہوں کہ ان کو آنکھوں پر بٹھاؤں یا آنکھوں سے گراؤں۔ چنانچہ اس وقت بھی جب مجھے وہ دیکھ کر مسکرائیں تو میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ مگر ایک چیز ان کی مجھے بہت مرعوب کرتی ہے اور

وہ ان کی خود اعتمادی اور جرات ہے۔ اس دھان پان جسم میں ایک بہادر دل ہے جو ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہے اور اپنے حقوق کا لوہا منوانے کی قدرت رکھتا ہے۔

ہم سب شادی کے دوران میں خاموش ہی رہے۔ محمود صاحب حسب دستور مسکرا کر باتیں کرنا چاہتے تھے اور ان کے دو دوست بھی مگر میں جانتا تھا کہ مجھے دیکھ کر ان کے دلوں میں طوفان ضرور اٹھ رہا ہوگا اور اس کے بخارات یقینی دماغ تک پہنچ رہے ہوں گے۔ ان حضرات میں ایک چیز بڑی قابل تعریف ہے وہ یہ کہ ان کا دل اگر روتا ہے تو چہرہ ہنستا ہے اور اگر چہرہ روتا ہے تو دل مسرت کے شادیانے بجاتا ہے۔ یہ ظاہر و باطن کا اختلاف، بدقسمتی سے، موجودہ زمانے میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور جو ایسا کر سکتا ہے وہ کامیاب انسان سمجھا جاتا ہے!

میں نے ان کو مبارکباد دی اور ان کے جوڑے کو کامیاب اور خوش زندگی گذارنے کے لئے دعائیں دیں۔ جب میں نے زرّینہ بیگم سے پوچھا "اور اب ہنی مون کہاں منایا جائے گا" تو وہ جھینپ کر محمود صاحب کی طرف دیکھنے لگیں اور محمود صاحب نے ہنسکر جواب دیا "دیکھئے ہم کہاں جاتے ہیں؟"

میری جان، اپنی خوشیوں میں بھول کر محمود اور زرّینہ کی شادی خانہ آبادی کی پوری تفصیل نہ سنا سکا۔ معاف کرو، اور مجھے ٹھیک ٹھیک لکھ بھیجو کہ کیا واقعی تم ۲ اپریل کو آرہی ہو۔ دردانہ بیگم سے پرسوں سینما میں ملاقات ہوگئی۔ وہ مجھے دیکھ کر معنی خیز ادا سے ہنسنے لگیں اور کہا "میں بھائی صاحب کی شادی کے موقع پر چلی آئی۔ اب چاہے شادی جس طرح بھی ہو مگر پھر بھی بھائی کی ہے اور ہمیں خوش ہونا ہی پڑیگا"

میں نے ان سے کہا "دردانہ بیگم، آپ چلی آئیں اچھا کیا، مجھے آگرہ کا سب حال سنائیے

کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میں ایسی تاریکی میں پڑا ہوں کہ کچھ نہیں جانتا۔ اور دیکھئے بات اگر میرے خلاف بھی ہو تو بھی صاف صاف بتائیے تاکہ اس دبدھے سے نجات ملے۔"

دردانہ بیگم نے ہنس کر اپنی سنہری ہنسی سے فضا کو معمور کر دیا۔ میرے کانوں میں آج کچھ دنوں کے بعد پھر جلترنگ بجنے لگا تھا۔ وہ صرف ہنستی جاتی تھیں اور کچھ بول نہیں رہی تھیں۔

میں ان کی ہنسی کی لہروں میں بہتا چلا جا رہا تھا اور جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں اس میں بالکل ڈوب جاؤں گا تو ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اور امداد طلب آواز میں کہنے لگا "خدا کے لئے مس دردانہ ہنسئے نہیں، صاف صاف مجھے بتائیے۔" انہوں نے میرے غم اور ... کی شدت کو میرے چہرہ پر دیکھ کر اپنا ہنسنا بند کیا اور اپنی غلافی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا کرتے ہوئیں "اچھا یہ بتائیے آپ کو کہاں تک معلوم ہے۔" میں نے بہت عاجزی سے کہا "کچھ بھی نہیں، مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ آپ کی نیلو کے لئے وہ آفتاب صاحب کا پیغام منظور ہوا یا نہیں۔" ہمدردانہ لہجہ میں دردانہ بیگم نے کہا "ارے یہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ پیغام منظور بھی ہو گیا اور اب نیلو بہن کی شادی بھی ہونے والی ہے۔" میرا جی چاہا کہ کپڑے پھاڑ ڈالوں اور سینما کے تمام سامان آرائش کو چور کر رکھ دوں۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے، زبان خشک ہو گئی تھی، اے کاش کوئی اس وقت مجھے برف کی لگی ہوئی صراحی بھر کر پانی پلا دیتا! میری نظروں تلے دنیا گھومنے لگی تھی اور یہی جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

میں شاید ایک دم زرد ہو گیا۔ جس کو دردانہ بیگم نے دیکھ لیا۔ اپنے شوخ لہجہ میں

انھوں نے یہ کہہ کر کہ "یوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں" گویا نہ صرف میری ہستی کا مذاق اُڑایا بلکہ اس مقدس جذبہ اور اس مقدس یاد کی بھی تضحیک کی جس کو میں آج تک اپنے دل میں بطور ایک "یادگارِ ضمانت" کے پرورش کرتا چلا آیا ہوں۔ میں نے سنیما نہیں دیکھا بلکہ پردۂ سیمیں پر اپنی ناکام اور نامراد زندگی کے تیزی سے گذرنے والے واقعات کو دیکھتا رہا۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ جو طوفان آنا تھا آچکا۔ جو آندھی اُٹھنی تھی اُٹھ چکی۔ لیکن سوچتا ہوں کہ واقعات کے جس خوفناک ہوا کے جھونکے نے میری زندگی کو امیدوں کی جنت سے نکال کر مایوسی اور نامرادی کے غار میں پھینک دیا ہے۔ کیا میں کبھی اس کے خوفناک صدمہ سے سنبھل سکتا ہوں۔

کہنے کو تو میں اب بھی زندہ ہوں اور تمہیں خط بھی لکھ رہا ہوں۔ لیکن اسلم بھی تو زندہ ہیں۔ کلکتہ میں ہی سہی۔ اور ہر نامراد کو زندگی کے تلخ گھونٹ پینا ہی پڑتے ہیں۔ جینا ہی پڑتا ہے اگرچہ لاش بن کر ہی کیوں نہ ہو۔ اور کیا زندہ لاشیں نہیں ہوتیں۔ وہ چلتے پھرتے۔ کھاتے پیتے انسان جن کے دلوں سے اُمیدوں کو اس طرح نچوڑ دیا گیا ہو جیسے کپڑے کو نچوڑ کر خشک کر لیتے ہیں کیا لاشیں نہیں ہیں۔ اور پھر جب دنیا میں دوسرے بھی ایسے ہیں جو لاشوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں اگر ایک اور لاش (زندہ لاش) کا اضافہ ہو جائے تو قیامت تو نہیں آجائے گی۔

تم آرہی ہو؟ تمہارا آنا سر آنکھوں پر۔ لیکن کیا اب مجھ میں اتنی تاب اتنی سکت ہے کہ میں تمہارا استقبال کر سکوں۔ دردانہ بیگم نے جو اطلاع بہم پہنچائی ہے

اور جس پر میں نے یقین بھی کر لیا ہے۔ اس کے بعد کیا مجھے یہ حق رہتا ہے کہ ارمان بھرے دل سے تمہارا انتظار کروں اور تمہیں اپنا سمجھتے ہوئے تمہارے آنے پر خوشیاں مناؤں؟

یہ تو میں جانتا ہوں کہ زندگی گرم و سرد دونوں کا نام ہے۔ اچھے بُرے سب ہی قسم کے واقعات سے ہمیں مقابلہ کرنا پڑتا ہے لیکن بعض حادثات اس قسم کے بھی تو ہوتے ہیں کہ پھر ان سے بڑا حادثہ پیش ہی نہیں آسکتا اور جہاں پہنچ کر انسان یہ کہنے لگتا ہے ؎

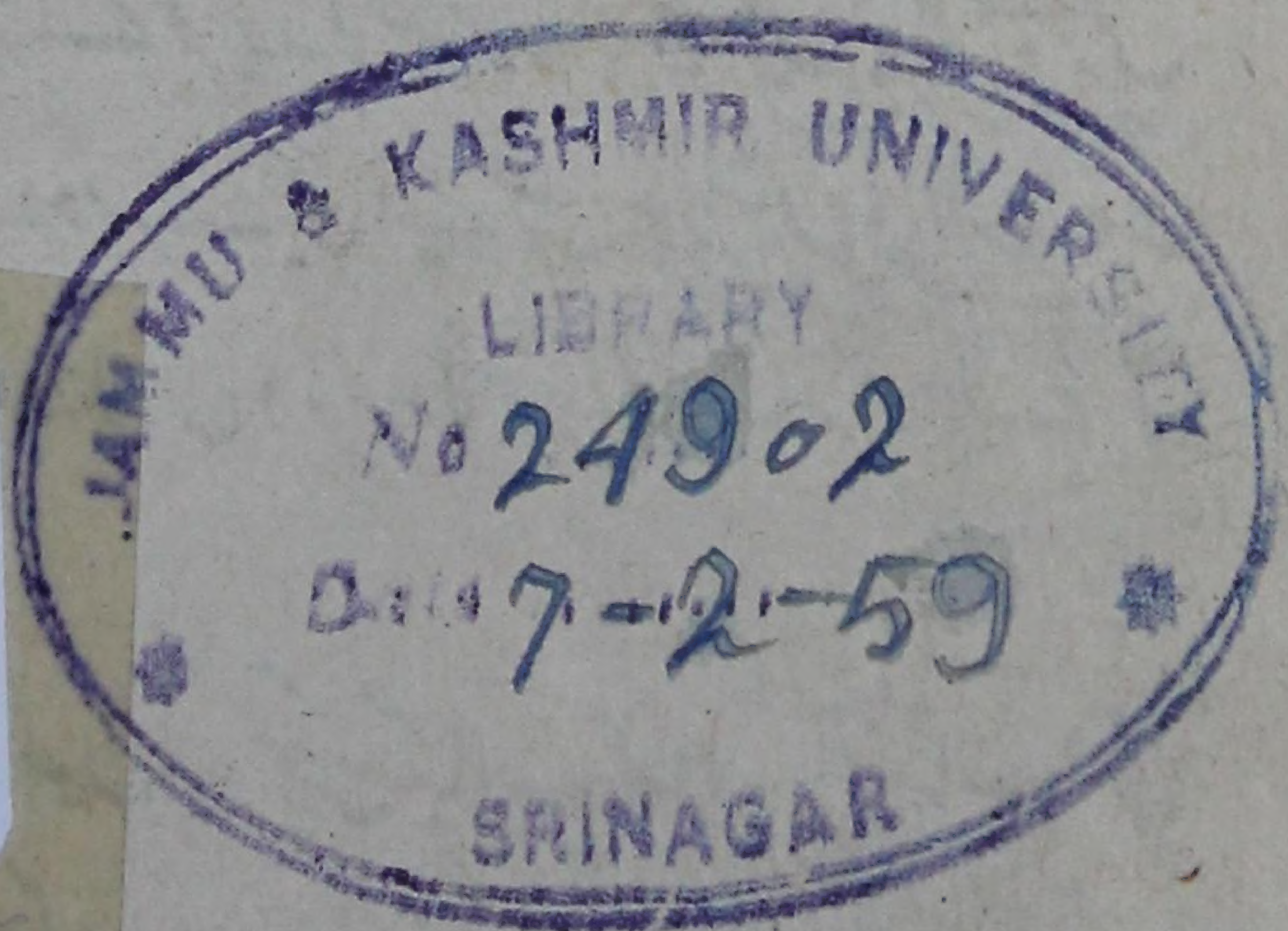
ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اور میں سمجھتا ہوں۔ سمجھتا ہی نہیں ہوں بلکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ میری زندگی کا یہ حادثہ ایسا ہی ہے۔ اس کے بعد تمام تڑپتے ہوئے طوفانوں، مچلتے ہوئے سیلابوں، بھیانک آندھیوں، خوفناک بلاؤں کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ ان کا کوئی اثر۔ اس کے بعد نہ میں کہہ سکتا ہوں اور شاید نہ تم کچھ سن سکتیں۔

خدا حافظ







24902

[illegible]